THE ASSASSINS

حشیشین

سر ہنری شارپ

ترجمہ: فاطمہ بیگم

حشیشین

سر ہنری شارپ

ترجمہ: فاطمہ بیگم

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور فون: 0092-42-7354205/7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: **حشیشیین**

مصنف: سر ہنری شارپ

ترجمہ: فاطمہ بیگم

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز، 24- مزنگ روڈ، لاہور

فون: 0092-42-7354205/7322892

مطبع: المطبعۃ العربیہ، لاہور

سال اشاعت: 2003ء

قیمت: -/140 روپے

فہرست

دیباچہ 5
تمہید 10
پہلا باب 14
دوسرا باب 18
تیسرا باب 27
چوتھا باب 36
پانچواں باب 40
چھٹا باب 50
ساتواں باب 62
آٹھواں باب 72
نواں باب 82
دسواں باب 90
گیارہواں باب 104
بارہواں باب 114
تیرہواں باب 126
چودہواں باب 140
پندرہواں باب 148
سولہواں باب 159

سترہواں باب	171
اٹھارہواں باب	181
انیسواں باب	191
بیسواں باب	201
اکیسواں باب	207
بائیسواں باب	213
تئیسواں باب	219
خاتمہ	224

دیباچہ

سرہنری شارپ کے مشہور ناول ''دی اساسنز'' کا یہ اُردو ترجمہ ہے۔ علاوہ ادبی خوبیوں کے، ایک ندرت اس میں یہ ہے کہ سرسیّد احمد خاں مرحوم ومغفور کے خاندان کی ایک لڑکی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ لائق مترجمہ نواب سید محمد علی صاحب بی۔اے۔سی۔ایس مرحوم کی بڑی صاحبزادی اور مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے۔آئی۔ای۔ایس کی اہلیہ ہیں۔ مرزا صاحب اس وقت انٹرمیڈیٹ کالج رہتک کے پرنسپل ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کامل مہارت رکھنے کے علاوہ اُردو کے مشہور ادیب ہیں۔ نواب سید محمد علی صاحب مرحوم میرے عمر بھر کے دوست اور محسن تھے، جس دن سے ملاقات ہوئی، مرتے دم تک مثل اپنے عزیزوں کے سمجھتے رہے۔ ان کی محبت اور ان کے احسانات کو اب تک یاد کیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک یاد کرتا رہوں گا۔ اپنے بچّوں کی تعلیم وتربیت پر بہت توجہ اور صَرف کثیر کیا کرتے تھے۔ ان بچوں کا زمانہ تعلیم مجھے کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ بڑی صاحبزادی کو لکھنے پڑھنے کا ابتدا ہی سے بہت شوق تھا۔ بچپن میں چھوٹے چھوٹے مضمون لکھ کر باپ کو دکھایا کرتی تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ علی گڑھ کے طلبہ نے کچھ شوروشغب مچایا۔ ٹرسٹی پریشان ہوئے۔ اخباروں میں چرچا ہونے لگا۔ اس لڑکی نے بھی اخبار پڑھے اور فوراً ایک مضمون لکھا۔ نواب صاحب نے وہ مضمون مجھے دکھایا۔ اس کے جملوں میں بچپن کا غصہ اور ماں باپ کی بتائی ہوئی نصیحتوں کا اعادہ نہایت پُرلطف تھا۔ میں پڑھ کر ہنسا اور تعجب کرنے لگا۔ نواب صاحب بھی ہنسے اور کہنے لگے کہ ''ہم نے تو خیر وہاں پڑھا تھا، اس لڑکی کو کالج سے اتنی کیوں ہمدردی ہے''۔ میں نے کہا ''یہ بانی کالج کے خون کا اثر ہے''۔ دیر تک ہنستے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ ذکر تقریباً بائیس برس کا ہے۔ بڑی صاحبزادی نے جب اردو اور انگریزی پڑھ لی تو انگلش لٹریچر کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھا۔ باوجود صحت کی خرابی اور اب چھوٹے چھوٹے پیارے بچّوں کی تعلیم اور پرورش کی مصروفیتوں کے باوجود علمی ذوق برابر جاری ہے، جس کا ایک نمونہ یہ عجیب ترجمہ ہے۔

حال میں جب آں عزیزہ نے مجھے اپنے ترجمہ کا مسودہ اس فرمائش سے بھیجا کہ آپ اس کو پڑھ کر درست کر دیں اور ایک دیباچہ بھی لکھ دیں تو میرا دل بہت خوش ہوا اور مجھ کو اپنے محسن مکرم سید مرحوم، اُن کے بال بچے بے حد یاد آنے لگے اور ان کے خوبصورت اور پاکیزہ گھر کا نقشہ جہاں میں مہینوں مثل عزیزوں کے مہمان رہا کرتا تھا، آنکھوں میں پھرنے لگا۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر مسودہ کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ چونکہ میری ملازمت اس قسم کی ہے جس میں اُردو ترجموں کو پڑھنے اور اصل سے مقابلہ کرنے کا کام رات دن رہتا ہے۔ اس لئے مجھے مسودے کے پڑھنے اور درست کرنے میں کوئی خاص زحمت نہ اٹھانی پڑی، مگر آں عزیزہ کی محنت اور ذہانت پر سخت حیرت ہوتی رہی کیونکہ انگریزی کتاب جس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کی عبارت بالخصوص اردو میں سلیس ترجمہ کرنے کے لیے اکثر مقامات پر بہت مشکل ہے، مگر ترجمہ نے تمام مطالب کو نہایت خوبی اور بے تکلفی سے ادا کیا ہے۔ جہاں کہیں سوا کوئی عبارت ترجمہ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس کا ترجمہ میں نے کر دیا یا فقروں میں لفظی پابندی کی وجہ سے اگر کوئی بدنمائی پیدا ہو گئی تھی اسے رفع کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ قصے کے واقعات ایک ترکی وایرانی النسل مسلمان کی زبانی بیان ہو رہے ہیں۔ اس لیے مصنف نے اصلیّت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے بعض مقامات پر فارسی کی بلیغ عبارتوں کا انگریزی میں چربہ اُتار کر اپنی زبان میں ہنسنے اور حیرت زدہ کرنے کا سامان پیدا کیا ہے۔ ایسے مقامات پر جہاں کہیں مترجمہ کا مصنف کے لطف بیان کو اردو میں منتقل نہ کر سکا۔ وہاں میں نے اس خامی کو دُور کرنا چاہا، مگر جیسی کامیابی ہونی چاہئے تھی، نہیں ہوئی بہر کیف ترجمہ میں جو کچھ درستی میں نے کی ہے، وہ مترجمہ کی محنت اور لیاقت کے مقابلے میں عشرعشیر بھی نہیں۔ مسودہ کو دیکھنے اور مقابلہ کرنے کے بعد میں مترجمہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے فی الحقیقت ایک بڑے دلچسپ اور جابجا مشکل عبارتوں میں لکھے ہوئے قصہ کو اُردو پڑھنے والوں کے لیے ایسی خوبی سے ترجمہ کیا ہے جس کی قدر کرنی نہ صرف ناظرین کتاب بلکہ اُردو زبان کے حامیوں کا بھی فرض ہے۔

قصہ اسلامی ملکوں سے متعلق ہے۔ پانچویں صدی کے اواخر میں شیعان اسماعیلیہ کا ایک خاص گروہ ایسا پیدا ہوا۔ جس کے جرائم قتل نے اسلامی ملکوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ صوبہ جبال کی شمالی اور طبرستان کی مغربی سرحد کے پہاڑوں میں قزوین کے قریب پُرانے زمانے کا ایک مشہور و مستحکم قلعہ تھا۔ جس کا نام اَلموت یعنی ''آشیانہ عقاب'' تھا۔ 483ء ہجری میں ایک شخص حسن صباح نے اس قلعہ پر قبضہ کر کے بہت جلد قرب وجوار کے علاقوں پر مستقل حکومت قائم کر لی۔ حسن صباح جب 25 برس حکومت کر کے مر گیا تو ایک شخص بزرگ امید اس کا جانشین ہوا۔ اس والئی

حکومت اوراس کے بعد جو لوگ جانشین ہوئے۔ان کے نام سے قبل مؤرخوں نے "کے" کا لفظ لکھا ہے، جس کے معنی سردار یا امیر کے ہیں اور یہ پرانا ایرانی لفظ ہے جو کیومرث کیقباد اور کیخسرو کے ناموں میں موجود ہے۔ کے بزرگ امید نے 14 برس حکومت کی اوراس کے بعد اس کے بیٹے کے محمد نے 532ھ سے 557ھ تک یعنی 25 برس حکومت کی۔اسی کے محمد کے زمانہ کا یہ قصہ ہے کہ محمد کے بعد اس کا بیٹا حسن تخت نشین ہوا۔اس کا ذکر بھی قصہ میں آیا ہے۔اس کے نام کے بعد علی ذکرۃ اسلام لکھا جاتا تھا اور عید القیامت، جس میں الموت کے لوگوں نے اسلام ترک کر کے بالکل لمحدانہ عقائد اختیار کیے، اسی حسن کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ گو مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا جلسہ جس میں اسلام سے قطع تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔اس کے باپ کے زمانہ میں ہوا تھا۔حسن تخت نشینی کے چار برس بعد قتل کر دیا گیا۔اس کے بعد 92 برس تک یہ حکومت اور قائم رہی۔پھر 625ء ہجری میں تاتاریوں نے اس کو اور قلعہ الموت کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

بانی حکومت حسن صباح ایک گروہ قاتلوں کا ایسا پیدا کر گیا تھا۔جس نے ایشا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور عالموں کو طرح طرح کے دھوکوں سے قتل کیا۔عربی تاریخوں میں اس گروہ کا نام کہیں محض اسماعیلیہ کہیں فدایہ، کہیں نزاریہ اور کہیں ملاحدہ آیا ہے۔اہل یورپ کو صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں جب فلسطین میں اس گروہ سے واسطہ پڑا تو انہوں نے اسے اساسین کے نام سے پکارا بلکہ اسی لفظ سے مصدر بنا کر اس کے معنی قتل کرنے کے ٹھہرائے۔لفظ اساسین کی اصل عربی لفظ حشیشیون سے بتائی گئی ہے۔جس کے معنی حشیش کھانے والوں کے ہیں۔حشیش ایک قسم کی پتی ہوتی تھی۔جس کے کھانے یا پینے سے نشہ پیدا ہوتا تھا۔اس نشہ کا رواج اس گروہ میں بہت تھا بلکہ شاہان الموت حشیش ہی پلا کر لوگوں کو بہشت میں پہنچایا کرتے تھے اور حشیش ہی کے نشے میں ان کو وہاں سے نکال کر پھر اسی بہشت کا لالچ دیتے تھے اور اس لالچ میں ان سے بڑے بڑے لوگوں کے قتل کا وعدہ لے لیتے تھے۔

انگریزی قصہ میں جہاں کہیں اساسین کا لفظ آیا ہے۔مترجم نے اس کا ترجمہ حشیشی یا حشیشین لکھا ہے۔میرے خیال میں اسلامی تاریخوں میں جس قدر نام اس گروہ کے آئے ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر اس قصہ کی اغراض کے لیے یہی نام اکثر جگہ پر تناسب زیادہ مناسب تھا۔

حسن صباح اور اس کے جانشینوں نے جو بہشت بنائی تھی۔اس میں تاریخی اصلیت کم اور حالت سکر میں فدائیوں کا تخیل زیادہ ہے۔اسی طرح اس گروہ کے ہاتھوں قتل کے وقوعے بھی زیادہ تر شاہان الموت کے سیاسی اقتدار کے بڑھ جانے سے پیش آئے کیسی خاص مذہبی تحریک کا وہ

چنداں نتیجہ نہ تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسماعیلیہ کو جس قدر اس گروہ حشیشین نے بدنام کیا۔ کسی دوسری چیز نے نہیں کیا۔

قصہ کے حالات سے بحث کرنی فضول ہوگی کیونکہ قصہ ناظرین کے سامنے ہے، لیکن اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس موضوع پر ہماری قوم کے مشہور و معروف فسانہ نگار شرر مرحوم کے بھی دو ناول ایسے ہیں۔ جن میں اس کہنہ مشق ناولسٹ نے حقیقت میں اپنا کمال دکھایا ہے، جو ان کی شان بیان سے بالاتر ہے مگر سادگی اور نظری اثر میں یہ انگریزی قصہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرر مرحوم کے ''حسن بن صباح'' اور ''فردوس بریں'' کے بعد سر ہنری شارپ کے اس ناول نے اُردو شکل اختیار کر کے ہمارے افسانوں کے دفتر میں ایک بیش قدر اضافہ کیا ہے اور یہ احسان لائق مترجمہ کا اُردو ادبیات پر ایسا ہے، جسے کبھی نہ بھولنا چاہیۓ۔

اُردو ترجمہ میں اصل سے کہیں کہیں کچھ خفیف سی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ان کی ضرورت کچھ تو ادبی لحاظ سے اور کچھ اس خیال سے ہوئی کہ بلاوجہ کوئی بات ترجمہ میں ایسی نہ آئے۔ جس کو پڑھ کر مسلمانوں کی دل آزاری ہو اور قصہ ان کے لیے بے لطف ہو جائے۔ ادبی ضرورت کی تبدیلیوں میں چند نام ہیں، جن کو بدلنا پڑا ہے مثلاً مصنف نے سلیم اللہ بن تارجک اور اس کی بیٹی کا نام کا سلکہ یا حسن کے ملازم کا نام فضلو لکھا ہے۔ چونکہ تارجک اور کاسلکہ کی صحت کی طرف سے اطمینان نہ ہو سکا اور فضلو کی ترکیب بھی گو ہندوستان میں درست ہو مگر عراق عجم میں درست نہیں معلوم ہوئی۔ اس لئے یہ تین نام سلیم بن طاہر۔ خجستہ اور فضل کر دیئے گئے۔ بعض مقامات پر جہاں اصل کتاب میں انگریزی تلفظ کی رعایت سے عربی الفاظ بگاڑ کر لکھے ہیں۔ ان کو اُردو میں درست کر دیا گیا ہے مثلاً انگریزی فدوائی اور داعی الکرباِل کی جگہ فدائی اور داعی الکبیر لکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریز مصنفین اس زمانہ میں دوسروں کے مذہب کا بہت لحاظ کرنے لگے ہیں لیکن پھر بھی مسلمانوں کے ذکر میں ان کے قلم سے نادانستہ ایسے فقرے نکل جاتے ہیں، جو غلط ہونے کے علاوہ مسلمانوں کو آزدہ بھی کرتے ہیں۔ قصہ کوئی علمی کتاب نہیں۔ محض ایک لطف اٹھانے کی چیز ہے۔ خواہ اصل زبان میں پڑھی جائے۔ خواہ ترجمہ کی شکل میں چیز ایسی نہیں ہونی چاہیے، جس سے کسی کو بے لطفی نہ ہو۔ اسی بنا پر دہ ایک جگہ اردو ترجمہ میں کچھ عبارت چھوڑ دی گئی ہے مگر اس طرح کہ قصہ کے سلسلے میں کوئی فرق نہ ہو۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں مختصر طور پر یہ کہنا کافی ہوگا کہ خلیفہ المستنصر لامر اللہ ایک تاریخی شخص ہیں۔ عربی مؤرخوں نے ان کو عادل رحیم و کریم لکھا ہے۔ مصنف نے ان کو ایسے رنگ میں دکھایا ہے کہ گویا کسی بے گناہ کو قتل کرنا ان کے لئے ایک بہت ہی دلکش اور دلچسپ

مشغلہ تھا اور قتل کا حکم وہ اس طرح سناتے تھے۔ جیسے کوئی شاعر اپنی مرصع غزل یا مطرب کوئی عمدہ نغمہ سناتا ہو۔ ترجمہ سے یہ نقص رفع کر دیا گیا ہے۔ بہر کیف اس قسم کی خفیف تبدیلیاں بھی شاذ و نادر ہیں اور ایسی ہیں کہ اگر خود مصنف اپنی کتاب کو اُردو میں اس نیت سے لکھتے کہ مسلمان بھی پڑھ کر اس سے محظوظ ہوں۔ تو ایسی تبدیلیوں کو ناپسند نہ کرتے۔

خدا کرے۔ یہ ترجمہ مقبول ہو اور لائق مترجمہ کو وقت اور صحت نصیب رہے کہ وہ اَور ترجمے بھی کریں۔ اس وقت علم و فن کی ہر صنف میں انگریزی کتابوں کے ترجموں سے ایک نئی قسم کی طاقت گویائی اُردو زبان کو بخشی جارہی ہے۔ پس ہماری قوم کی تعلیم یافتہ خواتین کا فرض ہے کہ اس کام میں وہ بھی مردوں کا ہاتھ بٹائیں۔

محمد عنایت اللہ
ناظم شعبہ تالیف و تراجم۔ جامعہ عثمانیہ

تمہید

یہ قاسم بن سلیم کی تاریخ یا سوانح عمری ہے جسے مقداد بن معاذ نے جس کی اصل بنی عاد سے تھی مجھ عبدالرحمٰن سے بیان کیا۔ مقداد نے یہ قصہ رمضان 658 ہجری میں شہر مراغہ میں جو صوبہ آذربائیجان میں واقع ہے، مجھے سنایا تھا۔

میں بھی سلیم بن طاہر کی اولاد سے ہوں۔ میرے دادا کی ماں جن کا نام خجستہ خاتون تھا۔ ان ہی سلیم بن طاہر کی بیٹی اور قاسم کی بہن تھیں۔ یعنی وہی قاسم جن کا یہ قصہ ہے۔ جس طرح مقداد کی زبانی ان قاسم کے حالات سنے تھے اسی طرح آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ مقداد ہمارے خاندان سے خوب واقف تھے کیونکہ وہ میرے والد کے معتمد خاص اور مجھ عبدالرحمٰن اور میرے بھائی جلال الدین کے اتالیق تھے۔ جب تاتاریوں نے یورش کر کے بغداد کو تباہ اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر ڈالا اور ہمارے مکانات اور باغات جن میں سلیم نے گلاب کے تختے بڑے شوق اور ارمان سے لگائے تھے، تباہ و برباد کر دیئے تو ہم سب خاندان والے بچا کھچا سمیٹ کر ایران کے ملک میں بھاگ آئے۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کی تھی اور میرا بھائی جلال الدین چھ برس کا تھا۔ میری والدہ اس بے سروسامانی و جلاوطنی کی حالت میں اس بچہ کو بڑی محنت اور مصیبت سے پرورش کرتی تھیں۔ ہم وطن سے نہایت تباہ حال اور پریشان نکلے تھے۔ مگر مقدر میں یہی تھا کہ پناہ بھی ملے تو اُن ہی دشمنوں میں جنہوں نے ہمارے گھر لوٹے اور تباہ کئے تھے یعنی شہر مراغہ میں جو اس وقت تاتاریوں کے قبضے میں تھا، پہنچ کر ہم لوگ آباد ہو گئے یہ شہر اس وقت دنیا کے بڑے خوبصورت شہروں میں شمار ہوتا تھا۔

یہاں ہم امن و آسائش سے رہنے لگے۔ تاتاری گو غارت گری میں ایک قہرِ خدا ہوتے ہیں لیکن جن ملکوں کو وہ غارت نہیں کرتے، وہاں بہت عدل و انصاف سے حکومت کرتے ہیں۔ اپنی سرحد میں دشمن کا دخل نہیں ہونے دیتے اور ملک کے اندر کسی طرح کی بدنظمی کو روا نہیں رکھتے اور اس زمانے میں تو وہ اپنے باطل مذہب کو چھوڑ کر اسلام کے پیرو ہوتے جاتے ہیں۔ فرائض دین

کے ادا کرنے میں اب کوئی ہمارا مخل نہیں رہا ہے۔ شہر میں ایک مسجد ہم نے بنالی ہے اور بفراغت نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ غرض جس سال کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم سب روزے رکھا کرتے تھے۔ گرمی کا موسم شروع ہو کر دن بڑا اور گرم ہونے لگا تھا۔ روزے میں پیاس زیادہ معلوم ہونے لگی تھی۔ میرا وقت تو عصر تک مطالعہ وغیرہ میں آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ عصر کے بعد البتہ کسی قدر تکلیف محسوس ہوتی تھی لیکن میرا بھائی جلال الدین جو بہت ہی کم عمر تھا۔ روزے کی وجہ سے گھبرایا ہوا رہتا تھا۔ صبح کا وقت تو بہت دیر تک سو کر گذار دیتا تھا، لیکن دوپہر کے بعد سے وہ بادلوں کی طرح اِدھر اُدھر پڑا پھرتا تھا اور بات بات پر لڑتا اور ضدیں کرتا تھا۔

مقداد بڑے عقلمند آدمی تھے۔ انہوں نے وقت آسانی سے گذارنے کی یہ ترکیب کی کہ ظہر کی نماز پڑھتے ہی ہم سب کو شالا مار باغ میں لے جاتے اور وہاں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہمیں کہیں بٹھا دیتے اور قاسم بن سلیم کے حالات سنا کر مغرب کے وقت تک ہم سب کو بہلائے رکھتے۔ جلال الدین چونکہ ابھی بچہ تھا، قصے کے بیچ میں سو سو جاتا اور جب جاگتا تو شرارتیں شروع کر دیتا۔ گھاس میں سے کہیں کیچوے۔ کہیں ٹڈے پکڑ لاتا اور چپکے سے مقداد کے کپڑوں میں چھوڑ دیتا مگر میں قصہ بہت ہی دل لگا کر سنتا تھا اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ اوائل عمری میں جو بات سُنی جاتی ہے، وہ خوب یاد رہتی ہے۔ میرے ذہن میں قصہ کے کُل حالات بالکل اسی طرح محفوظ رہے، جس طرح مقداد سے سنے تھے۔

اب میں نے عالم پیری میں اس قصہ کو عربی زبان میں اس لئے لکھا ہے کہ میری اولاد اپنے بزرگوں تک کے حالات سے واقف رہے۔ قصہ سب طرح سچا ہے۔ البتہ یہ بات کہ قاسم کے دل میں جو خیالات گذرتے تھے یا سوتے جاگتے جو خواب دیکھے یا خیالات بندھتے یا جنگلوں اور پہاڑوں میں جو منظر نظر آئے یا دوسروں سے پوشیدہ طریقہ پر جو باتیں ہوئیں اُن سب کا علم مقداد کو کیونکر ہوا۔ تو اس جھوٹ یا سچ کا ذمہ دار مجھ کو یا جلال الدین کو سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ہماری دلچسپی کے لئے قصہ کو رونق دینے میں مقداد کو جابجا اپنے تصور و تخیل سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کے سوا قصہ کے سچ ہونے میں کسی طرح کا کلام نہیں اور میں اس بات کو خوب جانتا ہوں کہ اُس زمانہ کی عربی تاریخوں میں بھی قصہ کے واقعات اسی طرح درج ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہرام بن عبداللہ قندھاری جو اس قصہ کے اکثر موقعوں پر بذات خود موجود تھا۔ اس کی اولاد میں ایک شخص ابو طالب سے جب میری ملاقات ہوئی تو اس کے بیان سے بھی معلوم ہوا کہ اس قصہ کے بہت سے واقعات جو بہرام کے چشم دید تھے۔ وہ اپنی اولاد میں اسی طرح بیان کر گیا تھا۔ جس طرح مقداد کی زبان سے ہم نے

سُنے تھے۔ اسی ابو طالب نے مجھے ایک کتاب کا قلمی نسخہ دکھایا تھا مگر میں اس کو پڑھ نہ سکا کیونکہ وہ اہل فرنگ کی زبان میں تھا اور اس کا مصنف کوئی شخص ولیلمیوس یا ولیم تھا۔ (فرنگیوں کے نام کچھ ایسے ہی ٹیڑھے ہوتے ہیں) اس شخص کا رتبہ اہل فرنگ میں ایسا ہی تھا جیسے ہم مسلمانوں میں کسی شاہی مسجد کے امام کا ہوتا ہے۔ اس فرنگی نے بھی اپنی کتاب میں امیر طرابلس یعنی ریمند نصرانی کی موت کے جو حالات لکھے ہیں، وہ مقداد کے بیان سے مطابق ہوتے ہیں۔

میری آرزو ہے کہ مسلمان اس قصہ کو پڑھیں۔ اس میں اُس پُر آشوب زمانہ کا ذکر ہے۔ جس کی آفات اب مسلمانوں کے سر سے گذر چکی ہیں اور اس میں حشیشیوں کے ہولناک مظالم بیان ہوئے ہیں اور اسلامیوں کی سطوت اور طاقت کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ میری یہ بھی تمنا ہے کہ کوئی فرنگی اس قصہ کو پڑھ کر اپنی زبان میں اسے ترجمہ کرے۔ تا کہ فرنگیوں کو اپنے شرمناک کاموں کا اور اللہ کی فوجوں کے سامنے اپنی کمزوریوں کا احساس ہوا پھر ممکن ہے کہ وہ ضلالت سے نکل کر دین برحق کی جانب متوجہ ہوں۔ گو وہ کافر ہیں لیکن دائرہ اسلام میں ان کا شامل ہونا دین کی نصرت کا باعث ہوگا کیونکہ ان میں اولوالعزم بہت ہوتے ہیں اور ایک قسم کا جوش اور حوصلہ ان کی طبیعتوں میں ایسا پایا جاتا ہے، جو مذہب کی بڑی بڑی خدمتیں بجا لا سکتا ہے۔ بہر کیف ہمارے ہاں ان کا شمار اہل کتاب میں ہوا ہے۔ وہ آدم ابراہیم، موسیٰ، داؤد و عیسیٰ علیہم السلام سے واقف ہیں اور یہ سب اللہ کے نبی گذرے ہیں لیکن عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تصویریں ایک ناواقف مصور کی طرح حُسن تناسب کا خیال نہیں رکھا۔ خدا ایسا کرے کہ اس قصہ کو پڑھ کر تاریکی ان کی نظروں سے دُور ہو۔

کچھ عقل کے اندھے ایسے بھی ہوں گے۔ جو اس قصہ سے غلط نتیجے نکالیں گے اور پوچھیں گے کہ اللہ نے حشیشیوں جیسے ظالم و جفا کار دنیا میں پیدا ہی کیوں کئے تھے؟ اپنے ہی رسول کے جانشین خلیفہ مستعصم باللہ کو جس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اللہ سے طالب امان تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں کیوں اس بے دردی سے قتل کرایا؟ سلیم بن طاہر جو نہایت سچا اور سیدھا مسلمان تھا۔ اس کو بڑھاپے میں بیٹے کی موت کا صدمہ کیوں پہنچایا؟ قاسم بن سلیم کی زندگی کا خاتمہ کیوں ایسے دردناک طریقہ پر کیا؟ اور بہرام جیسا دائم الخمر ملحد کیوں دنیا میں اتنا پھلا پھولا؟

مگر اس زندگی کی داستان دنیا ہی میں ختم نہیں ہو جاتی۔ عاقبت برحق ہے۔ اعمال نیک اور اسلام پر راسخ الاعتقاد رہنا تمام مشکلوں کو حل کر دیتا ہے۔ قیامت میں پُل صراط پر سے سب کو گذرنا ہوگا جو بے دین اور منکر خدا ہیں۔ وہ جہنم میں گر پڑیں گے اور جو اللہ کے نیک بندے ہیں، وہ اس

آزمائش سے صحیح سلامت گذر کر داخل جنت ہوں گے۔

اس قصہ میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ وہ یہ کہ مضامین کے اعتبار سے ابوابِ کتاب میں ایک قسم کی بے ترتیبی ہے۔ پوری بات ایک ہی جگہ نہیں کہی ہے۔ آدھی بات یہاں بتا دی ہے۔ تو باقی آدھی دُور جا کر سنائی ہے لیکن اس ظاہراً بے ربطی میں کہ مضمون کو بیان کرتے کرتے بیچ میں ناتمام چھوڑ دیا۔ ہمارے اتالیق مقداد کی بڑی حکمت تھی کیونکہ جب قصہ بیچ میں بند کر دیا جاتا تھا۔ تو باقی حالات سننے کے لیے ہمارا شوق اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ رمضان کا ماہ مبارک جوں جوں گذرتا جاتا تھا۔ اور یہ ڈر ہوتا تھا کہ عید کے چاند سے پہلے کہیں قصہ ناتمام نہ رہ جائے۔ تو بعض وقت مقداد بیان میں جلدی کرتے تھے اور تقریر میں وہ زیب وزینت نہ رہتی تھی۔ جس پر سخن فہم جان دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر یہ داستان ٹوٹی ٹوٹی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔

غرض مقداد نے یہ داستان عجیب شہر مراغہ کے باغ شالامار میں سنائی۔ بہار کا موسم ختم ہو کر گرمیاں شروع ہونے کو تھیں۔ گلزار میں نرگس اور سوسن اپنے آخری پھولوں کی ڈالیاں لئے کھڑی تھیں۔ گلاب میں کلیاں نکل آئی تھیں مگر اس پس وپیش میں سوتی رہیں۔ قصہ جس طرح سنا تھا۔ وہ آپ کو سناتا ہوں۔ عبارت ہو بہو مقداد کی ہے کیونکہ مجھے اپنے اتالیقِ مہربان کا ایک ایک لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا تھا۔ اب تک یاد ہے۔

پہلا باب

قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ 544 ہجری جو میلادِ مسیح کے حساب سے 1149 عیسوی ہوتا ہے۔ ماہ رجب کی دسویں تاریخ ہے۔ ولایت قزوین کا امیر دارالخلافت بغداد میں وارد ہوا۔ اس کی عزت افزائی کے لیے امیر المومنین المقتفی لامراللہ نے قصرالشجر کے ایوان عام میں ایک دعوت منعقد فرمائی ہے۔

میرے بچو! گو تم اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن بغداد کا وہ پُرشوکت زمانہ تمہیں کچھ کچھ ضرور یاد ہوگا۔ اس کی شان و بزرگی کو کبھی دل سے محو نہ ہونے دینا۔ آج وہ برباد و ویران پڑا ہے لیکن ایک زمانہ تھا کہ بلاد عالم میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ مغربی کنارے پر پُرانا شہر تھا لیکن مستقل خلافت کے لئے اس کی وسعت ناکافی ثابت ہوئی اور دریا کے مشرقی ساحل پر ایک نیا شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ اس شہر میں امراء دولت کے محل و مکانات تھے۔ انہیں میں سے ایک عالی شان محل میں تم سب بچے پیدا ہوئے تھے اور وہیں پرورش پاتے تھے۔ یہ محل سلیم بن طاہر نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ افسوس اب وہ بھیڑیوں یا بے دین تاتاریوں کا مسکن ہے۔ اس کے باغ اور چمن پر سموم اور خزاں کا دخل ہے۔ اسی نئے شہر میں خلیفہ مقتفی کا قصر تھا۔ نیا اور پرانا شہر مل کر دونوں ایک عظیم الشان منظر پیش کرتے تھے۔ اگر کسی عمارت کی چھت یا مسجد کے مینار سے نیچے دیکھئے۔ تو پورا شہر ایک خوبصورت قالین کی طرح قدموں کے نیچے بچھا معلوم ہوتا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ قالین میں جو رنگ سیاہی مائل ہوتے ہیں، ان کا ایک خاص متانت آمیز اثر نگاہ پر ہوتا ہے۔ اسی سیاہی مائل زمین پر جو نقش تیز رنگ کے ہوتے ہیں، وہ اور بھی نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اینٹوں کے مکانوں کی سیاہی مائل سرخی اور باغوں کی گہری کائی رنگ کی سبزی میں مساجد کے خوش رنگ برج اور مینار اور محلوں کی کاشانی چھتوں کے شوخ رنگ آفتاب کی روشنی میں اور بھی تیزی اور اثر کے ساتھ نگاہ کو مسرور کرتے تھے۔ تمام شہر کے گرد ایک خندق اور فصیل تھی اور پھر ایک دوسری خندق اور فصیل آتی تھی۔ جس کے اندر

قصر خلافت اور بادشاہی باغ تھا۔ افسوس ہے کہ تاتاریوں ظالموں کی آگ اور تلوار نے دارالسلام بغداد کو بالکل تباہ و ویران کر دیا۔

دعوت میں تکلفات زیادہ نہ تھے کیونکہ زمانہ ماہ رجب کا تھا۔ اس ماہ مبارک میں ہر قسم کے لہو و لعب اور رقص و سرود کے جلسوں سے پرہیز کیا جاتا ہے بلکہ اس زمانہ میں امیر المومنین کا کسی کو شرف حضوری بخشنا بھی ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ دعوت کی خاص وجہ یہ ہوتی تھی کہ قزوین کا حکام کسی ضروری کام کے لئے اپنی ولایت چھوڑ کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوا تھا اور اب جلدی اپنے دارالامارت کو واپس جانا چاہتا تھا چونکہ حاکم موصوف سلطنت کا وفادار خادم اور امیر المومنین کا قوت بازو تھا۔ وہ فتنہ پردازوں کی سرکوبی میں کمال رکھتا تھا۔ اس وجہ سے خلافت مآب اس کے حسن خدمات کے صلہ میں اظہار خوشنودی فرمانا ضروری سمجھتے تھے۔ جلسہ ضیافت میں حاکم موصوف کو خود امیر المومنین نے اپنے دست مبارک سے خلعت پہنایا اور انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ شاعروں نے وفا کی شان اسلام اور بالخصوص خلافت پناہ اور امیر قزوین کی شان میں قصیدے پڑھے۔

جلسہ جب ختم ہونے کو ہوا تو امیر قزوین مکارم و مراحم خسروانہ سے شاد اور خلعت فاخرہ سے ملبوس آداب و کورنشات بجالا کر سر جھکائے خلافت پناہ کی حضور میں حاضر عنایات شاہی کے شکریہ میں دعائے دولت و اقبال عرض کر کے رخصت کا طالب ہوا۔ امیر المومنین مسند سے اٹھے اور حاکم قزوین کو فی امان اللہ کہہ کر رخصت فرمایا اور خود پہلو کے دوازہ سے آرام گاہ کی جانب چلے۔ حاضرین دربار نظریں نیچی کیئے سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے۔ اب یہ لوگ بھی دربار سے چلنے لگے۔ سب سے پہلے حاکم قزونین امراء سلطنت کی مبارکبادیں (جن کی تہ میں رشک پنہاں تھا) سنتا اور سر کو خم کرتا دروازے کی طرف چلا۔ جس کی دہلیز سنگ سیاہ کی تھی اور جس پر سیاہ مخمل کا پردہ لٹک رہا تھا۔ ابھی اس نے دروازے میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کا کچھ شور سا ہوا، اور ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ خلافت پناہ یہ شور سنتے ہی ایوان میں واپس آئے اور بڑی دلیری سے دروازہ کی طرف گئے۔ اتنا دیکھتے ہی اہل دربار کے بدن پر رعشہ پڑ گیا۔ خلافت پناہ کے لیے رستہ چھوڑنے لگے۔ امیر المومنین نے جس جگہ قیام فرمایا۔ وہاں امراء سلطنت ایک حلقہ باندھ کر عجیب سکوت، اور دہشت کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ اس حلقہ کے بالکل بیچ میں دروازے سے اِدھر ہی کو سیاہ مخمل کے پردے کے سامنے امیر قزونین پر پڑا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور ان پر ایک عجیب ہیبت برستی تھی۔ سینہ میں دل کی طرف ایک خنجر بُھکا ہوا تھا۔

ہونٹوں پر لہُو اور لباس خون میں تر بتر تھا۔ مشعل بردار زمین پر گھٹنے ٹیکے مشعلیں اس کی طرف جھکائے تھے۔ ان کی سرخ روشنی میں یہ منظر اور بھی خونی رنگ معلوم ہوتا تھا۔

حاضرین میں سے ایک رئیس جو اَوروں سے زیادہ دلیر تھا، آگے بڑھا اور جُھک کر لاش کے سینہ سے خنجر نکال لیا، اب سب نے دیکھا کہ خنجر کے قبضے اور مشت پناہ کا رنگ سپید ہے لیکن ان کے تینوں سروں پر جو لہُو ہیں۔ وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ جس رئیس نے لاش سے خنجر نکالا تھا۔ اس نے خنجر کو اونچا کر کے لوگوں سے کہا۔ ''یہ وہی خنجر ہے جس نے نظام الملک کو ہلاک اور کئی صوبوں کے حاکموں کا خاتمہ کیا ہے بلکہ سریرِ خلافت کے دو تاجداروں کی بھی جان لے چکا ہے۔ یہ حشیشیوں کا خنجر ہے۔

امیر المومنین نے سر ہلا ہلا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ چہرہ سرخ ہو کر انگارہ ہو گیا تھا اور آواز میں بادل کی سی گرج تھی۔ ایک دفعہ ہی کڑک کر بولے۔ ''یہ حرکت کس کی ہے! قاتل کہاں ہے؟''

حاضرین اس آواز کو سن کر سہم گئے۔ کسی میں طاقت نہ تھی کہ کچھ کہتا، لیکن حلقے میں سے ایک شخص نے جواب دینے کی جرأت کی۔ یہ شخص فیروز نامی قصرِ خلافت کے خدام میں سے تھا۔ سونے چاندی اور جواہرات کے جو عجیب درخت محل میں تھے۔ ان کے کل پُرزوں کی نگہداشت اس کے سپرد تھی۔ اسی وجہ سے اس کا لقب محافظ الاشجار تھا۔ لباس اس کا پُر تکلف تھا مگر چہرہ خوف سے نیلا ہو گیا تھا اور ہونٹ کانپتے تھے۔ خلافت پناہ سے عرض کرنے لگا۔ ''قاتل کو کسی نے دیکھا ہے اور نہ حقیقت میں کوئی قاتل ہے۔ تلاش بے سود ہو گی۔ یہ قاتل کا ہاتھ نہ تھا۔ خدا کا ہاتھ تھا''۔

خلافت مآب نے نہایت شبہ اور قہر کی نگاہ سے اس شخص کو دیکھ کر فرمایا۔ ''اچھا کل صبح کو اس کے متعلق تحقیقات ہو گی۔ کل نماز فجر کے بعد یہاں ارکان مشورت جمع ہوں۔ اُس وقت محافظ الاشجار فیروز کو اپنے قول کی تصدیق کرنی ہو گی''۔ اتنا کہہ کر امیر المومنین ایوان میں سے گذرتے ہوئے آرام گاہ میں چلے گئے۔

خلیفہ مقتفی بڑے دلیر جوانمرد تھے۔ خلیفہ مستعصم کی طرح کمزور نہ تھے۔ پھر بھی محل کے ملازمین کا بیان ہے کہ اس واقعہ سے ان کے قلب کی حالت بگڑ گئی۔ آپ ہی آپ باتیں کرتے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ خواب گاہ میں آئے۔ تو وہاں بھی بہت بے چین تھے۔ رات کو بہت دیر تک جاگتے رہے جب آنکھ لگی۔ تو ایک مہیب خواب دیکھا اور وہ یہ تھا کہ آسمان پر ہر

طرف خون ہی خون نظر آ تا ہے۔کواکب سیارہ کا قران نحس ہے۔زمین پر لرزہ ہے۔قصر الشجر گر کر چُور چُور ہو گیا ہے۔دھوئیں اور شعلوں میں بغداد کا شہر نظر نہیں آ تا۔دجلہ کا دریا اور اس کی دیواروں میں کھجوروں کی قطاریں ریگستان کے ایک سراب کی طرح فضا میں نظر آ کر محو ہوتی جاتی ہیں۔ریگ بیابان کی خطیر موجوں نے زمین کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ہوا کی تیزی سے ریت کے ٹیلے، برج اور مینار کہیں بنتے ہیں اور کہیں بگڑتے ہیں۔امیر المومنین کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ارض و سما کی ان آفات میں کوئی ان کا یار و مددگار نہیں۔آندھی اور تیز ہوئی ریت کے متحرک تودے اور ستون جو کثرت میں صحرا کے درخت معلوم ہوتے تھے ایسے مہیب نظر آئے کہ بادشاہ اور بھی بدحواس ہو گئے اور اب بگولے اُٹھنے شروع ہوئے، ان میں اس طرح گھِر گئے کہ دم گھٹنے لگا۔یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام بدن پر بدھیاں پڑ گئی ہیں۔زخموں کی تکلیف میں موت کا سا کرب پیدا ہوا۔مسلح دربانوں نے جو خواب گاہ کے دروازے پر پہرا دے رہے تھے۔سنا کہ امیر المومنین چیخ چیخ کر کہتے ہیں۔"کوئی ہے جو اس بلا سے مجھے نجات دے۔اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی صورت نکالے۔لشکر میں اور شہر میں۔مسجدوں اور محلوں میں ہر جگہ موت کا بازار گرم ہے"۔مقتفی اس حال زار میں روتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ موت کی تکلیف سے جلد نجات ہو۔

دربانوں میں سے دو آدمی اس خیال سے کہ معلوم نہیں اندر کیا پیش آ رہا ہے۔خواب گاہ میں داخل ہوئے۔امیر المومنین اسی وقت بیدار ہوئے تھے، آنکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے کوئی سکتہ کے عالم میں ہو۔اسی حال میں پانی مانگا۔حلق خشک ہو رہا تھا اور تمام بدن پسینے میں تر تھا۔صبح ہونے کو تھی۔ہوائے سرد کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ اذان کی آواز خواب گاہ میں آئی۔امیر المومنین اُٹھے اور قصر کی مسجد میں نماز کے لیے گئے۔جب نماز اور وظیفے سے فارغ ہوئے تو مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے۔

دُوسراباب

مجلس شورے سے مراد ایک بہت بڑی جماعت تھی جس میں صدر اعظم، کاتب الانشار، بڑے بڑے وزیر وندیم صیغہ دیوانی کے حکام، سرعسکر، افسران فوج، امام جامع مسجد، قضات وحُجاب، مفتی ومحتسب، محافظ الاشجار، حارس الحصان (محافظ شہر پناہ) اور دیگر عمال دولت شامل تھے۔

امیر المومنین اس وقت شہ نشین میں تخت جواہر نگار پر رونق افروز تھے۔ خوب رُو تھے۔ قد متوسط تھا۔ چہرہ زیادہ بھرا ہوا تھا مگر مستقل مزاجی اور شجاعت کے آثار صورت سے ظاہر تھے۔ سر کے بال بہت خوب صورت تھے۔ ڈاڑھی بڑی تھی۔ اس حد تک ان کے حلیہ میں مطلق شبہ نہیں۔ تصویریں ان کی بڑے بڑے مصوروں نے بنائی تھیں۔ معلوم نہیں، تاتاریوں کی یورش میں وہ بچیں یا تلف ہو گئیں۔ اگر تلف ہو گئیں، تو بہتر ہوا کیونکہ کسی جاندار مخلوق کی شبیہ بنانی شرعاً ممنوع ہے۔ لباس ان کا سیاہ تھا۔ بجز دستار کے جو سپید تھی اور جس کے سامنے کے رُخ حلقہ مروارید میں ایک بیش بہا یاقوت نصب تھا۔ کمر میں دو تلواریں ایک اس طرف اور ایک اُس طرف آویزاں تھی۔ داہنے ہاتھ میں سونے کا ایک عصا تھا۔ ایک پہلو میں صدر اعظم اور دوسرے میں شاہی جلاد کھڑا تھا۔ صدر اعظم میانہ قد اور لاغر اندام تھے۔ جلاد ایک دیو ہیکل حبشی تھا جس کے ہاتھ میں ایک لمبی اور بھاری تلوار تھی۔

دربار میں جو لوگ حاضر ہو رہے تھے۔ وہ پہلے سنگ سیاح کے آستانے کو بوسہ دیتے تھے، اُس وقت ان کی نظر دہلیز کے اس مقام پر پڑتی تھی، جہاں شب گذشتہ کو امیر قزوین کا خون گرا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اب دہلیز سے خون صاف کر دیا گیا تھا۔

جب اہل دربار جمع ہو گئے تو نقیبوں نے خلیفہ کا نام ان القاب وآداب کے ساتھ پکارا۔"

حضرت اقدس امام الشریعت سراج الملّت، جانشین سید المرسلین وخلفائے راشدین واسلافیہ الصالحین ۔ یہ حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ۔ سلطان المشر قین خاقان البحرین۔ ماحی

آلافات۔صاحب الحسنات ابو محمد المقتفی لامر اللہ خلد اللہ ملکہ' وسلطانہ' رونق بزم عدالت ہیں۔ آداب بجالاؤ۔کورنشات عرض کرو"۔اس کے بعد دربار شروع ہو گیا۔

ظل سبحانی نے ارباب مجلس سے خطاب فرمایا۔سب لوگ نہایت ادب سے نظریں نیچی کیے دوزانوں بیٹھے رہے۔ پہلے اُن مصائب اور آلام کا ذکر کیا،جن کا مقابلہ دولت بنی عباس کو گذشتہ زمانہ میں پیش آیا تھا۔آل سلجوق کا حال بیان کر کے فرمایا کہ اس قوم نے تو ہمارا چراغ ہی گل کر دیا ہوتا۔فاطمین مصر کی نسبت ارشاد ہوا کہ کاان دعویٰ خلافت باطل تھا۔انہوں نے ہمارے مقبوضات شام وعراق پر لشکر کشی کی۔پھر دیار مغرب کے بے دین عیسائی اپنے ملکوں سے اُٹھے اور فلسطین میں داخل ہو کر یروشلم پر قابض ہو گئے۔یہ کل واقعات خلیفۃ المسلمین نے ایسے رقت انگیز الفاظ میں کہے کہ سامعین آبدیدہ ہو گئے۔پھر فرمانے لگے"اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو ان کی نافرمانیوں کی سزا دے کر وقتاً فوقتاً ان کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔اب اس کے فضل سے ہماری شب نکبت کی سحر نمودار ہو گئی ہے۔ظلمت دور ہو کر نیّر اقبال پر پھر تاباں ہے۔ کتے بھونکتے ہی رہے مگر کاروان آگے بڑھ گیا۔جس وقت اس بندۂ ناچیز ابو محمد المقتفی لامر اللہ کو اللہ تعالےٰ نے مسند خلافت عطا فرمائی ہے۔رنج کی جگہ مسرت اور ناکامی کی جگہ فتحیابی نصیب ہوئی ہے۔بتاؤ سلجوقیوں کی سلطنت کیا ہوئی؟ وہ اس طرح نابود ہو گئی جیسے آندھی کچھ دیر زمین پر چل کر صحرا میں فنا ہو جاتی ہے۔اب ان کی سلطنت کی جگہ خراسان،موصل اور دمشق کی ریاستیں ہیں۔جو ہماری دل سے خیر خواہ و باجگذار ہیں۔مصر میں فاطمی جو درحقیقت ہمارا نائب وماتحت ہے۔اپنے تخت پر آجکل خاموش بیٹھا ہے۔بے دین عیسائی ارض نیل کو ارض فرات سے جدا کرنے کے لیے فلسطین میں تلواریں چلا رہے ہیں۔اس میں بھی ہمارا ہی نفع ہے،لیکن خود ہماری سرحدوں سے دیار مغرب کے کفار باہر نکال دیئے گئے ہیں۔موصل کے جانباز لشکر نے ارفہ کے شہر سے انہیں بے دخل کر دیا ہے اور ہزارہا کافر جنہم حاصل ہو چکے ہیں۔ صلیب کا زور ٹوٹ گیا ہے۔اہل صلیب جس عزم اور ارادے سے اپنے وطن کے برفستانوں،پہاڑوں اور جنگلوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے،اب وہ عزم اور ارادے سب بھولتے جاتے ہیں۔ایک مہذب ملک اور معتدل موسم میں پہنچ کر فنون لطیفہ کے شائق اور عیش وعشرت کے بندے ہو چلے ہیں مگر اس اثنا میں تسخیر ممالک کے لیے باب فتح کو ہم نے مستحکم کر دیا اور ہمارے وفادار حارس الحصان سلیم بن طاہر کی تلوار نے سمت جنوب میں حدود مملکت کو اتنی دُور پہنچا دیا ہے کہ کوئی دن میں آل عباس کا سیاہ پھریرا بصرہ کی دیواروں سے بلند

ہو کر سمندر کی موجوں پر لہرانے لگے گا"۔

لڑکو! تمہارے جد امجد سلیم ایوان میں نہایت فکر مند اپنے ہی خیالات میں مستغرق بیٹھے تھے لیکن جب امیر المومنین نے ایسے الفاظ میں ان کی تعریف کی۔ تو سب کی نظریں ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بچو! میں تمہارے دادا کے نانا سلیم کی شکل وصورت اچھی طرح نہیں بیان کر سکتا۔ کوئی تصویر بھی ان کی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ بڑے متشرع مسلمان تھے۔ کسی مصور کی مجال نہ تھی کہ ان کی شبیہ بنائے مگر جہاں تک روایت ہے۔ یہی سنا ہے کہ دوہرے بدن کے نہایت کسیلے مضبوط اور قد آور شخص تھے۔ نقشہ چہرے کا اُبھرواں تھا اور دیکھنے والوں پر ان کی صورت سے ایک رعب پیدا ہوتا تھا۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے۔ اس وقت ان کی عمر زیادہ ہو گئی تھی۔ کچھ تو سن کا تقاضا اور بہت کچھ عمر کی بھی محنت و جفا کشی کا نتیجہ تھا کہ ان کا چہرہ خشک ہو گیا تھا اور اس پر جُھریاں پڑ گئی تھیں۔ ڈاڑھی بالکل سپید ہو گئی تھی۔ سرکاری ملازمت سے وہ علیحدہ ہو چکے تھے۔ گو میدان جنگ میں جاں نثاری کی خدمت کو انہوں نے بہت ہی دل ناخواستہ چھوڑا تھا۔ جس وقت انہوں نے ملازمت شروع کی تھی تو خلیفہ بغداد کی حکومت بغداد کی دیواروں کے اندر ہی اندر باقی رہ گئی تھی۔ بچو! یہ تمہارے دادا سلیم کے زور بازو کا نتیجہ اور میدان کارزار میں استقامت اور تدبیر مملکت میں اصابت رائے کا ثمرہ تھا کہ امیر المومنین کو اپنے دشمنوں سے نجات ملی۔ اس طرح اُن کی حدود سلطنت میں وسعت آئی لیکن قسمت میں اگر عمر بڑی لکھی ہے تو ایک دن بڑھاپے کا آنا ایسا ہی ضروری ہے، جیسے دن بیتے سورج کا ڈوبنا اور یہی سلسلہ انسان کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہے گا۔ تاوقتیکہ آثار قیامت ظاہر ہوں اور آفتاب مغرب سے طلوع ہونے لگے۔ غرض جب سلیم بوڑھے ہو کر فوجی ملازمت سے علیحدہ ہوئے تو امیر المومنین نے شہر بغداد کی باہر والی فصیل اور اس کے تمام برجوں، مورچوں اور دمدموں کا محافظ مقرر کر کے ان کا لقب حارس الحصان یا محافظ شہر پناہ رکھا۔ گو فوج کی نوکری چھوڑ چکے تھے۔ پھر بھی محکمہ حرب میں ان کا درجہ بہت بڑا تھا اور امور سیاست میں ان کی رائے کو بہت وزن حاصل تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ حقیقت میں امیر المومنین کے بے حد خیر خواہ تھے اور رعایا کو بھی ان کی ذات پر بہت بھروسا تھا۔ جس وقت خلیفہ مقتفی تقریر کر رہے تھے۔ تو سلیم چپ بیٹھے یہ سوچتے تھے (اور اسی سے ان کی دانشمندی ظاہر ہوتی ہے) کہ خراسان۔ موصل اور دمشق کی ریاستوں کو اپنا ماتحت اور ہوا خواہ سمجھنا ہی غلطی ہے۔ کیونکہ ان میں جب کسی کی قوت بڑھ جائے گی۔ تو وہ خلیفہ بغداد کو بے دست و پا کر دے گا۔ والئی موصل نے عیسائیوں کے قبضہ سے ارفہ کا شہر نکال لیا ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھ گئی ہے اور ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بلا

ومغرب کے عیسائیوں پر پھر ایک وحشت سوار ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی اس فتح سے مقدس مسیحی مقامات کی حفاظت کا جوش پھر ان میں تیزی پکڑ گیا ہے۔ چنانچہ مغرب کا شہنشاہ اور وہاں کے دوسرے بڑے بڑے بادشاہ اپنی اپنی فوجیں اور لشکر لے کر فلسطین میں داخل ہو گئے ہیں۔

غرض سلیم بن طاہر کا دل فکر میں ڈوبا ہوا تھا، چپکے بیٹھے یہی باتیں سوچ رہے تھے۔ خلیفہ مقتضی کے خیالات بھی جس قدر تھے، وہ ایک مضبوط طبیعت کے خیالات تھے۔ ان کی نظر کوتاہ نہ تھی۔ زمانہ حال سے پردہ اٹھا کر بہت دور مستقبل کی طرف اپنی نگاہیں جما رہے تھے لیکن تقریر میں ان کو حکمت اور تدبیر سے کام لینا ضروری تھا۔ پس فرمانے لگے کہ ''یہاں تک تو میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور سلطنت بنی عباس کی قوت اور استحکام کا ذکر کیا لیکن کون سا خوبصورت پھول ہے، جس کے ساتھ خار نہیں اور کونسا عارض گلگوں ہے، جس پر خال نہیں۔ ذرا ان ملاحدہ ناہنجار کے جرائم پر نظر کرو۔ یہ بدبخت دشمنِ خدا جو حشیش کھا کھا کر لوگوں کا خون کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے خنجر نے سلطان الپ ارسلاں اور ملک شاہ کے وزیر اعظم نظام الملک کو ہلاک کیا۔ خود سلطان ملک شاہ کو بھی زندہ نہ چھوڑا، زہر دے کر اس کی جان لی۔ ہماری ولایات میں کبھی یہاں کبھی وہاں حاکموں کو قتل کیا۔ موصل حلب، اصفہان، تبریز، دمشق بلکہ خود بغداد کے بازاروں اور لشکروں یہاں تک کہ مسجدوں کے صحنوں میں ساعت فتح اور حالت نماز میں ان کے خنجر بے گناہوں کی جانیں تلف کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مسند خلافت کی بھی تعظیم ان کے دلوں سے اُٹھ گئی۔ ہمارے اسلاف میں سے دو خلفا کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔ ہر ولایت اور ملک میں وہاں کے بڑے سے بڑے آدمیوں کو موت کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہر مستقل نظم سلطنت میں فساد اور فتنے برپا کر کے خفیہ سازشوں سے اس کی تباہی کے درپے ہو جانا ان کا شیوہ ہے۔ گو ہم نے ان میں سے ہزاروں کو واصل جہنم کیا ہے لیکن وہ قتل وغارت سے کسی طرح باز نہیں آتے۔ کچھ زمانہ سے ان کی سیہ کاریاں بند تھیں لیکن کل شب ہی کا واقعہ آپ کی نظروں کے سامنے گذر چکا ہے اور اسی غرض سے ہم نے اپنے ندیموں اور مشیروں کو یہاں طلب کیا ہے۔ پابند ہم صرف خدا کے حکم کے ہیں لیکن اس کے بندوں سے صلاح ومشورہ کرنا بھی منظور خاطر ہے''۔

اس قدر فرما کر امیر المومنین خاموش ہو گئے۔ وزراء میں سے ایک ایک شخص سامنے آیا اور آداب بجا لا کر امور دریافت طلب میں جو کچھ رائے رکھتا تھا۔ عرض کرنے لگا۔ ان میں سب سے پہلے محافظ الاشجار سامنے حاضر ہوا۔ شب گذشتہ جو عتاب امیر المومنین کے بشرہ سے اس کے اوپر

ظاہر ہوا تھا، چاہتا تھا کہ خوشامد کر کے اُسے رفع کرے۔ آج اس کا لباس اور بھی پُر تکلف تھا۔ سامنے حاضر ہو کر عرض کرنے لگا:۔

''یا امیر المومنین! برگزیدہ خدا میں جس کی دہلیز کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ یہ ناچیز غلام اپنے خیالات عرض کرتا ہے۔ جملہ واقعات پر غور فرما کر جو نتیجہ خلافت پناہ نے پیدا کیا ہے، وہی بجا اور درست ہے۔ لاریب یہ خون ناحق کسی حشیشی کے سر تھپتا ہے ان کا گروہ زیادہ تر ولایت قزوین کی سرحد پر آباد ہے اور اس میں شک نہیں کہ امیر قزوین کی سرحد پر آباد ہے اور اس میں شک نہیں کہ امیر قزوین ان کی سرزنش میں حد سے زیادہ سختی سے کام لیتا تھا۔ ظل سبحانی نے دمشق کا واقعہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔ ہم کیونکر بھول سکتے ہیں کہ تاج الملوک والئی دمشق نے ابوالوفا کی غداری اور دغابازی کی خبر پاتے ہی چھ ہزار حشیشیوں کو تہ تیغ کر کے شہر دمشق کو اس بلائے سخت سے بچالیا۔ پس مناسب ہے کہ جلالت مآب اپنی فوج بے شمار کو غضب الٰہی کی طرح ان کے سروں پر نازل کر کے ان کی آبادیوں اور قلعوں کو تباہ و مسمار فرمادیں اور قلعہ اَلموت کو جلا کر خاک اور اس کے شیخ کو مع اس کی جماعت کے صفحۂ ہستی سے مٹادیں''۔

خلافت پناہ نے یہ تقریر سُنی لیکن شب وقوعہ کو اس شخص کے جملوں سے جو بدگمانی ان کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ رفع ہونے کی جگہ اَور پختہ ہوگئی اور یہ خیال جم گیا کہ یہ شخص در پردہ حشیشیوں کا دردمند و ہواخواہ ہے۔

محافظ الاشجار فیروز نے جو خیالات عرض کئے تھے اور لوگوں نے بھی بہ الفاظ دیگر اسی قسم کی باتیں زیادہ خوشامد کے ساتھ عرض کیں۔ جب تمام فصیح و بلیغ تقریریں ختم ہولیں تو خلافت مآب سلیم بن طاہر کی طرف متوجہ ہوئے، جو ابھی تک نہایت خاموش اور متفکر بیٹھے تھے۔ امیر المومنین فرمانے لگے ''سلیم! کیا تم اس معاملے میں کوئی رائے پیش نہ کرو گے؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ مابدولت ہمیشہ تمہاری نیک صلاح سننے کے مشتاق اور منتظر رہتے ہیں۔ عقل و دانش کی راہیں تم پر کھلی ہیں، پھر کیوں اپنے خیالات ظاہر نہیں کرتے''۔

سلیم اپنی جگہ سے اُٹھے اور امیر المومنین کے سامنے حاضر ہو کر آداب بجا لائے۔ عرض کرنے لگے کہ ''ظل سبحانی نے اس ادنیٰ خادم کی رائے دریافت کرنے میں اس کی بے حد قدر افزائی

فرمائی اور لوگوں نے جو عقل میں مجھ سے زیادہ اور صاحب قلم ہیں، سیف وسنان سے کام لینے کی رائے دی ہے۔ یہ کمترین ایک سیدھا سادا سپاہی ہے۔ جس کو صرف یہ عزت حاصل ہے کہ اس کے جسم پر زخموں کے نشان ہیں اور یہ زخم میدان جنگ میں اسلام کی حمایت اور اپنے آقا کی خدمت گذاری میں پہنچے تھے۔ اس معاملہ خاص میں یہ ناچیز باوجود اہل سیف ہونے کے تلوار کی جگہ تدبیر سے کام لینے کی رائے دیتا ہے اور اس کی تین وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس وقت خلافت پناہی کے قلمرو میں ایسا امن وسکوت ہے۔ جیسا شام کے وقت ہوا بند ہونے کی حالت میں کسی بڑی جھیل کی سطح پر ہوتا ہے۔ جس وقت ایک لشکر جرار طوفان تیز وتند کی مانند ملک میں سے گزر کرے گا تو معلوم نہیں، اس کی سطح ساکت وصامت پر کیسی کیسی بلا خیز موجیں اُٹھنے لگیں۔ فوجوں کے کوچ کرتے ہی تمام رعایا میں ہل چل مچ جارے گی اور بہت سے پُر امن شہر غارت اور تباہ ہو جائیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ واقعہ دمشق میں گو یہ سچ ہے کہ تاج الملوک نے چھ ہزار حشیشیوں کو قتل کیا لیکن حشیشی اس کا انتقام لئے بغیر نہ رہے۔ اس گروہ کے مقابلے میں جب کبھی تلوار سے کام لیا گیا ہے، ہمیشہ اس کی عداوت اور عداوت کے ساتھ قتل کے وقوعے زیادہ پیش آتے رہے۔ اگر ہم نے ان ملاحدہ کے قبرستانوں میں نئی پودیں لگائی ہیں تو ان کے خنجروں نے بھی کچھ کم گل نہیں کھلائے ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس گروہ کے مقصد اور انتشار سے ہم بالکل لاعلم ہیں۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ پہاڑوں کے اندر دُور جا کر بڑے بڑے مضبوط قلعوں میں رہتے ہیں اور ہر منضبط ومنظم حکومت کو تباہ کرنا اور اپنے شیخ الجبل کے سوا کسی حکمران کو زندہ نہ چھوڑنا، ان کا کام ہے۔ ہم ان کو ملحد اور بے دین کہتے ہیں لیکن وہ دین کے بظاہر اس قدر پابند ہیں کہ امیر المومنین کی رعایا میں بھی یہ بات نہیں پائی جاتی۔ سنتے ہیں کہ ان کے بہت سے راز واسرار ہیں، جو ان کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتے لیکن ان کا معلوم ہونا ضروری ہے اور ان کے ایسے عقائد کا دریافت کرنا بھی لازمی ہے، جنہوں نے ان لوگوں کو بغاوت اور خونریزی پر آمادہ کر رکھا ہے۔ جو ارادہ وہ کر لیتے ہیں۔ پھر اس پر عمل کرنے میں وہ کسی بات سے نہیں ڈرتے۔ اگر ان میں کا کوئی قاتل گرفتار ہو جاتا ہے تو موت کا حکم سُن کر ہنستا ہے اور سخت سے سخت عذاب اُٹھانے اور خوشی سے جان دینے پر تیار ہوتا ہے۔ پس میری صلاح یہ ہے کہ پہلے اس گروہ کے مقاصد اور اغراض خفیہ طور پر دریافت کئے جائیں اور یہ معلوم کیا جائے کہ آخر وہ کیا چیز ہے، جس کی وجہ سے اس گروہ کے داعی موت اور عذاب سے مطلق خوف نہیں کرتے۔ ایک ہوشیار طبیب علاج سے پہلے مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ اسی طرح پہلے ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے کہ مرض دراصل کیا ہے، اس کے بعد علاج ممکن ہوگا۔ خواہ تلوار سے ہو، خواہ ہدایت

اور تربیت سے''۔

لڑکو! جب یہ تقریر ختم ہونے کو ہوئی تو تمہارے دادا سلیم پر چاروں طرف سے قہر آلودہ نگاہیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ ارباب مجلس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کسی مشکل بات پر غور کرنے یا عقل کی بات سننے کو اپنے عیش و آرام اور تن آسانی میں مخل سمجھتے تھے۔ امیر المومنین رات کے واقعہ سے کچھ ایسے جھلائے ہوئے تھے کہ تسلیم کی تقریر سے ان کی پیشانی پر بھی بل آ گئے۔ غرض تمہارے دادا جب خاموش ہوئے تو اعتراض کی صدا ہر طرف سے بلند ہوئی۔ مگر امیر المومنین نے تقریر شروع کر دی اور یہ شور فوراً دب گیا۔

امیر المومنین فرمانے لگے۔ ''سلیم بن طاہر محافظ شہر پناہ نے اپنی تقریر میں تین وجوہ حشیشیوں کے مقابلے میں تلوار اُٹھانے کے برخلاف بیان کی ہیں۔ پہلی وجہ یہ بیان کی ہے کہ لشکر شاہی کی نقل و حرکت سے رعایا کو ایسے آزار پہنچ سکتے ہیں کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے، لیکن مابدولت سمجھتے ہیں کہ یہ وجہ جس وقت ہمارے وفا کیش سلیم کے دماغ میں آئی تھی تو غالباً ان کو اس بوڑھی جُروا کا قول یاد آیا ہوگا، جو کہا کرتی تھی کہ اگر کسی غریب کے درخت سے بادشاہ ایک سیب توڑ لیتا ہے تو اُس کے ہمراہی سارا باغ لوٹ لیتے ہیں یا اگر بادشاہ کسی سے مرغی کا انڈا لیتا ہے تو اس کے لشکری ہزار مرغ سیخ پر چڑھا کر چٹ کر جاتے ہیں لیکن مجاہدین اسلام کے لشکر کا یہ طریقہ نہیں ہو سکتا اور اگر ہو تو لشکر کے افسروں پر اس کا الزام عائد ہوگا۔ دوسری وجہ کو بھی ہم اس بنا پر درست نہیں سمجھتے کہ ایک غریب کسان بھی جب بھٹ کٹیا کے درختوں سے اپنے کھیت کو صاف کرنا چاہتا ہے۔ تو اس موذی درخت کے چھوٹے سے چھوٹے پیڑ کو بھی جڑ سے کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور اس بات خیال رکھتا ہے کہ کوئی جڑ یا بیج اس کا ایسا نہ رہ جائے۔ جو پھر جم کر اس کے کھیت کا ستیاناس کرے۔ تاج الملوک کا فرض تھا کہ جہاں چھ ہزار حشیشی قتل کئے تھے۔ وہاں ساٹھ ہزار قتل کرتا۔ تیسری وجہ جو ہمارے وفادار سلیم نے بیان کی ہے۔ وہ معقول ہے، اس لئے ہم حکم دیتے ہیں کہ حشیشیوں کے عقائد اور طریقوں کو معلوم کیا جائے اور اس تحقیقات کے بعد انسداد جرائم میں جو کامیابی ہوگی۔ اس کے صلہ کا مستحق سلیم بن طاہر ہوگا۔ سلیم کا ایک فرزند قاسم ہے۔ فوج میں اس کے حسن کارگذاری سے مابدولت مطلع ہوتے رہے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ وہ اس کام کو بھی خوش اسلوبی سے انجام دے گا۔ پس ہمارا فرمان ہے کہ قاسم بن سلیم قلعہ الموت میں جا کر تمام حالات خفیہ طور پر تحقیق کر کے ہم کو ان سے مطلع کرے''۔

خلیفہ مقتضیٰ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے۔ تھوڑی دیر تک صورت پر ایک قسم کا اطمینان سا ظاہر

ہوتا رہا۔ پھر یک لخت چہرے پر وغیظ وغضب کی علامات شروع ہوئیں اور للکار کر بولے۔ ''کہاں ہے وہ فیروز جو ہمارے جواہرات کے درختوں کی نگہبانی کرتا ہے۔ ہمارا مطلب اس شخص سے ہے، جس نے کل شب کو کہا تھا کہ قاتل کی تلاش بے سود ہے اور اس وقت بھی ہمارے سامنے گفتگو کر چکا ہے''۔ محافظ الاشجار خوف سے لرزتا کانپتا سامنے حاضر ہوا۔

امیر المومنین نے فرمایا۔ ''کیوں، تجھی نے کہا تھا کہ قاتل کی تلاش بے سود ہوگی۔ کل تو خنجر والے قاتل کی تلاش کو ٹالنا چاہتا تھا اور آج قاتلوں پر فوج کشی کی سفارش کرتا ہے؟ رعایا کی سلامتی اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے ہم پر توراتوں کی نیند حرام ہو جائے، اور تو مشیر سلطنت ہو کر تحقیقات جرائم سے ہم کو غافل بنانا چاہتا ہے؟ چھ ہزار حشیشی قتل ہوئے، کیا وہ تیرے بھائی بند تھے کہ ان کے قتل کا طعنہ دیتا ہے؟ کیا تو نے اس قتل کی نسبت یہ نہیں کہا تھا کہ وہ قاتل کا ہاتھ نہ تھا، خدا کا ہاتھ تھا۔ ارے بد بخت شیطان کے کام کو نعوذ باللہ خدا سے منسوب کرتا ہے؟ لاریب تو خدا کا دشمن ہے'' اتنا کہہ کر جلاد کی طرف اشارہ کیا۔ تلوار چمکی اور محافظ کا سر قلم ہو کر فرش پر گرا۔ اس کے بعد ہی فوج محافظ کے سردار کو طلب کیا۔ اس سے پوچھا کہ قاتل کا پتہ چلا۔ وہ چُپ کھڑا رہا۔ خلافت پناہ فرمانے لگے ''قصر خلافت میں جس قدر لوگ آتے ہیں، ان کی جان و مال کی حفاظت تمہارے سپرد رہتی ہے۔ ہمارے محل میں قاتل کا گذر رہا، اور تم کو خبر تک نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ہم تمہارے حق میں سزائے موت کا حکم دیتے ہیں''۔ اس حکم کے نافذ ہوتے ہی فوراً اس پر عمل کیا گیا۔

مجلس برخاست ہوئی سلیم بن طاہر بھی اُٹھ کر چلے۔ ایوان کا مخملی پردہ اٹھا کر باہر آئے۔ اسلام اور اسلامیوں پر جان و مال ہمیشہ قربان کرتے رہے تھے۔ دل مضبوط تھا۔ بیٹے کی مفارقت اب پھر درپیش تھی۔ اس خیال سے دل پر ایک غم طاری ہو جاتا تھا۔ مگر وہ خدا پر بھروسہ رکھنے والوں میں تھے۔ باہر نکل کر جب صحن میں آئے تو دونوں طرف سونے چاندی کے درختوں پر نظر پڑی۔ یہ بڑی صنعت کی چیزیں تھیں۔ انہی کی وجہ سے قصر کا نام قصر الاشجار یا قصر الشجر ہو گیا تھا۔ ان میں ایک درخت ایسا تھا۔ جس میں زمرد کی پتیاں اور جواہرات کے پھول کھلے تھے۔ شاخوں میں چڑیاں بیٹھی تھیں۔ جن کے پرپرزے یاقوت اور الماس کے تھے۔ دوسرے درخت بھی مرصع تھے۔ اس کی ڈالوں پر پندرہ چھوٹے چھوٹے سونے کے سوار بنے تھے۔ جن کی قباؤں اور عماموں پر چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے موتی جڑے تھے۔ جواہرات کی چڑیاں سونے کے درخت میں چہچہا رہی تھیں اور سونے کے سوار تلوار کے ہاتھ دکھاتے ہوئے درخت کی ڈالوں پر گھوڑے دوڑا رہے

تھے۔لڑکو! تم نے بھی ان عجائبات کا حال سنا ہوگا۔محل میں یہ چیزیں بڑی زینت کی تھیں۔بعض نامعقول لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چڑیوں کے چہچہے قدرتی نہیں معلوم ہوتے اور سواروں کے گھوڑوں کی جست وخیز بھی بھدی معلوم ہوتی ہے مگر یہ لوگ جھوٹ بولتے تھے۔خود میں نے ان چڑیوں اور سواروں کو دیکھا اور سنا ہے جن کلوں کے ذریعے سے یہ چیزیں حرکت کرتی تھیں۔حقیقت میں ان کے بنانے میں محافظ الشجار نے اپنا کمال دکھایا تھا مگر خدائی قدرت دیکھو کہ آج وہ زندہ نہ تھا مگر ان کی چڑیاں اسی طرح چہچہا رہی تھیں اور گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

سلیم ان درختوں کو دیکھتے ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے صحن سے نکلے اور دروازے میں سے گزر کر محل کے باغ میں داخل ہوئے۔ جب باغ سے باہر نکلنے کو ہوئے تو دروازے کے قریب شیروں کے دہاڑنے کی آواز آئی۔دیکھا کہ دروازے کے دونوں طرف بڑے بڑے پنجروں میں صدہا شیر بند ہیں۔ گلے میں سونے کی موٹی موٹی زنجیریں پڑی ہیں۔کبھی دہاڑتے بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی پھر کھڑے ہو کر گرجنے لگتے ہیں یا تو راتب کا وقت قریب ہے یا سردار فوج کی موت پر نوحہ گر ہیں جو ان کے کھانے پینے کی خبر رکھتا تھا۔

سلیم اب قصر کے دروازے سے باہر نکل آئے۔یہاں ان کا گھوڑا تیار کھڑا تھا۔اس پر بیٹھ کر گھر کی طرف چلے۔دن خاصا چڑھ گیا تھا۔دھوپ خوب کھلی تھی۔ہوا سرد چل رہی تھی۔اردگرد کی چیزیں سب بھلی معلوم ہوتی تھیں مگر ان کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ عنقریب کوئی بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

میرے بچو! یہاں تک جو کچھ تم نے سنا۔اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ بادشاہوں کو کیسے کیسے فکر لاحق ہوتے ہیں۔اپنی رعایا اور ملک کی حفاظت کے لئے بعض وقت ان کو ایسے حکم دینے پڑتے ہیں جو دشمن کی نظر میں عدل وانصاف کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ان کے عمل میں قصور ہوسکتا ہے مگر نیت بری نہیں ہوتی۔

۞ ۞ ۞

تیسرا باب

سلیم بن طاہر کے محل کے گرد ایک عالی شان باغ اور وسیع زمین تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ سلیم دیوانے ہیں کہ صرف مکان کے لئے اتنی بڑی اور قیمتی زمین خریدی ہے لیکن اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ ان کی تمام عمر گھوڑے یا اونٹ کی پیٹھ پر کوہستانوں اور بیابانوں میں گذری تھی۔ شہروں کی گنجان آبادی سے ان کا دل گھبراتا تھا۔ جب دیکھا کہ اب بغداد ہی میں مستقل سکونت رکھنی ہوگی تو سوچا کہ تازی ہوا اور کھلی ہوئی جگہ کے لئے جتنی قیمت بھی دینی پڑے۔ گراں نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ گلاب کی پھلواریاں لگانے کا ان کو بہت شوق تھا اور اس خیال سے بھی زمین بہت اچھی اور بڑی درکار تھی۔ غرض انہوں نے ایک بہت بڑا قطع گراں قیمت خرید کر اس پر اپنا محل اور باغ بنایا۔ سلیم جب سنتے تھے کہ ان کے ملنے والے انہیں دیوانہ کہتے ہیں تو ہنستے تھے اور کہتے تھے یہ سلطنت اور ریاست کی باتوں میں یہ لوگ مجھے بہت ہوشیار اور عاقل سمجھتے ہیں۔ اچھا ہے خانہ داری کی باتوں میں احمق بھی سمجھ لیں مگر خود اپنا حال تو دیکھیں کہ سلطنت اور گھر دونوں کے انتظام میں بیوقوف اور جاہل ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ بہر کیف ان کو یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس قدر شہر کو ترقی ہوگی، میری زمین قیمتی ہوتی جائے گی اور اس سے میرے سرمایہ میں اضافہ ہوگا جو میں اپنے بچوں کے لئے چھوڑ جاؤں گا۔ بشرطیکہ انقلاب حکومت اور بادشاہوں کے تلون نے اس بات کی اجازت دی کہ کسی کا متروکہ اس کی اولاد کو پہنچ جائے باوجود ان سب باتوں کے دوست ان کو گھر کے انتظار اور طریقے میں بے پروا سمجھتے تھے لیکن واقعہ یہ تھا کہ جیسا اچھا طور طریقہ ان کے گھر کا تھا، گو وہ عجیب سمجھا جاتا ہو، ویسا کسی اور گھر کا سننے میں نہیں آیا تھا۔

ان کے محل کا گلابوں والا باغ خاص طور پر قابل دید تھا اور سلیم کے لئے وہ بہت ہی راحت اور تفریح کا مقام تھا۔ اس باغ کے گرد ایک اوسط درجہ کی اونچی چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری کے اندر دیوار سے ملی ہوئی سرو اور کھجوروں کی سر درختیاں تھیں۔ ان سے اندر کو اناروں اور پھلوں کے درخت اور ان سے اندر کو پھولوں کی بڑی بڑی کیاریاں اور سب کے بیچوں بیچ ایک بڑا چوکور ٹکڑا

خالی زمین کا تھا۔ جس پر نہ کوئی درخت تھا' نہ جھاڑی' اگر اس ٹکڑے کے بیچ میں کھڑے ہو کر دیکھو۔ تو چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ بچو! تم نے دیکھا ہوگا کہ باغوں میں جہاں زمین خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں اکثر مٹی یا بجری پھیلا دیتے ہیں۔ گھاس نہیں جمنے دیتے لیکن تمہارے دادا سلیم نے یہ بات نہیں رکھی تھی۔ ان کا مذاق کچھ عجیب تھا۔ انہوں نے اس ٹکڑے میں گھاس اپنی قدرتی حالت میں رہنے دی تھی۔ اس وجہ سے ان کے دوست ان کو اور بھی خبطی سمجھتے تھے۔

اسی خودرو گھاس کے تختے پر قاسم اور اس کی بہ خجستہ خاتون دونوں کھیل رہے تھے۔ سلیم خود بڑے شہسوار تھے۔ چونکہ ان کی رگوں میں ترکی و ایرانی خون تھا۔ اس لئے چوگان کھیلنے کے بڑے شوقین رہ چکے تھے۔ اب بڑھاپے کی وجہ سے خود تو کیا کھیلتے، بیٹے کو اس میں استاد بنانا چاہتے تھے۔ غرض جس صبح کا یہ ذکر ہے۔ قاسم اسی کھیل میں مصروف تھے۔ باغ گو بہت بڑا تھا لیکن بیچ والا گھاس کا تختہ اس کھیل کے لیے کافی نہ تھا۔ مشق کے لیے شہر پناہ کے باہر والا میدان زیادہ مناسب تھا۔ مگر قاسم گھر سے باہر نہیں گئے۔ وجہ یہ تھی کہ حال میں لڑائی سے واپس آئے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ بغداد سے اطراف جنوب میں امیر المومنین کی سلطنت کو وسعت دی جا رہی تھی اور وہاں جنگ و پیکار کا بازار گرم تھا۔ چونکہ قاسم اب جوانی کو پہنچ گئے تھے۔ باپ نے انہیں لڑائی پر بھیجنا ضروری سمجھا تا کہ قلمرو خلافت کو دشمنوں کی دست بُرد سے بچانے میں جوہر شجاعت خوب خوب دکھائے، اور جس لڑائی کا زور کم ہو گیا، تو اجازت لے کر وطن واپس آئے۔ آج کل وہ بہت ہی خوش تھے کہ ہر وقت بہن کا ساتھ تھا۔ دونوں بہن بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جس کو سلیم کے عزیز و اقارب ایک لڑکی کے حق میں اچھا نہ جانتے تھے اور جب سنتے تھے کہ خود سلیم نے ایسی باتوں کی اجازت دے رکھی ہے تو سلیم کو اور بھی پاگل کہنے لگتے تھے۔ بڑا اعتراض اس پر تھا کہ خجستہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے، اور چوگان سے گیند پیٹ کر اس کے پیچھے گھوڑا دوڑاتی ہے۔ خجستہ خاتون کی ماں ان باتوں کو بہت ناپسند کرتی تھیں لیکن بابا بہت خوش ہوتے تھے، اور بیٹی کی اور ہمت بڑھاتے تھے اور کہتے تھے کہ عورتوں کو بھی بہت مضبوط اور تندرست رہنا چاہیے۔ زمانہ نازک ہے، اور وہ وقت دُور نہیں ہے کہ جان اور عزت کی سلامتی کے لیے عورتوں کو بھی لڑائیوں میں ہتھیار لگا کر لڑنا پڑے لیکن سلیم اتنے دیوانے نہ تھے کہ بیٹی کو گھر کی چار دیواری سے باہر چوگان کھیلنے کے لیے بھیج دیتے اس لئے قاسم مشق کے لیے شہر کے باہر نہیں گئے بلکہ بہن کے ساتھ ہی گھر کے باغ میں کھیلتے رہے۔

بھائی بہن اس طرح کھیل رہے تھے کہ قاسم تو ایک نیچے سے گھوڑے پر سوار تھے اور بہن گھاس پر کھڑی بھائی کی طرف گیند پھنکتی تھی اور بھائی اسے چوگان سے پیٹ کر پھر بہن کی طرف دوڑا دیتا تھا۔ کبھی کبھی نشانہ خطا بھی ہو جاتا تھا۔ لڑکو! تمہارے جدامجد سلیم کے ان دونوں بچوں کو خوبصورتی ضرب المثل ہو گئی تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ شاخ پر دو خوش رنگ پھول یا ڈالی پر دو خوبصورت پھل نہ دیکھے۔ ان دو بچوں کو دیکھ لیا۔ رنگ دونوں کا بہت گورا تھا اور نقشہ اُبھرواں جیسے یونانیوں کا ہوتا ہے۔ صورتیں بھی دونوں کی بہت ملتی تھیں۔ دونوں بالا قامت تھے۔ مگر آنکھوں کے رنگ میں فرق تھا۔ قاسم کی پتلی سیاہ اور خجستہ کی شربتی تھی۔ اس وقت دونوں کھیلتے اور خوب زور زور سے ہنستے تھے۔ دل باغ باغ تھا کہ بھائی نے پیاری بہن اور بہن نے پیارے بھائی کو مدت کے بعد دیکھا ہے۔ اس وقت کچھ ایسا عالم سرور تھا کہ جب یہ دونوں ہنستے تھے۔ تو سر پر سورج کی کرنیں اور چمن میں گلاب کے پھول بھی ہنسنے لگتے تھے۔

گرمی کا موسم شروع ہو گیا تھا اور دن گرم ہونے لگے تھے۔ باغ میں سبزہ کچھ ہلکا اور زردی مائل ہو چلا تھا۔ کھیلتے کھیلتے جب دھوپ تیز ہوئی، اور کھانے کا وقت بھی آ گیا تو دونوں نہانے کے لیے گھر کی طرف چلے۔ خجستہ زنان خانہ میں چلی گئی۔ قاسم دیوان خانہ میں آئے۔ تا کہ کوئی تازہ خبر ہو تو سُنیں۔ کل شب کا قصر والا واقعہ انہوں نے بھی سُنا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ باوا جان آج صبح ہی شاہی مجلس میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ابھی تک محل سے واپس نہیں آئے۔ بہت سے لوگ جو رئیسوں، امیروں کے ہاں حاضر باشی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کچھ ماتحت عہدہ دار بھی تھے جو حکم احکام لینے یا ترقی کی درخواستیں لئے ہوئے حاضر تھے۔ بہت سے سائل بھی تھے۔ جو نوکری یا کسی اور طرح امداد کے خواہاں تھے۔ قاسم کو یہ خیال ہوا کہ باوا جان جس وقت مجلس سے واپس آئیں گے تو بہت ہی تھکے ہوئے اور بھوکے ہوں گے۔ اس لئے بہت سے لوگوں سے معذرت کر کے اور یہ کہہ کر کہ پھر ملاقات کیجئے گا۔ ان کو رخصت کیا لیکن جو لوگ ضروری کام کو آئے تھے۔ ان کو صحن میں سایہ کی جگہ بٹھا کر نوکروں کو حکم دیا کہ نُقل و شربت سے ان کی تواضع کریں۔ یہ کل انتظام کر کے قاسم غسل کے لئے جانے کو ہوئے۔ تو دروازے سے کسی کی آواز سُنی۔ ''راہ خدا میں دیتا جا''۔ فوراً مڑے۔ تو کیا دیکھا کہ ایک آدمی دروازے سے اندر آنا چاہتا ہے مگر دربان اُسے روکتے ہیں۔ قاسم یہ دیکھ کر خود دروازے کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ ایک بہت دُبلا پتلا آدمی۔ وحشت زدہ آنکھیں، بال پریشان، سر سے ایک پھٹا سا پھینٹا باندھے۔ گلے میں ایسے پھٹے حال بھک منگوں کا دردر پھرنا، ایک معمولی بات تھی، لیکن سلیم

بڑے رحم دل خیر وخیرات کے آدمی تھے۔ان کا حکم تھا کہ کوئی سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جائے۔قاسم نے باپ کے اس حکم کا خیال کر کے دربان کو ڈانٹا اور فقیر سے کہا۔"سائیں آپ اندر آ جائیں۔ابھی آپ کا سوال پورا کر دیا جائے گا"۔یہ کہہ کر قاسم غسل کرنے چلے گئے۔

غسل کے بعد اُس کمرے میں آئے۔جہاں سلیم کھانا کھایا کرتے تھے۔سلیم ابھی تک قصر سے واپس نہ آئے تھے۔اس وقت قاسم کو لشکر کی گرمی اور وہاں کی محنت اور مشقت کے بعد یہ کمرہ بہت ہی آرام و آسائش کا معلوم ہوا۔لڑائی ختم ہونے پر لشکر میں ایک ہی طرح زندگی بسر کرتے کرتے دل گھبرا گیا تھا اور یہ مصیبت اور تھی کہ جس دستہ فوج کے یہ افسر تھے۔اُس کا قیام ایسی زمین پر تھا،جس کے گرد دلدل اور جھیلیں تھیں۔آب وہوا بُری اور کسی طرح کی آسائش میسر نہ تھی۔اب گھر میں سب باتوں کا آرام تھا۔ہر چیز مہیا تھی اور دل ہر وقت خوش اور بشاش رہتا تھا۔قاسم گاؤ تکئے سے کمر لگا کر بیٹھ گئے۔نہا کر طبیعت ہلکی ہو گئی تھی۔باغ کے درختوں اور پھولوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمرے کو سرد اور معطر کر کے دیوار کی کھڑکیوں سے باہر نکل جاتی تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہی سرد ہوا اتنی گرم ہو جائے گی کہ نوکر کھڑکیوں پر خس کے پردے گرا دیں گے تاکہ گرمی اور دھوپ کی چمک کمرے میں نہ آئے۔قاسم سوچنے لگے کہ چھت کے نیچے گرمی سے جس قدر پناہ ملتی ہے۔وہ خیمے میں کب نصیب ہو سکتی ہے۔یہاں خوب ٹھنڈے ٹھنڈے شربت پیو،اور جب چاہے نیند بھر کر سوؤ۔

قاسم اسی خیال میں تھے کہ دفعتاً صحن میں ٹاپوں کی آواز آئی،دوڑ کر باہر آئے،اور ایک طرف مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔سلیم بن طاہر گھوڑے سے اُترے۔بیٹے کو گلے سے لگایا،اور گھر میں گئے۔کھانا تیار تھا۔ان کے آتے ہی دستر خوان بچھا،اور کھانے چُنے گئے۔سلیم نے نجستہ کو بھی اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا لیا کیونکہ بیٹی کو اکثر اپنے ساتھ کھانا کھلایا کرتے تھے۔یہ بات بھی دستور کے خلاف تھی۔اور سلیم کے اعزا اس پر اعتراض کیا کرتے تھے۔

جب دستر خوان پر کباب و کوفتے۔مرغ و ماہی کا گوشت۔پلاؤ اور مزعفر شیرینی اور میوے سامنے آئے،تو قاسم اس سوچ میں ہوئے کہ یہ خواب ہے یا عالم بیداری اور جب ان لذیز کھانوں کے تر لقمے اور برف میں افشردہ انار کے میٹھے میٹھے گھونٹ حلق سے اُترنے لگے،تب معلوم ہوا کہ لطف زندگی کس کا نام ہے۔کہاں الوان نعمت کے یہ خوان اور کہاں لشکر کا وہ کھانا جسے دیکھ کر بھوک بھاگ جائے۔کہاں یہ شربت اور برفاب کہاں وہ لشکر کا گرم اور کھارا پانی!سچ ہے،روشنی کی قدر اندھیرے سے نکل کر اور تندرستی کی قدر بیماری سے اُٹھ کر ہوا کرتی ہے۔قاسم کے لیے اس

سے بڑھ کر کس چیز میں مسرت ہو سکتی تھی کہ باپ اور بہن کے ساتھ بیٹھے کر کھانا کھا رہے ہیں۔ لڑائی کے واقعات اور وہاں کی تکلیفیں بیان کرتے ہیں لیکن جب انہوں نے سلیم سے پوچھا کہ بابا جان کل کے وقوعہ قتل کے متعلق مجلس نے کیا فیصلہ کیا۔ تو سلیم کچھ گردن ہلا کر چپ ہو رہے۔ بات کا جواب نہیں دیا اور چہرے سے ایک فکر اور پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ قاسم سمجھ گئے کہ کوئی بات خلاف مزاج پیدا ہوئی ہے۔ جب کھانا ختم ہوا، اور سلیم نے بیٹے کو بالا خانہ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ تو قاسم کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اوپر کی منزل میں ایک بڑا کمرہ اور اس کے چاروں طرف ایک برآمدہ تھا۔ باپ بیٹے زینے کے راستے برآمدہ میں آئے، اور برآمدہ سے کمرے کے دروازہ پر پہنچے۔ جس پر روئی کا ایک موٹا پردہ پڑا تھا۔ قاسم نے فوراً پردہ ہٹایا۔ پہلے باپ اور پھر خود کمرے میں داخل ہوئے۔

قاسم نے کہا: ”بابا جان آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں، فرمایئے تو کیا بات ہے؟“ سلیم بیٹھ گئے، قاسم کھڑے رہے۔ سلیم بیٹے کی صورت بہت ہی حسرت سے کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر بولے ”جان پدر تم لڑائی پر سے ابھی آئے تھے۔ تمہیں دیکھ کر دل کو چین اور آنکھوں میں نور آ گیا تھا مگر پھر ایک خدمت تمہارے سپرد ہوئی ہے اور امیر المومنین نے خود اُس کے لیے تمہیں منتخب فرمایا ہے“۔ اتنا کہہ کر سلیم کچھ ہنسے مگر یہ ہنسی رنج و تکلیف کی تھی۔

قاسم کو اس خبر سے کہ کوئی نئی خدمت سپرد ہوئی ہے، مطلق فکر نہ ہوئی۔ اس قدر البتہ خیال ہوا کہ اتنے دن کے بعد گھر آ کر پھر تھوڑے ہی دنوں میں گھر سے جدائی ہوتی ہے مگر اس کا بھی کچھ غم نہ ہوا کیونکہ بالکل جوانی کا عالم تھا اور جوانی میں یہ امنگ سب کے دل میں ہوتی ہے کہ کوئی بڑا کام کریں، جس سے شہرت اور ناموری ہو۔ اس کے علاوہ قاسم کی تعلیم و تربیت دین کے پختہ اصولوں پر ہوئی تھی۔ وہ خلیفہ اسلام کی خدمت کو اپنے حق میں باعث فخر سمجھتے تھے اور ظل اللہ کے لئے تلوار اٹھانے کو راہ خدا میں ایک جدوجہد سمجھتے تھے۔ جس سے دین اور دنیا دونوں کا نفع ہو۔

سلیم بولے کہ ”جب خدمت پر تم مامور ہوئے ہو۔ وہ نہایت عجیب اور سخت دشوار ہے“۔ سلیم آہستہ بات کرتے تھے اور بیچ میں اس طرح رک رک جاتے تھے، جیسے کوئی اپنے عزیز کو کسی بُری خبر کے سنانے میں رُکتا ہے۔ پھر دفعتہً ان کا چہرہ تغیر ہوا اور اس پیرانہ سال سپاہی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ مگر پھر اس طرح چہرے پر ایک سکوت ظاہر ہوا، جیسے خشک زمین پر دفعتہً مینہ برسے اور گرد و غبار دب کر مطلع بالکل صاف ہو جائے۔ کہنے لگے۔ ”بیٹا! ناعاقبت اندیشی نے عقل پر پردہ ڈال دیا، جو اصلاح سلطنت کی بھلائی سمجھ کر دی تھی۔ وہ میرے ہی لخت جگر کے حق میں

بدسلوکی ہوگئی"۔

قاسم باپ کے منہ سے اتنا سُن کراُن کے قدموں پرگر پڑے اور کہنے لگے۔ "بابا جان یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ میرے ساتھ بدسلوکی کریں۔ آپ کے برابر کون عاقبت اندیش ہوسکتا ہے ۔ میں جو کچھ ہوں، ازسرتاپا آپ ہی کا ایک احسان وکرم ہوں۔ دنیا میں آئے ہوئے مجھے اٹھارہ برس ہوئے۔ آپ ہی کے دامن عاطفت اور فیضان محبت کا پروردہ ہوں۔ آپ کا کوئی کام ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس کا انجام میرے حق میں بُرا ہو"۔ یہ کہہ کر قاسم اُٹھے اور ہاتھ باندھ کر باپ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

سلیم، "بیٹا! مجھ سے بڑی بیوقوفی ہوئی۔ گو دوسروں سے کم عقل نہیں رہا لیکن ایک طرح ان سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوا۔ یہ لوگ بادشاہوں کو نیک صلاح نہیں دیتے۔ چاپلوسی اور خوشامد سے خوش کرنا چاہتے ہیں۔ گو نذر میں جو کشتیاں پیش کرتے ہیں، ان پر زری دمقیش کے خوان پوش ڈھک دیتے ہیں۔ مگر ان کے نیچے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا اور زبان سے وہ باتیں نکلیں، جو نہ نکلتیں، تو بہتر ہوتا۔ آج مجلس میں اس وقوعہ قتل کے متعلق میری تقریر امیرالمومنین کو ناگوار گذری۔ صلاح جو کچھ میں نے دی، اس کو وہ اچھی طرح سمجھ گئے اور اُسے منظور بھی کرلیا لیکن دل میں بُرا مان گئے اور بجائے انعام کے مجھے ایک طور پر سزا دی۔ وہ سزا یہ دی کہ میرا نور بصر مجھ سے جدا ہوجائے"۔ اتنا کہہ کر ان بوڑھے واجب التعظیم سلیم نے عبا کے دامن سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا اور اس طرح کچھ دیر تک غم میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہے۔ جب طبیعت کو کچھ سکون ہوا، تو کُل قصہ کہ حشیشیوں کے راز اور عقائد معلوم کرنے کا مشورہ کس بنا پر امیرالمومنین کو دیا تھا۔ ازاول تاآخر بیان کیا اور جس طرح اس مشورے کے سننے پر امیرالمومنین نے قاسم کو اس خدمت پر مامور کیا۔ اس کا بھی سارا حال سنایا۔

جس وقت سلیم بن طاہر بیٹے سے یہ گفتگو شروع کرنے کو ہوئے تھے۔ تو دروازے کا پردہ ہلا تھا۔ سلیم نے فوراً پردہ کی طرف شبہ کی نظر سے دیکھا لیکن باہر ہوا کی سرسراہٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، سمجھے کہ ہوا کے جھونکے سے پردہ ہلا ہوگا۔

اب قاسم نے باپ سے کہا "بابا جان مجھ کو ایسی خدمت سے کیوں انکار ہو۔ یہ تو میرے لئے ایک عجیب لطف کی خدمت ہوگی اور اس وجہ سے اور بھی کہ آپ کی تحریک سے یہ امر پیش آیا ہے۔ آپ کیوں اس کو میرے حق میں مضر سمجھتے ہیں"۔

سلیم نے افسوس اور صدمے کے ساتھ گردن ہلائی، اور کہنے لگے۔ "جان بابا! دیکھو خداوند

کریم نے اپنی ہر مخلوق کے لئے ایک کام مخصوص کر دیا ہے۔ شیر کا کام درندگی ہے۔ پشہ کا کام نیش زنی۔ گھوڑے کا کام سوار کو تیز رفتاری سے منزل تک پہنچانا۔ یہی بات انسان کے ساتھ رکھی ہے۔ دنیا میں مختلف قومیں بستی ہیں۔ بدوی عربوں کا شیوہ لوٹ مار ہے۔ مصریوں کا شغل علوم کا فراہم کرنا۔ فرنگیوں کا کام ہر وقت سر میں ایک سودا رکھنا۔ حبشیوں کا مقسوم غلامی ہے۔ تُرک حکومت کرنے کے لئے اور ایرانی حُسنِ صنعت میں کمالی دکھانے کو پیدا ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ترک اور ایرانی نسل سے ہو۔ زندگانی کا سرور اور حیات کی لذت اگر ہے تو اسی نسل اور خون میں ہے۔ پس خدا کا شکر کرو کہ تم قلم اور سیف دونوں کے مالک ہو۔ تم مرد میدان ہو، جاسوس نہیں ہو مگر حشیشیوں کے حالات ایسے ہیں کہ دین کی حفاظت کے لئے ان سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ جاسوسی دوسروں کا کام ہونا چاہیئے، کسی حال میں تمہارا فرض نہیں ہے۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ اس گروہ کے متعلق تحقیق و تفتیش قلعہ اَلموت سے شروع کرنا جو حشیشیوں کی قوت اور طاقت کا مرکز ہے۔ ہر طرح سے خلاف مصلحت ہے''۔ جب سلیم اپنی تقریر میں اس جملے تک پہنچے، تو پردے کو پھر پہلی سی حرکت ہوئی۔ مگر سلیم بات کہنے میں ایسے مصروف تھے کہ ادھر خیال تک نہ کیا۔ پھر کہنے لگے'' یہ تحقیق متن سے نہیں۔ حاشیہ سے شروع ہونی چاہیئے تھی۔ بہر کیف حضرت اقدس ظلِ سبحانی کا حکم یہی ہے کہ قلعہ اَلموت پہنچ کر تحقیقات شروع کرو۔ یہی ان کے الفاظ ہیں، اور ان کا بجالانا ہمارا عین فرض ہے۔ تمہارے اس سفر کے متعلق مناسب یہ ہے کہ اس شہر سے ایسے پوشیدہ طریقے پر نکلو کہ کسی کو خبر تک نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی سفر کی وجہ پوچھے۔ تو کوئی معقول وجہ تمہارے ذہن میں موجود رہے۔ اسی خیال سے میں چند گٹھڑیاں قالینوں کی جو معمولی قیمت کے ہوں گے۔ دو اونٹوں پر بار کرا کے تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ یہ سامان شہر سے باہر نکلتے ہی تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ اگر کوئی پوچھے۔ تو کہہ دینا کہ اصفہان کا ایک سوداگر ہوں۔ قالین فروخت کرنے نکلا ہوں''۔

سفر کا بندوبست ایسے طریقہ پر کیا گیا، خجستہ خاتون نے جب سُنا کہ بھائی پھر کہیں دور جانے کو ہیں۔ تو ان کو بہت ہی صدمہ ہوا لیکن صورت سے رنج ظاہر نہ ہونے دیا اور یہی کہتی رہیں کہ بھائی اب کے جب خیر سے واپس آؤ گے۔ تو تمہارے ساتھ ایسا چوگان کھیلوں گی کہ تم بھی مان جاؤ گے۔ پھر یہ نہ ہوگا کہ آپ گھوڑے پر سوار ہوں گے اور میں پیدل ہوں گی۔ جب تک تو گھوڑے کی سواری مجھے خوب آ جائے گی۔ گیند خوب پٹے گی۔ کبھی تمہاری طرف آئے گی، کبھی میری طرف اور آخر میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو نہ ہرایا ہو، تو بات نہیں'' لیکن خجستہ خاتون جب بھائی سے رخصت

ہو کر اپنے کمرے میں آئیں، تو بھائی کی جدائی پر خوب روئیں۔

قاسم کو رخصت کرنے سے پہلے سلیم نے چند نصیحتیں کیں اور کہا ''بیٹا! دیکھو ہر صحبت میں کم سخن اور ہوشیار رہنا۔ متانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تم سے یہ کہنا کہ ہمت و مردانگی میں کمی نہ کرنا فضول ہوگا کیونکہ یہ دونوں چیزیں تمہاری فطرت میں داخل ہیں۔ ان کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن مردانگی اور شجاعت کے بھی اصول ہیں۔ انسان کو اپنی پوری طاقت ایک ہی مرتبہ نہ صرف کردینی چاہئے۔ صبر و تحمل سے کام لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ گو صبر و تحمل کی راہیں پیچیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر وہ غاروں اور خطرناک موقعوں سے بچ کر نکلی ہیں۔ ہر کس و ناکس کے ساتھ اخلاق و کسر نفسی سے پیش آنا کیونکہ یہ چیزیں اہل تجارت کی کامیابی کا سب سے بڑا گر ہیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ کبھی کبھی کدڑیوں میں لعل بھی چھپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اونے اور ذلیل لوگوں سے بھی بعض وقت بڑی بڑی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ شجاعت اور تحمل کے سوا جو شرافت کے جوہر ہیں، باقی تمام باتیں عالی نسبی کی دل سے بھلا دینا۔ کیسی ہی صحبت میں بیٹھو، اپنا دین نہ چھوڑنا اور نماز روزے میں کبھی فرق نہ آئے۔ جو شخص سفر و حضر میں چاہے، بازار کا ہنگامہ ہو، یا شادی کا گھر، نماز سے غافل نہیں ہوتا، وہ نیک نفس اور پاک باطن ہو جاتا ہے اور لوگ اس کو اپنا معتمد بنانے میں تامل نہیں کرتے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر بھروسہ رکھو۔ کیونکہ یہی چیز ہر بلا اور آفت میں سپر کا کام دے گی۔ مگر اس کے ساتھ اپنا جو کام ہو۔ وہ محنت اور شوق سے کرو کیونکہ ہوا کا چلانے والا خدا ہے لیکن بادبان کا لگانا ملاح کا کام ہے۔ تمہارے دشمن اور بدخواہ دھوکا دے کر تم سے قسمیں لے لیں گے۔ ایسی قسموں کے پابند رہنا لیکن جب دیکھو کہ ان کی پابندی راستے سے ہٹاتی ہے۔ تو ان کے توڑنے میں تامل کی ضرورت نہیں کیونکہ قسمیں جو بُرے کاموں کے لئے لی جاتی ہیں۔ جب اس کا علم ہو جائے تو پابندی لازم نہیں رہتی لیکن اگر کبھی قرآنِ پاک پر قسم کھانی پڑے، تو پھر سمجھ لینا کہ چاہے جان جاتی رہے۔ مگر قسم نہ ٹوٹے۔ یاد رکھو کہ راستبازی ہر حال میں بہترین شیوہ ہے اور دغا دینے والے اس لائق ہیں کہ ان کو بھی ایک دن دغا اٹھانی پڑے۔ مگر جو راستی فتنہ انگیز ہو۔ اس سے دروغ مصلحت آمیز بہتر ہے۔ جو کام تمہارے ذمہ ہوا ہے۔ وہ نہایت مشکل اور خطرناک ہے۔ صاحب اَلموت یعنی شیخ الجبل کے معتقد بڑے دیندار نظر آئیں گے۔ مگر ان کی دینداری ایک پردہ ہے۔ جس کی آڑ میں وہ قتل و غارت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سچی دینداری اور قتل و غارت کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے اُن کا حال معلوم کر لیا۔ تو پھر ایسے گروہ کے معدوم کرنے میں جسے خدا اس دنیا سے غارت کرے۔ تم بھی شریک غالب ہو جاؤ گے۔ ماسوا اس کے اگر حاکم قزوین کے قاتل کا

تم نے سراغ لگالیا۔تو تم ایک بڑے عدل وانصاف کے کام میں مددگار ثابت ہو گے۔اچھا بیٹا! اب جاؤ۔تمہیں خدا کے سپرد کیا۔تمہارا گھوڑا اور ملازم دروازے پر حاضر ہے۔اسباب کے اونٹ اور ساربان شہر کے باہر مل جائیں گے''۔

سلیم نے بیٹے کو پیار کیا اور بڑی دیر تک اُسے گلے سے لگائے کوئی دعا پڑھتے رہے۔اس اثنا میں ایک آدمی صحن میں سے ہوتا ہوا دروازے کے باہر نکل گیا۔قاسم اور سلیم نے اسے مطلق نہ دیکھا۔یہ ایک دُبلا، پتلا، منہ خشک، بال پریشان آنکھیں وحشت زدہ کمبل کا کُرتہ پہنے کوئی فقیر تھا۔ سلیم نے جب دعا ختم کر کے بیٹے پر دَم کر دی۔تو دونوں جدا ہوئے۔قاسم گھوڑے پر سوار ہوئے۔ تھوڑی دیر میں اس سڑک پر جو شہر کو جاتی تھی۔ایک لمبی دردناک آواز سنائی دی۔''بابا۔راہِ خدا میں دیتا جا''۔قاسم آواز سنتے ہوئے شہر سے نکل کر اس حصے میں پہنچے۔جہاں بڑے بڑے امراء دولت رہتے تھے۔سڑک کے دوطرفہ عالی شان مکانات اور باغات تھے۔یہاں سے گذر کر وہ بالکل آبادی کے باہر آ گئے۔

سلیم بن طاہر بیٹے کو رخصت کر کے گھر میں آئے۔دل کو اس طرح تسکین دینے لگے کہ'' تو اب بڈھا ہوا۔وہ ہمت وشجاعت جو کبھی رکھتا تھا۔اب کہاں باقی ہے۔بہتر ہے کہ یہی چیزیں اب میں قاسم میں دیکھوں۔جو کام اس کے سپرد ہوا ہے۔اس میں جوانمردی، جسارت اور ہوشیاری بہت درکار ہے۔خدا ایسا کرے کہ وہ میرا نام رکھ لے''۔باوجود اس خیال کے دل پر جوغم کی گھٹا چھا گئی تھی۔وہ کسی طرح دُور نہ ہوئی۔

بچّو! یہاں تک اس قصّے سے تمہیں یہ معلوم ہوا ہوگا کہ تمہارے دادا کی والدہ خجستہ خاتون نے جس گھر میں پرورش پائی تھی۔وہ کیسا تھا اور قاسم جو تمہارے دادا کے ماموں تھے۔گو اس وقت نوعمر تھے۔کیسے صاحب ہمت اور عالی حوصلہ تھے اور کس طرح وہ اپنے باپ کا ادب اور لحاظ کرتے تھے اور کیسے باخدا اور پکے مسلمان تھے، جو باتیں اب پُرانی ہوگئی ہیں۔وہی سب سے بہتر تھیں اور خدا کرے کہ آج کل کے لڑکے بھی ایسے ہی اُٹھیں جیسے سلیم بن طاہر نے اپنے بچوں کو اُٹھایا تھا۔

چوتھا باب

قاسم کے ہمراہیوں میں ایک خدمت گار اور دو ساربان تھے۔ تیسرے پہر تک یہ لوگ بغداد کے سرسبز مضافات میں سے گذرتے رہے۔ کھیتیاں پک چلی تھیں۔ باغوں میں درخت پھلوں کے بوجھ سے جھکے پڑے تھے۔ گھاس میں کہیں جھینگر زفیل دے رہے تھے۔ کنوؤں پر رہٹ کے چلنے کی آواز، درختوں پر پرندوں کی بولیاں سب مل جُل کر کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ قاسم چاروں طرف دیکھتا اور خوش ہوتا۔ دل میں آہنگیں اُٹھ کر طرح طرح کی امیدیں بندھنے لگیں اور یہ سفر بہت لطف کے ساتھ طے ہونے لگا۔ گرمی کا موسم تھا۔ دھوپ میں چلنا دشوار تھا۔ اس لئے دن بھر کہیں سایہ دار درختوں کے نیچے یہ چھوٹا سا قافلہ آرام کرتا۔ جب رات آئی تو تاروں کی چھاؤں میں پھر چلنے لگتا۔ تین دن تک اسی طرح راہ چلتے رہے۔ چوتھے دن علی الصباح سمیت شمال مشرق مین نیچی نیچی پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ دوپہر تک اس سے بھی آگے نکل گئے۔ اب سامنے ایک بڑا ریگستان آیا، جو بحر ناپیدا کنار کی طرح پھیلا چلا گیا تھا۔ دجلہ کی شاداب وادیاں اور وہ زمینیں جن کو یہ دریا سیراب کرتا تھا۔ پہاڑی سلسلے کے پیچھے چھوٹ گئیں۔

بچو! اب آگے میں تم کو وہ واقعات سناؤں گا، جو قاسم بن سلیم کو اس صحرا سے قلعہ اَلموت تک پہنچنے میں پیش آئے۔ ان باتوں کو سُن کر تمہیں بے انتہا حیرت ہوگی اور تم خیال کرو گے کہ وہ سب میری من گھڑت ہیں۔ نہیں، وہ سب صحیح ہیں۔ کچھ واقعات تو ان میں ایسے ہیں، جو قاسم نے اپنے ہم سفر بہرام بن عبداللہ سے کہے تھے اور کچھ ایسے ہیں کہ ایک نصرانی عورت تھور فریدا سے سلیم بن طاہر نے آدمی بھیج کر دریافت کرائے تھے۔ یہ عورت گو مغرب کی نصرانیہ تھی۔ مگر عربی زبان سے واقف تھی۔ پس یقین کرلو جو کچھ اب میں تمہارے سامنے بیان کروں گا۔ اس کی صحت میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ جس وسیع ریگستان کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ اس میں ابھی سفر شروع ہی ہوا تھا کہ قاسم کا دل بیٹھنے لگا اور جتنی اچھی اچھی امیدیں بندھی تھیں، وہ یک لخت محو ہوگئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ اس لق ودق میدان میں نہ کوئی اس کا مددگار ہے نہ یاور بلکہ کوئی خبیث روح دشمن بن

کہ اس کے پیچھے چلی آتی ہیا وراس کی ہر نقل وحرکت کو نگاہ میں رکھے ہے اور ایسی بُری طرح پیچھے پڑی ہے کہ اس سے چھٹکا انظر نہیں آتا۔ قاسم کو معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تمام بدن کا خون خشک ہو گیا ہے اور گھوڑے پر وہ اس طرح سوار ہے کہ گویا نیند میں ہے۔ قاسم کے جری اور بہادر ہونے میں کس کو کلام تھا بلکہ یہ بہادری اور جوانمردی سلیم بن طاہر کے خاندان میں اب تک چلی آتی ہے۔ لڑائی کے میدان میں اس کا یہ حال تھا کہ اگر کہیں کسی نرغہ میں پھنس گیا ہے اور چاروں طرف دشمن کی تلواریں چمکنے لگی ہیں، تو ہمت ہارنی تو چیز دیگر تھی وہ اور بھی زیادہ بہادری اور حوصلہ سے کام لے کر لڑا ہے لیکن اس وقت جو حالت اپنی دیکھتا تھا۔ وہ خود اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کئی دفعہ بدن میں چٹکیاں لیں، یہ دیکھنے کو کہ کہیں سوتا تو نہیں ہوں۔ کبھی گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا کہ کہیں نوکر تو اکیلا چھوڑ کر نہیں چلے گئے۔ جب دیکھ لیتا کہ ساربان اور خدمتگار پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ تو سمجھتا تھا، تنہا نہیں ہوں۔ ان لوگوں کی صورتوں پر بھی وحشت اور پریشانی برس رہی تھی۔ آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ قاسم نے کچھ دیر اِن کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا اور اسی حالت میں راہ طے کرتا رہا، لیکن پھر تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہونے لگا کہ سب اس کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ اس بیابان میں تن تنہا رہ گیا ہے۔

سورج ڈھل کر ڈوبنے کو ہوا۔ ریت کے ٹیلوں پر شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔ قاسم نے قیام کا حکم دیا۔ نوکروں نے اونٹوں پر سے پانی کے مشکیزے اور خریطے اتارے۔ خریطوں میں سے خشک کھجوریں اور پنیر نکال کر کھا رہے تھے کہ یکا یک قاسم نے ایک اڑتی سی آواز اذان کی سُنی۔ حیرت سے دنگ رہ گیا کیونکہ اس صحرائے لق ودق میں نہ کسی قافلہ کا نشان تھا۔ نہ کسی شہر اور آدمی کا، مسجد اور خانقاہ کا تو کیا ذکر ہے۔ قاسم کے نوکروں نے جب اذان کی آواز سُنی تو وہ ڈر کے مارے منہ کے بل زمین پر دراز ہو گئے۔ کچھ دیر تک خوف کی وجہ سے سب کی بُری حالت رہی۔ پھر اندھیرا بڑھنے لگا۔ قاسم اور اس کے نوکر اپنے اپنے بستروں پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بستر پر پڑے پڑے قاسم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ تارے خوب چمک رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہُو کا عالم تھا۔ مگر اس فضا کا اثر قاسم پر اُلٹا ہوا۔ تصور بندھا کہ یہ صحرا ایک زنداں ہے، اور اس زنداں میں وہ ایک ایسا قیدی ہے۔ جس کی رہائی کی امید نہیں اور آسمان کے یہ چمکتے تارے اس پر پہرا دے رہے ہیں کہ کہیں یہ اسیر بھاگ نہ جائے۔ قاسم بہت دیر تک جاگتا اور دن میں جو کیفیتیں دل پر گذری تھیں۔ ان کو یاد کرتا رہا لیکن جب زیادہ رات ہوئی، تو سو گیا۔

جب آنکھ کھلی، تو ابھی اندھیرا تھا۔ صبح کا ستارہ طلوع ہو چکا تھا اور ستارے جھلملا کر اپنی

روشنیاں گل کرنے کو تھے۔ صبح کے ستارے کی چمک میں قاسم کو دَمِ خنجر کی سی آبداری معلوم ہوتی تھی۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف اس کا خدمت گار اور بائیں طرف دونوں ساربان غافل سو رہے تھے۔ دونوں اونٹ اور دونوں گھوڑے کچھ دور گردنیں جھکائے اِدھر اُدھر ریت کو سونگھتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ ہائے یہ گھاس نہ ہوئی۔ قاسم کی طبیعت پھر بے چین و بیقرار ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ رات کے اندھیرے میں کسی غیر کا گذر اس کے قریب ضرور ہوا ہے۔ جب کچھ اُجالا ہوا۔ تو اپنے سرہانے کوئی چھوٹی سی چیز ریت میں گڑی ہوئی دیکھی۔ سمجھا کہ شاید صلیب ہے۔ جو کسی عیسائی نے نشان کے طور پر یہاں نصب کی ہے۔ اُٹھ کر اس کو ریت سے اکھاڑا۔ دیکھا تو خنجر تھا۔ قبضہ اس کا سپید رنگ کا ہے۔ مگر قبضے اور مشت پناہ کے لٹو سرخ رنگ کے ہیں۔ پھل پر ایک جگہ خون لگا ہے۔ قاسم یہ دیکھ کر خوف سے پسینے پسینے ہو گیا۔ اتنے میں نوکر بھی جاگ اُٹھے۔ قاسم کو خیال ہوا کہ اگر نوکروں نے کہیں اس خنجر کو دیکھ لیا۔ تو ان کا دم ہی نکل جائے گا۔ فوراً اس کو اپنی پیٹی میں چھپا لیا۔ نوکروں کو آواز دی اور فریضہ فجر ادا کرنے کھڑا ہو گیا۔ صبح کی روشنی اب خاصی پھیل چلی تھی۔ نوکر سفر کی تیاری کرنے لگے۔ قاسم نے ریت پر قدموں کے نشان ڈھونڈے۔ مگر انسان کے قدم کا کہیں نشان نہ ملا۔ نوکروں کے چہروں پر بھی زندگی سے مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر کوچ کا حکم دیا اور یہ مختصر قافلہ پھر اُسی صحرائے وحشت اثر میں چلنے لگا۔ نہ یہ خبر تھی کہ کدھر جا رہے ہیں اور نہ یہ معلوم تھا کہ کدھر جانا ہے۔ چند گھنٹے چلنے کے بعد ایک بڑی سیاہ چٹان نظر آئی۔ اس کی چوٹی شمال کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے اُدھر تھوڑی دور تک اس کا سایہ زمین پر پڑتا تھا۔ یہ سایہ دیکھ کر دوپہر میں گرمی سے پناہ لینے اور کھانے پینے کے لئے یہ لوگ وہاں اُتر پڑے۔ خریطوں سے خشک مچھلیاں اور کھجوریں نکال کر کھائیں اور مشکیزوں سے پانی پی کر آرام کرنے بیٹھ گئے۔ قاسم پانی لے کر چٹان کے دوسری طرف جہاں اس کا گھوڑا تھا، گیا۔ گھوڑے کو پانی پلا کر واپس آیا تو دیکھا کہ تینوں نوکر مل کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ قاسم کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور قریب آ کر سب نے ایک دفعہ ہی کہنا شروع کیا کہ "حضور اب ہم آگے نہیں جائیں گے۔ ہم کو تو اس صحرا میں اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ اس بیابان میں خدا جانے کہاں کہاں کی بلائیں بھری ہیں۔ ہم اب قطعی ہمت ہار چکے ہیں"۔ قاسم کو اس سرکشی پر بہت غصہ آیا۔ بے اختیار ہاتھ تلوار کے قبضے پر پہنچا۔ مگر فوراً اپنی خوف کی حالت یاد آئی اور رُک کر سوچنے لگا کہ جب خوف و ہراس سے خود میرا یہ حال ہے تو ان غریبوں کو تو نہ شرافت کا دعویٰ ہے اور نہ اس بات کی عزت حاصل ہے کہ خلافت پناہ کی جناب سے اس سفر کا کوئی فرمان ملا ہو۔ پھر کیا وجہ کہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالیں اور آگے چلنے

سے انکار نہ کریں۔ پھر بھی قاسم نے ان سب کو ڈانٹا اور سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ نوکروں نے کہا۔ ''چلنے کو ہم تیار ہیں لیکن آگے نہیں پیچھے بغداد کی طرف سفر کی تیاری کریں گے۔'' اور یہ کہہ کر وہ بھی اپنی اپنی کمر سے چھریاں نکالتے ہوئے چٹان کی دوسری طرف جہاں اونٹ اور گھوڑے بندھے تھے چلے۔ قاسم کو اب ایسا طیش آیا کہ تلوار برہنہ کر کے ان کی طرف لپکا۔ یہ دیکھ کر نوکر خوف سے بھاگے اور تھوڑی دور بھاگ کر ریت پر اوندھے منہ سے اس طرح گر پڑے۔ گویا اب جینے کی بالکل آس نہیں رہی ہے۔ جب قاسم تلوار ہاتھ میں لئے چٹان کی دوسری طرف جدھر یہ نوکر گئے تھے، پہنچا تو ایک عجیب کیفیت نظر آئی۔ ریت کا میدان چاروں طرف دھوپ میں چمک رہا تھا۔ تھوڑی دور زمین سے کچھ اوپر کو ایک غبار میں کسی بڑے شہر کی عالی شان عمارتیں مسجد کے اونچے مینار اور گنبد نظر آئے۔ قاسم سمجھا کہ غالباً یہ باغ ارم ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب آدمی مرنے کو ہوتا ہے تو نظر آیا کرتا ہے۔ اب قاسم بھی سمجھے کہ ان کی موت قریب ہے۔ پھر دفعتہً خیال آیا کہ باغ ارم تو ملک عرب میں عدن کے قریب ہے اور یہ مقام وہاں سے صدہا میل کا فاصلہ رکھتا ہے۔ پس ہو نہ ہو یہ صحرا کا ایک سراب نگاہ کا محض ایک دھوکا ہوتا ہے۔ اپنی غلط فہمی پر کچھ ہنسی آئی۔ مگر یہ ہنسی فوراً ہی حیرت سے بدل گئی۔ دیکھا کہ اُسی شہر کے دروازے سے جس کی عالی شان عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک گروہ مسلح سپاہیوں کا اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تیزی سے ان کی طرف آ رہا ہے اور چیخوں کا ایک ہولناک شور ہے، جو کانوں کے پار ہوا جاتا ہے اور اب یہ دیکھا کہ اسی گروہ میں سے ایک شتر سوار برچھا ہاتھ میں تولے آندھی کی طرح اس کی طرف آ رہا ہے۔ قاسم نے کہا، اچھا یہی وہ موذی ہے۔ جو اس سفر میں شروع ہی سے میری جان کے پیچھے پڑا ہے۔ یہ یقیناً ابلیس ہے اور اب خاتمہ قریب ہے۔ اس کے ساتھ یہ قصد ہوا کہ اگر واقعی یہ ابلیس ہے اور موت بھی قریب ہے۔ تو پھر جواں مردوں کی طرح لڑ کر جان کیوں نہ دوں۔ اتنا سوچتے ہی تلوار سونت، ایک وار کرنے کو آگے جھپٹا کہ شتر سوار کا اونٹ دفعتہً رکا اور سوار نے ہاتھ اٹھا کر کہا ''اسلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ اے اسپ سوار اگر تو عزرائیل نہیں ہے۔ تو خدا کے واسطے مجھے موت سے بچالے اور گر عزرائیل ہے تو جلد اس زندگی پر عذاب سے میری گلوخلاصی کر''۔ اس آواز کے آتے ہی وہ بڑا شہر، اس کا دروازہ اور فوج جو اس میں سے نکل رہی تھی سب غائب ہو گئے اور قاسم کو اپنے سامنے ایک پستہ قد آدمی سر اور منہ کو سپید اور کالی دھاریوں کی چادر میں لپیٹے اونٹنی پر سوار نظر آیا۔ اتنا دیکھتے ہی اونٹنی دفعتہً زمین پر گری اور اس کا سوار بھی لڑھک کر نیچے آ رہا۔ اونٹنی ایک دفعہ ہی زور سے بلبلائی اور تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔

پانچواں باب

بچو! بہرام بن عبداللہ قندھاری کا نام تم نے مجھ سے پہلے بھی سنا ہوگا۔ یہ قندھار کا مشہور قوال کچھ عجیب وغریب آدمی تھا۔ شاعری اور کیمیا گری میں بھی استادی کا دعویٰ رکھتا تھا۔ شروع میں اس کے اعمال ناگفتہ بہ تھے لیکن شکر ہے کہ آخری عمر میں وہ بہت پارسا ہو گیا تھا۔ اللہ تعالےٰ اس کی آخری نیکیوں پر نظر فرما کر اس کی مغفرت کرے۔

بہرام اس وقت ایران سے آ رہا تھا۔ پہاڑوں میں رستہ بھول کر اس صحرائے لق ودق میں آ نکلا۔ کئی دن سے سرگرداں پڑا پھرتا تھا۔ مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ خوراک اور پانی جس قدر ساتھ تھا، وہ ختم ہو چکا تھا اور اب کئی دن سے وہ اور اس کی اونٹنی دونوں بھوک اور پیاس سے نیم جاں ہو رہے تھے۔ جب راستہ ملنے کی طرف سے قطعی مایوسی ہوگئی تو بہرام نے خوب چیخ چیخ کر گانا یا یہ کہیے کہ غل مچانا شروع کیا۔ اشعار جو وہ اپنی دانست میں گا رہا تھا۔ ان کا مضمون کچھ ایسا تھا۔ ''وائے بر حال ما۔ قندھار کے اس مطرب خوش نوا کے رشتۂ حیات کو مقراض تقدیر نے کیسا قبل از وقت کاٹ دیا۔ افسوس گلزار موسیقی کے پھول بے وقت مُرجھا گئے۔ مگر کیا مضائقہ ہے۔ سپر حکومت رنج والم کے تیروں کو بیکار ثابت کر دے گی۔ بس اے بہرام گم گشتہ موت کا دلیری سے مقابلہ کر اور اس جادۂ اجل میں ایک ایسا مرثیہ سناتا چل کہ چرخ کج رفتار کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے اور ہم بیکسوں کو تسکین ہو''۔ بہرام یہی نوحہ پڑھتا ہوا اونٹنی پر سوار جا رہا تھا کہ ایک سیاہ اونچی چٹان کے پیچھے سے تین آدمی نکل کر چیخیں مارتے بھاگتے ہوئے نظر آئے اور جونہی سامنے پہنچے۔ فوراً زمین پر اوندھے منہ گر پڑے۔ اس کے بعد دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار، غصہ سے منہ سُرخ، ہاتھ میں ننگی تلوار لئے سامنے کھڑا ہے۔ بہرام سمجھا کہ ملک الموت روح قبض کرنے کے لیے اس کے انتظار میں کھڑے ہیں اور اب اپنا دم واپسیں ہے۔

بہرام نے زمین سے اُٹھ کر مُردہ اونٹنی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ پونچھ کر کہنے لگا۔ ''زلیخا! پیاری زلیخا تجھے خدا کو سونپا۔ تیرے لیے تو کیا روؤں۔ تُو تو آرام سے ہو

گئی۔ رونا تو اپنی قسمت کا ہے کہ آج کیسے وفادار خادم سے جدائی ہوگئی''۔

قاسم نے بہت ہی متانت سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آپ میری طرح انسان نکلے۔ میں اب تک آپ کو ابلیس سمجھ رہا تھا۔ مگر کچھ اپنی تعریف تو کیجئے کہ آپ ہیں کون؟ اور یہ شور وغوغا جو ابھی میں سنتا تھا، کیا تھا؟'' بہرام نے یہ فقرہ سنتے ہی ایک پاؤں زور سے زمین پر مارا اور آنکھیں لال کر کے بولا۔ ''کیا خوب! اگر آپ مجھ کو ابلیس سمجھتے تھے۔ تو میں بھی آپ کو عزرائیل سمجھ رہا تھا۔ پہلے آپ فرمائیں کہ آپ کون بشر ہیں؟ جنہوں نے میری خوش نوائی کو شورِ بے ہنگام اور غوغائے نافرجام سمجھا واہ کیا قدر شناسی ہے۔ ذرا تو انصاف کیا ہوتا۔ کیا میرا نغمہ جاں گداز زمین کے جگر تک نہیں اُتر گیا؟ کیا اس کے سحر سے چشمِ فلک پر خواب طاری نہیں ہوگیا؟ کیا اُڑتے پرندے اُسے سنتے ہی پروں کی حرکت بند کر کے ہوا میں معلق نہیں رہ گئے؟ کیا یہ تینوں آدمی جو بھاگے آتے تھے۔ اس طائرِ خوش الحان کی فغاں سنتے ہی زمین پر بیہوش ہو کر نہیں گر پڑے؟ آپ پوچھتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ اب سنئے کہ میں وہ ہوں، جسے بہرام بن عبداللہ قندھاری کے نام سے پکار کر دنیا فخر کرتی ہے۔ اب بھی فہمِ عالی میں آیا، یا ابھی اور تعریف کروں''۔ اس عجیب تقریر کے بعد بہرام نے مُردہ اونٹنی کی پشت سے ایک مشکیزہ اُتارا اور منہ لگا کر دو چار گھونٹ پیئے۔ قاسم نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کیا مصیبت آپ پر پڑی تھی۔ جس نے آپ کو موت کا متمنی کر دیا تھا اور میری صورت دیکھتے ہی آپ نے اپنا کام تمام کرنے کے لیے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ یقیناً شدتِ تشنگی تو اس کا باعث نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ابھی آپ کے پاس پانی ہے۔ آپ کی اونٹنی البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے ختم ہوگئی۔ اگر آپ کو وہ ایسی ہی عزیز تھی۔ تو تھوڑا سا پانی اس بے زبان کو بھی پلا دیا ہوتا۔'' بہرام نے کہا۔ ''پانی میرے پاس کہاں ہے۔ پانی سے تو بہرام اور زلیخا کا حلق کئی دن سے تر نہیں ہوا''۔ قاسم بولا ''مگر اس مشکیزے میں تو پانی ابھی معلوم ہوتا ہے''۔

بہرام ''یہ پانی نہیں ہے۔ میری زلیخا بڑی پارسا تھی۔ بادۂ ناب سے اسے قطعی پرہیز تھا۔ اگر وہ بھی اپنے آقا کی مثل آزاد خیال اور بادہ نوش ہوتی۔ تو یہ دن کا ہے کو دیکھتی۔ مگر خیر اس میں ابھی کچھ باقی ہے اور بہرام خسیس نہیں ہے''۔ یہ کہہ کر مشکیزہ قاسم کی طرف بڑھایا۔

قاسم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''میں مسلمان ہوں۔ آج تک اس آبِ حرام کو نہیں چھوا ہے''۔

بہرام۔ ''معلوم ہوا کہ آپ عقل کے بھی دشمن ہیں''۔ یہ کہہ کر بہرام نے مشکیزہ کو منہ سے لگا کر، اسے بالکل خالی کر دیا اور کہنے لگا۔ ''توبہ توبہ عقل کا دشمن میں ہوں۔ تیرِ قضا، کوزہ پر رکھ کر چاہتا تھا کہ جانِ ناتواں کو نشانہ بناؤں مگر کمان آپ نے میرے ہاتھ سے چھین لی لیکن بہرام احسان

فراموش نہیں ہے۔ یہ احسان آپ کا ایک نہ ایک دن اُتار دے گا''۔

اب تینوں نوکر بھی ریت پر سے اُٹھ کر قاسم اور بہرام کے پاس چلے آئے۔ یہ لوگ اپنی حرکت پر اب نادم تھے۔ بہرام کئی دن کے فاقے سے تھا۔ قاسم نے حکم دیا کہ اس کے لئے کھانے کو کچھ لائیں۔ خشک مچھلیاں اور کھجوریں پیش کی گئیں۔ بہرام نے کچھ کھا کر خدا کا شکر کیا اور اب وہ قاسم کا ہم قافلہ ہو گیا۔ قاسم نے اپنے خدمت گار کا گھوڑا بہرام کو دیا اور تینوں نوکروں سے کہا کہ تمہاری سزا یہی ہے کہ باری باری سے پیدل چلو۔ بہرام کی صحبت اور اس کے لطائف وظرائف نے سب لوگوں پر اچھا اثر کیا اور جو خوف اب تک ان کے دلوں پر تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ قاسم کے ذہن سے بھی اُس غیبی اذان اور خنجر کا خیال نکل گیا۔ بہرام نے جب سوال کیا کہ آپ کون ہیں؟ اور کہاں کا قصد رکھتے ہیں۔ تو قاسم نے کہا کہ میں اصفہان کا ایک سوداگر ہوں اور قلعہ اَلموت میں قالین بیچنے جا رہا ہوں۔ اس پر بہرام بولا ''واللہ کیا بات ہے۔ میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔ میرے پاس بھی کچھ سامان ہے، جو اَلموت کے دینداروں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے سامان میں میرے ہی طبع عالی کے چند جواہر ریزے ہیں۔ جن کو صرف نقد معنی کے جوہری پرکھ سکتے ہیں۔ آپ کے سامان کی طرح وہ عامیانہ اور زائل ہونے والی چیزیں نہیں ہیں۔ وہ صنادید عجم کی یادگاروں سے بھی زیادہ مستحکم اور دیرپا ثابت ہوں گے اور حشیشیوں کے وحشیانہ جوش وخروش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کے چھینٹوں کا کام دیں گے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر ان پہاڑوں میں گم کردہ راہ ہو کر نہ بھٹکتا پھرتا۔ تو آپ کی صحبت کے لطف سے آج محروم رہتا اور کل بادِ سحر کے جھونکے اور اس بلبل خوش نوا کے جسم بے جان پر نوحہ پڑھتے ہوئے جس کی زبان سے آج دل گداز اشعار نکل رہے ہیں''۔

اس طرح کی پُرلطف باتوں کے ساتھ یہ لوگ راستہ طے کرتے رہے۔ شام کے قریب پڑاؤ کیا۔ اور روکھا سوکھا کھا کر سو رہے۔ رات کو آندھی کے ساتھ مینہ کا ایک ہلکا سا چھینٹا پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے ریت کے ذرے جو ہوا کو کثیف کیے ہوئے تھے، دب گئے۔ صبح کو مطلع بالکل صاف تھا۔ کہیں غبار کا نام نہ تھا اور اب ان کو اپنے سامنے اُفق کے قریب پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ سب دل میں خوش ہوئے کہ اس صحرائی سفر سے خدا نے نجات دی۔ دوپہر تک قافلہ پہاڑوں کے نیچے پہنچا اور وہاں سرسبز درختوں کے ایک جھنڈ میں جہاں ایک چشمہ بھی جاری تھا، اُتر پڑا جہاں صحرائے پُرخطر سے بچ سلامت نکل آنے پر سب نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ گرمی کا وقت وہیں درختوں کی چھاؤں میں گذارا۔ تیسرے پہر پھر سفر کو اُٹھے اور تھوڑی دُور چل کر پہاڑوں کے منجھ میں پہنچ کر ان کی تاریک گھاٹیوں میں داخل ہوئے۔ راستہ اب بہت تنگ ہو جاتا تھا۔ گرد و پیش کا منظر بڑا نحس

ومہیب نظر آیا۔ سروں کے اوپر پہاڑ اور چٹان بہت اونچے اور سیدھے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی ان کی چوٹیوں پر حصار اور قلعے نظر آتے تھے اور یہ لوگ اس وحشت ناک ملک میں تمام بلندیوں پر تصرف کر کے اردگرد کی زمینوں کو اپنی زد میں لے لیا ہے اور خود دشمن سے بالکل محفوظ ہیں۔

درے سے نکل کر راستہ مڑا۔ اس وقت آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ رستے کے موڑ پر پہنچتے ہی یک لخت ایک عجیب منظر ان مسافروں کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جس درے سے نکلے تھے اس کے دونوں جانب کے پہاڑی سلسلوں نے اپنا فصل زیادہ کر کے بیچ میں ایک بڑا مدور اور مسطح میدان پیدا کر دیا ہے اور دور سامنے والے پہاڑ سے ایک دریا کا دھارا چٹانوں میں ٹکریں مارتا، جوش کھاتا میدان میں اُترا ہے اور کچھ دُور بڑھ کر ایک نیچی گھاٹی میں جس کا ایک کنارا میدان والے سلسلہ کوہ کی پشت ہے، بہتا چلا گیا ہے۔ دریا کو دیکھتے ہی مسافر سمجھے کہ یہ وہی مشہور معروف رودبار ہے جسے شاہ رود کہتے ہیں۔ غرض اس میدان کو ہر طرف سے پہاڑوں اور ایک طرف سے اس دریا نے بھی گھیر رکھا تھا۔ میدان میں مسطح قطعات پر جو دور سے سیڑھیاں سے معلوم ہوتے تھے، کھیتیاں تھیں جو اس وقت پک کر تیار ہو گئی تھیں۔ کہیں کہیں چنار کے اونچے اونچے درخت، زیتون اور پھلوں کے باغ بھی نظر آتے تھے۔ میدان کے دور والے سرے پر پہاڑ ایک مقام پر مسطح اور ہموار تھا۔ اس پر شہر کے مکانات اور ان کے گرد ایک فصیل نظر آئی۔ اس شہر کی پشت پر ایک پہاڑ تھا۔ جس کی سب سے اوپر والی چوٹی برچھی کا پھل معلوم ہوتی تھی۔ اس چوٹی سے ذرا نیچے ایک سنگین قلعہ تھا اور قلعہ کی پشت پر ایک نہایت عمیق نشیب تھا۔ مگر ادھر پہاڑ کے دامن ڈھلوان ہوتے ہوئے نیچے تک گئے تھے۔ جس پر کہیں کہیں درخت تھے۔ اس گہرے نشیب سے آگے ایک بلند زنجیرہ پہاڑوں کا تھا۔ جو اس مدّور میدان کے گرد پہاڑوں کے حلقے کو پورا کر دیتا تھا۔

یہی مقام تھا جسے اَلموت یا آشیانہ عقاب کہا جاتا تھا۔ قاسم نے اس وسیع میدان اور اس کے شہر اور قلعہ کی طرف غور اور جرأت سے دیکھا اور سوچتا رہا کہ اللہ اکبر! یہی شہر اور قلعہ حشیشیوں کا دارالحکومت ہے، جو بلند پہاڑوں کے حصار میں اس طرح چھپا ہے کہ سخت سے سخت غنیم سے بھی ان کو گزند نہیں پہنچ سکتا۔ یہی قلعہ اُس ہستی پُر اسرار کا مسکن ہے۔ جسے شیخ الجبل کہتے ہیں اور یہی شیخ ایک ایسے گروہ کا سردار اور سرغنہ ہے۔ جو روئے زمین کے تمام والیان سلطنت کو قتل اور ہر نظم حکومت کو غارت کرنا چاہتا ہے اور اسی قتل وغارت گری کے لیے اس گروہ نے آپس میں نہایت سخت آئین اور قوانین مرتب کر لئے ہیں اور سختی سے ان کی پابندی کی جاتی ہے۔ اللہ الغنی یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے ایران وعراق، شام ومصر میں بڑے بڑے لوگوں کے قتل کا حکم جاری ہوتا

ہے۔ برسوں سے یہی حال ہے۔اب تو اس گروہ کی شہرت اور دہشت نہ صرف ایشیا میں بلکہ یورپ کے دُور دراز ملکوں میں بھی پھیل گئی ہے۔

اس میدان میں داخل ہونے کا مقام ایک قلعہ کا دروازہ معلوم ہوتا تھا یعنی وہ ایک تنگ راستہ دوطرفہ اونچے پہاڑوں کے بیچ میں تھا۔ دائیں ہاتھ کو دریا کا پُل تھا۔ یہ دریا میدان سے اُتر کر یہاں ایک بہت ہی تنگ وتاریک گہری گھاٹی میں بہتا ہوا نکلا تھا اور اس گھاٹی کے کنارے کنارے ایک راستہ تھا۔ یہی راستہ اَلموت پہنچنے کا شارع عام تھا۔ یہ گھاٹی اُس درے سے جا ملتی تھی، جس سے نکل کر قاسم اور اس کے ساتھی میدان کے دروازے پر پہنچے تھے۔ اس کے سوا اور کوئی راہ حشیشیوں کے شہر تک پہنچنے کی نہ تھی۔ غرض میدان اور شہر کے گرد ایک قدرتی حصار ایسا تھا کہ زبردست سے زبردست فوج کشوں کا مقابلہ بھی اس کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔

قاسم کے نوکر اور بہرام کھیتیاں اور آبادی دیکھتے ہی خوشی کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مگر قاسم کے دل پر تاریک اور عمیق گھاٹی میں دریا اور پہاڑوں کے سنگین حصار کو دیکھ کر ایک خوف طاری ہو گیا۔ جب یہ لوگ آگے بڑھے۔ تو ان کو اور لوگ بھی دوسرے راستے سے آتے ملے۔ یہ سب کھیتوں میں کام کرنے کے لیے شہر سے صبح کو نکلے تھے۔ اب شام ہوتے ہی گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ غرض سب ساتھ ساتھ شہر کے دروازے پر پہنچے۔ ان میں ایک آدمی تھا۔ جو لکڑی کے سہارے چلتا تھا اور کھیت والوں سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اب وہ قاسم کے گرد آلودہ لباس کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ''اسلام علیکم! معلوم ہوتا ہے۔ آپ صحرا کی مسافت طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ خدا کا شکر کیجئے کہ بخیریت یہاں تک پہنچ گئے۔ بہت سے مسافر تو اس بیابان ہی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ الموت کی جامع مسجد میں جا کر سجدۂ شکر بجا لائیے۔ یہ شہر بڑے امن و عافیت کا مقام ہے۔ مگر ہاں آپ سے یہ کہنا فضول ہو گا۔ آپ تو یہاں پہلے بھی آئے ہوں گے''۔

قاسم نے جواب دیا ''نہیں۔ مجھے اس سرزمین پر قدم رکھنے کی عزت پہلی ہی مرتبہ حاصل ہوئی ہے۔ تجارت پیشہ آدمی ہوں۔ اصفہان سے قالین لے کر آیا ہوں۔ اس لالچ سے کہ کچھ فائدہ ہو جائے گا۔ اس لق ودق صحرا کو عبور کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ یہاں......'' اس آدمی نے قاسم کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یقیناً آپ کو یہاں بہت فائدہ ہو گا۔ کیونکہ خدا کے فضل سے اس شہر میں دولت کی کمی نہیں ہے۔ ہمارا شیخ معظم بڑا نیک اور مہربان ہے، وہ سامنے دیکھو! سب سے اونچے پہاڑ پر اس کا قلعہ اَلموت ہے۔ اس کی سنگین اور مضبوط دیواروں کو کوئی دشمن

نہیں گرا سکتا۔ اس قلعہ میں سات زبردست مورچے ہیں۔ بڑے بڑے غنیم کی بھی مجال نہیں کہ اس پر قبضہ کر سکے"۔ آخری جملہ بہت ہی پُر معنی انداز میں کہا اور قاسم کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

اس کے بعد اس شخص نے قاسم کی طرف سے اس طرح منہ موڑا۔ جیسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا اور فوراً اور لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ قاسم چڑھائی کا راستہ طے کر کے شہر کے دروازے پر پہنچا یہ خیال تھا کہ یہاں کچھ روک ٹوک ہوگی۔ مگر پہرے والوں نے سوائے اس کے کہ نوواردوں کی صورت غور سے دیکھ لی اور کسی طرح مزاحمت نہ کی یہ لوگ شہر میں داخل ہو گئے۔ بازاروں میں قاسم کو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی۔ دکانیں وغیرہ ایسی ہی تھیں جیسے اور شہروں میں ہوتی ہیں۔ مگر باشندے یہاں کے بہت متین اور خاموش اور پابند صوم وصلوٰۃ نظر آئے۔ قاسم کو یہ بات دیکھ کر حیرت سی ہوئی مگر دل میں سمجھ گیا کہ عجب نہیں یہ سب تصنع ہو۔ اب بہرام قندھاری نے قاسم سے پوچھا۔ "آپ کہاں قیام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔ قاسم نے جواب دیا۔ "مسافر کا گھر سرائے"۔

ایک راہ گیر سے رستہ پوچھ کر سرائے میں پہنچے۔ اس سرائے میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ عام دستور کے مطابق صحن کے چاروں طرف مسافروں کے ٹھہرنے اور ان کے جانوروں کے باندھنے کے لیے مکان اور سائبان بنے ہوئے تھے۔ بہرام بولا۔ "یہ جگہ تو بڑی غلیظ ہے۔ نوکر رہیں یا جانور باندھے جائیں۔ بھلے مانسوں کی جگہ نہیں ہے۔ میں تو اپنے ایک دوست کے مکان پر قیام کروں گا۔ جو یہاں ایک بڑا مشہور طبیب ہے اور غزنی کی سکونت ترک کر کے یہاں آباد ہوا ہے۔ عقل سے بہرہ نہ تھا۔ غزنی میں آپ کو یہ شکایت پیدا ہوئی تھی کہ وہاں کے بادشاہ پابند شرع نہیں ہے۔ اس لیے اس کی حکومت میں رہنا درست نہیں۔ اسی بنا پر غزنی کو چھوڑ کر الموت آ کر آباد ہو گئے کیونکہ یہاں کے آدمیوں کو وہ بڑا خدا رسیدہ اور پرہیز گار سمجھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ تم بھی اس سرائے میں قیام کرو۔

قاسم اس کا ہرگز روادار نہ تھا کہ ایک غیر شخص پر اپنی مہمانداری کا بوجھ ڈالے۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر میں وہاں گیا اور نوکر یہاں رہے تو کہیں آپس میں مشورہ کر کے سرکشی پر کمر نہ باندھ لیں لیکن بہرام نے سخت اصرار کیا کہ نہیں نوکروں کو یہاں چھوڑو، اور اُسی طبیب کے گھر چل کر قیام کرو۔ قاسم مجبور ہوا۔ اپنی سب قیمتی چیزیں ایک صندوق میں مع اُس خنجر کے جو صحرا میں ملا تھا، بند کیں۔ نوکروں کو خرچ کے لئے کچھ روپیہ دیا، اور سامان ان کے سپرد کر کے خود بہرام کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ سرائے سے نکل کر طبیب کے مکان کا رستہ پوچھتے ہوئے جا رہے تھے کہ بہرام کی نگاہ ایک مکان پر پڑی۔ فوراً قاسم کا بازو کھینچ کر کہا۔ "پیاس کے مارے حلق خشک ہو رہا ہے۔ چلو اس مکان میں چلیں۔ یہ میکدہ معلوم ہوتا ہے"۔ قاسم کو ایسے مکانات سے نفرت تھی۔ اندر

جانے سے انکار کرنے لگا لیکن بہرام نے پھر بچوں کی طرح ضد کرنی شروع کی اور قاسم کو مجبور ہو کر اندر چلنا پڑا اور دیواروں سے لگے بڑے بڑے تکئے رکھے تھے۔ بہت سے آدمی تکیوں سے لگے کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان نو واردوں کو دیکھ کر ایک بڈھا آدمی جس کی ڈاڑھی بالکل سپید تھی، جو اس دُکان یا مکان کا مالک معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھا۔ بہرام نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ ''شراب لایئے اور جلد لایئے''۔ اتنا سنتے ہی سب لوگ جو وہاں بیٹھے تھے۔ تعجب کی نظر سے بہرام اور قاسم کی طرف دیکھنے لگے۔ بڈھے نے ہاتھ کے اشارے اور زبان دونوں سے کہا''۔ ہائیں ہائیں آپ کیا فرماتے ہیں یہاں وہ چیز نہیں بکتی۔ کیا مجھ غریب پر کوئی آفت ڈھانے تشریف لائے ہیں''۔ بہرام نے بگڑ کر کہا ''واہ خوب یہاں شراب نہیں بکتی، تو یہ لوگ کیا پی رہے ہیں''۔ بڈھے نے کہا۔ ''تازے میوؤں کا عرق ہے۔ شراب فروشی یہاں قطعاً ممنوع ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ شراب حرام ہے؟''

بہرام، ''رہنے بھی دیجئے۔ جس وقت شراب حرام ہوئی تھی اس وقت سے اب تک اس کی کشید میں وہ وہ تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں کہ اگر یہ بات اُس وقت ہوتی۔ تو کبھی کوئی اُسے حرام نہ قرار دیتا اور اگر ہمارے مفتی و محتسب بھی اس کا ایک گھونٹ پی لیتے۔ تو کبھی میخوار کو سزا نہ دیتے۔ ہائے ہائے تمہیں کیا معلوم ہے کہ میرا ہادی، روحانی اور رہبر زندگانی کون تھا۔ وہ نجومیوں کا بادشاہ اور شاعروں کا شہنشاہ تھا۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا کے سر سے اس کا سایہ اُٹھ گیا۔ مگر اس کے کلام معجز بیان نے اب بھی اس خاکدان مظلم کو عالم انوار بنا رکھا ہے اور ابد تک ایسا ہی منور رکھے گا۔ پھولوں کی ڈھیریاں اور گلاب کی مرجھائی ہوئی پتیاں ہمیشہ اس کی تربت کو ڈھکے رکھیں گی''۔ بہرام نے اب ایک رباعی گانی شروع کی جس کا مضمون تھا کہ 'ساقی اُٹھ۔ میرے حال پر رحم کر۔ دنیا کی چیتان کو سوچنا چھوڑ دے۔ زندگی چندروزہ ہے۔ ایک جام شراب دے۔ پھر تو میری مٹی سے ساغر بنتے ہی رہیں گے، کیوں جناب کیا سمجھے! شاعری اس کو کہتے ہیں اگر شعر و حکمت کا ذوق ہے تو عمر خیام کے کلام سے استفادہ فرمایئے''۔

اس رباعی کے مضمون اور بہرام کی خوش نوائی نے قاسم کے دل پر بہت اثر کیا اور اب یقین ہوا کہ صحرا میں اس بلبل خوش الحان کی آہ و فغان نے کیونکر اس کے اور اس کے ملازموں کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ اب ایک بڈھا ضعیف جو اس مجمع میں بیٹھا تھا۔ بہرام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ ''ہم نہایت فخر کے ساتھ ایسے شخص کی تشریف آوری کو اپنے حق میں مبارک سمجھتے ہیں۔ جس نے ہمارے بانی طریقت حضرت حسن صباح کے ہم درس اور ہم مکتب یعنی جناب عمر خیام کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا ہو۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ ہمارے محترم و محتشم حسن صباح کا یہ ہم

مکتب ملحد و گمراہ ہو گیا تھا اور اس لئے استاد نے اپنے شاگرد کو بھی ملحد و گمراہ کر دیا۔ نیکی کے راستہ سے اسے ہٹا دیا۔ ورنہ ہمارا یہ دوست کبھی شراب نہ مانگتا"۔

بہرام۔ "جہلا کی سی گفتگو نہ کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منطق کا درس بھول گئے۔ ایک منطقی اس طرح بحث کرے گا کہ "یہ مقام میکدہ ہے اور میکدہ وہ مقام ہوتا ہے۔ جہاں لوگ شراب پیتے ہیں۔ پس یہ وہ مقام ہے، جہاں لوگ شراب پیتے ہیں۔ فہم عالی میں اب بھی کچھ آیا یا نہیں؟ جناب والا! حکیم فیثا غورث، ارسطو اور افلاطون کی کونسی عقل و دانش حکمت و فلسفہ ہے جس کا یہ ناچیز ماہر نہیں۔ خاک کو کیمیائی اور مٹی کو کندن بنانا ہمیشہ اپنا کام رہا ہے اور کیمیا گری کے علاوہ آپ کو معلوم نہیں کہ میں دنیا کا ایک مشہور و معروف مطرب......" ایک نوجوان بیچ میں بول اُٹھا" اور ایک منطقی اس طرح بھی بحث کر سکتا ہے کہ آپ مطرب ہیں۔ مطرب وہ ہے۔ جو گانا جانتا ہو۔ لہٰذا آپ گانا جانتے ہیں۔ یہ دونوں نتیجے بالکل صحیح ہیں اور ان کی صحت کا اندازہ صرف اس حد تک ممکن ہے۔ جس حد تک یہ مقام میکدہ اور آپ مطرب ہیں"۔

بہرام یہ لپٹا ہوا اعتراض سُن کر آپے سے باہر ہو گیا اور بولا" کیا ایسے ہی ناشائستہ اعتراض سننے کے لئے میں نے غزنی کے محلوں اور قندھار کے باغوں اور ایران کے پُر فضا شہروں کو خیر باد کہا تھا۔ یہ وہ شہر تھا۔ جہاں عرب اور عجم کو میرے نغموں نے گونجا.........." وہ نوجوان پھر بیچ میں بول اٹھا۔" درست ہے اور بہرا بھی کر دیا تھا"۔ بہرام نے یہ بات سُنی اَن سُنی کر دی اور کہتا رہا۔" کیا ایسی ہی نامعقول باتیں سُننے کے لئے میں نے کوہ و بیابان کی خاک چھانی تھی۔ کسی اسی دن کے لئے میں پہاڑوں میں بھٹکتا پھرا تھا۔ کیا اسی یوم نحس کے لئے مجھے اپنی پیاری اونٹنی زلیخا کی موت دیکھنی پڑی تھی۔ لوگو! تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ میں بہرام پسر عبداللہ شہر قندھار کا طوطی شکر زبان ہوں۔ جس نے اپنے نغموں کی دولت شہر شہر لٹائی ہے لیکن کہیں میرا خیر مقدم اس طرح نہیں ہوا۔ جس طرح اس شہر میں ہوا۔ میرے آقائے نامدار شاہ ذی جاہ سلطان بہرام بادشاہ غزنی جو میرے ہم نام ہیں۔ مجھ پر وہ لطف و کرم رکھتے تھے کہ ابھی ان کی تعریف میں زبان سے ایک شعر بھی نہیں نکلا ہے اور انہوں نے موتیوں اور جواہرات سے میرا منہ بھر دیا۔ ذرا دیکھو۔ اتنا کہہ کر بہرام نے اپنی جیب سے مٹھی بھر کر ہیرے اور یاقوت نکال کر لوگوں کو دکھائے اور کہنے لگا۔" مگر یہ گوہر و جواہر بادشاہوں کے دئے ہوئے انعام سنگریزے ہیں۔ جب کہ ایک جرعہ شراب بھی ان سے مول کو نہ مل سکے"۔

اب پھر اسی بڈھے نے جس نے بہرام کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا تھا۔ کہا" مالک مکان کا کہنا درست تھا۔ واقعی اس شہر میں شراب کی اب سخت ممانعت ہو گئی ہے اور یہ سختی اس وقت سے ہوئی ہے۔ جب سے امام جنت آشیاں حضرت بزرگ امید کا انتقال ہوا اور ان کے فرزند کے

محمد جواس وقت امام ہیں۔صاحت حکومت ہوئے۔شراب خواری اب سخت جرم ہیاور جواس کا مرتکب ہوتا ہے۔قاضی اس کونہایت سخت سزا دیتا ہے''۔

مالک مکان نے کہا:''مگر یہ حضرت جوابھی وارد ہوئے ہیں۔ایسی گفتگو کررہے ہیں کہ ضرور محتسب کے آدمی اس گھر کا محاصرہ کرلیں گےاور میں کسی آفت میں مبتلا ہوجاؤں گا''۔

اتنا سن کر بہرام نے سخت حیرت سے کہا۔''کیا شیخ اجبل بزرگ امیداب زندہ نہیں ہیں؟''

مالک مکان نے بہت رنج کے ساتھ کہا۔''ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ بزرگ امید کی روح قفس عنصری سے آزاد ہوکر کوثر کے کنارے شراب طہور کے جام پی رہی ہے''۔

بہرام''ہائیں،یہ خبرتو آپ نے بڑی جانکاہ سنائی۔میرے دوست ایوب تو شیخ بزرگ امید کے طبیب خاص تھےاور میں اسی توقع میں یہاں آیا تھا کہ ان کے توسل سے دربار میں رسوخ پیدا کروں گا۔سچ ہے،مطرب کی زندگی مشکل مگراس کے گانے کی قیمت بےاندازہ ہوتی ہے''۔

اتنا سُن کر وہی نوجوان جس نے پہلے اعتراض کیا تھا۔پھر بیچ میں بول اُٹھا۔''گانے کی قیمت یاخاموش رہنے کی قیمت بےاندازہ ہوتی ہے''۔

بہرام بگڑ کر اُٹھنے کو ہوااور قاسم سے کہنے لگا''مجھے اب ایوب کے پاس فوراً جانا چاہیے کہ اس سے صحیح حالات کا پتا چلاؤں''۔

مالک مکان نے کہا۔''آپ ایوب سے ملاقات نہیں کرسکتے۔آج کل وہ سخت بیمار ہیں''۔

بہرام:''کیوں خیر باشد کیا ہوا ہے؟''

مالک مکان:سُنا ہے کہ ان کو کوئی مرض متعدی ہوا ہے۔ممکن ہے،طاعون ہو''۔بہرام اتنا سنتے ہی ہائے ہائے کرنے لگا۔مگر جب لوگوں کے ہنسنے کی آواز سُنی،تو اُٹھااور کہنے لگا۔''لواب میں اپنے دوست کی خبرکو جاتا ہوں۔وہاں اس کی تیمارداری کروں گا اور موت کے پنجے سے نہ چھڑالیا ہو۔تو بہرام نام نہیں۔قاسم!جب تک میں اپنے دوست کی خبر لاؤں۔تم یہیں ٹھہرے رہنا لیکن اگراتنی دیر تک واپس نہ آؤں۔جتنی دیر میں شراب کے دوقدحے ختم کئے جاسکتے ہیں۔تو پھر میراانتظار نہ کرنا بلکہ تم بھی ایوب کے گھر چلے آنا''۔قاسم ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ بہرام نظروں سے غائب ہوگیا۔

لوگ بہرام کی اس حرکت پر ہنس رہے تھے کہ اتنے میں اذان کی آواز آئی۔سب لوگ قبلہ رو ہوکر نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور جب نماز ختم ہوگئی تو بہرام کے متعلق گفتگو کرنے لگے ایک شخص نے کہا۔''یہ صاحب شاعری میں واقعی عمر خیام کو اپنا کلام دکھاتے رہے ہیں۔مگر خودستائی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔شعر جو کہتے ہیں،وہ شاعری کے لئے عار ہوتا ہےاور گانا جو گاتے ہیں،اس سے کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں''۔

ایک اور صاحب بولے، ''واہ کیا خوب طوطی شکرزبان میں آواز ملاخطہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کسی ویرانے میں اُلّو بول رہا ہے'' ۔ تیسرے صاحب فرمانے لگے۔ ''سبحان اللہ گلا کس غضب کا پایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حلق میں چمگادڑ گھس بیٹھی ہے''۔ اس پر وہ بڑھے جو سب سے پہلے بولے تھے۔ کہنے لگے ''نہیں ان کو کوئی صاحب بیوقوف نہ سمجھیں۔ وہ جواہرات آپ نے نہیں دیکھے، جو انہوں نے جیب سے نکال کر دکھائے تھے مگر اب یہاں کسی مطرب یا قوال کو نفع کی امید رکھنی عبث ہے کیونکہ شیخ وقت شرع شریف کے بہت پابند ہیں۔ کوئی بات جو خلاف شریعت ہو۔ اس کو انہوں نے اپنی قلمرو میں سخت قابل سزا قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رعایا میں بعض لوگ اُن سے بددل ہو گئے ہیں اور جو بالکل آزاد خیال ہیں، وہ تو ان پابندیوں کو ایک ظلم سمجھ رہے ہیں مگر یہ سب کچھ سہی۔ جو لوگ شیخ کے طریقے کے پابند نہیں ہیں، ان کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیا جاتا ہے''۔ یہ آخری جملہ بڈھے نے قاسم کے کان میں چپکے سے کہا۔ قاسم نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی اس تنبیہ اور ہدایت کا بہت ممنون ہوں۔ اب تو میرے دوست بہرام کو گئے ہوئے بہت عرصہ ہولیا ہے۔ لہٰذا میں بھی ایوب طبیب کے مکان پر ان کی تلاش میں جاتا ہوں''۔ مکان سے نکل کر تھوڑی دُور گیا تھا کہ پیچھے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ مُڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو جوان آدمی اس کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ صورت سے یہ دونوں شریف معلوم ہوتے تھے۔ لباس بالکل سپید تھا لیکن دستار اور کمر کے پٹکے اور پاپوش سرخ رنگ کے تھے۔ اب ان میں سے ایک جوان قاسم کے دائیں اور دوسرا بائیں طرف ہولیا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ایک گلی کے موڑ پر پہنچے جو طبیب کے مکان کو گئی تھی۔ یہاں سامنے سے ایک تیسرا نوجوان آدمی آیا اور وہ قاسم کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ قاسم نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔ ''مہربانی فرما کر راستہ چھوڑ دیجئے کہ میں نکل جاؤں''۔ اتنا کہنا تھا کہ دونوں جوانوں نے جھپٹ کر قاسم کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ قاسم نے مقابلہ فضول سمجھا اور اپنے کو ان کے حوالے کر دیا اور اب یہ لوگ تیزی کے ساتھ اس کو ایک طرف لے جانے لگے اور تھوڑی دیر میں اس پہاڑ کے نیچے جہاں سے قلعہ کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ پہنچ گئے۔ یہاں اوپر جانے کے لئے چٹانوں میں سیڑھیاں کاٹ دی گئی تھیں۔ ان سب نے اب اوپر چڑھنا شروع کیا اور کچھ دیر کے بعد ایک مسطح میدان پر پہنچے۔ جہاں قلعہ کا دروازہ تھا۔ اس کے دونوں طرف مضبوط مورچے تھے۔ یہاں پہرے والے وہی سپید اور سرخ لباس پہنے کھڑے تھے۔ غرض اس طرح قاسم بالکل خلاف توقع بہت جلد قلعہ اُلموت میں پہنچ گیا لیکن یہاں جو کچھ حالات پیش آئے۔ وہ کل بیان کروں گا کیونکہ وہ حالات بہت طویل ہیں اور اب افطار کا وقت قریب ہے۔ مغرب کی اذان ہونے کو ہے گھر چلو۔

۞ ۞ ۞

چھٹا باب

حشیشیوں کے شیخ یا امام کا حال تم نے اکثر سنا ہوگا۔ اس کا نام ایسا تھا جس کے سُنتے ہی ملکوں ملکوں لوگوں کے دلوں میں ایک ہیبت پیدا ہو جاتی تھی۔ اصل بانی حشیشیوں کے فرقے اور طریقے کا ایک شخص حسن صباح گذرا ہے۔ یہ نیشاپور میں ملک شاہ سلجوق کے وزیر نظام الملک اور مشہور شاعر و منجم عمر خیام کا ہم مکتب رہا تھا۔ جب حسن صباح اس فرقے کا سردار ہوا تو اس کا لقب شیخ الجبل ہو گیا۔ پینتیس برس تک وہ قلعہ اَلموت میں رہا۔ (اَلموت کے معنی آشیانہ عقاب کے ہیں) اس زمانہ میں اس نے بڑے ظلم وستم کئے۔ اپنے ہم مکتب نظام الملک کے قتل کی تدبیر کی اور نہ صرف اس کو بلکہ سلطان ملک شاہ کو بھی قتل کرا دیا۔ اور اپنے دو بیٹوں کا خون بھی اپنی گردن پر لیا۔ حسن صباح جب مر گیا۔ تو حشیشیوں کی سرداری ایک ہی خاندان میں متوارث ہو گئی، یعنی باپ کے بعد بیٹا جانشین ہونے لگا۔

اب زمانہ یہ ہے کہ قلعہ اَلموت میں جو قزوین کے پہاڑوں میں واقع تھا۔ حسن صباح کے جانشینوں میں سے دوسرا جانشین مستقل طور پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ قلعہ نہایت مضبوط تھا۔ اس میں سات بلند اور مستحکم برج تھے، جن میں سب سے اونچا برج قلعہ کے جنوب مغربی گوشہ پر تھا۔ اس برج کے اوپر ایک بڑا عالی شان ایوان تھا، جس کی چھت سلامی دار تھی اور اس پر سونے کی چادریں چڑھی تھیں، جو دن کو سورج کی طرح چمکتی تھیں۔ قلعہ کے نیچے شہر کے رہنے والے اس چمک کو دیکھ کر ہمیشہ اس بات کو یاد رکھتے تھے کہ قلعہ اَلموت کا شیخ اپنے ایوان میں بیٹھا ہماری ہر بات کو دیکھ رہا ہے لیکن ایوان کو اتنی بلندی پر بنانے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ خود شیخ کا شمار زندوں میں رہے اور لوگ یہ نہ سمجھیں کہ قلعہ میں بند رہ کر اس کا عدم و جود برابر ہو گیا۔ کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ جب سرداری قبول کر لی جاتی تھی تو پھر سردار کو عمر بھر اسی قلعہ میں رہنا پڑتا تھا اور یہاں وہ اس طرح بیٹھا رہتا تھا۔ جیسے مکڑی اپنا جالا پُور کر جالے کے بیچ میں بیٹھ جاتی ہے اور دُور دُور تک

غضب ڈھایا کرتی ہے۔ یہ ایوان ہر طرف سے کھلا ہوا تھا تا کہ شیخ وہاں بیٹھ کر دُور دُور کی خبر رکھا کرے۔ اس بلند کاشانے سے اَلموت کا شہر اور پہاڑوں کے عظیم الشان حصار سے باہر کا ہموار ملک ہر وقت پیش نظر رہتا تھا۔ ہوا میں تازگی اور نفاست کے علاوہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نظر بند ہو۔ یہاں بیٹھ کر زمین و آسمان کا نقشہ، آفتاب کے طلوع و غروب کا نظارہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیفیت اور رات کے وقت ستاروں کی جلوہ آرائی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

شیخ الجبل اس وقت اسی ایوان فلک نما میں بیٹھا تھا۔ یہ ایک دراز قامت لاغر اندام آدمی تھا۔ ہمیشہ غور و فکر میں رہنے سے چہرہ پر شکن پڑ گئے تھے۔ ناک لمبی اور نوک پر سے نیچے کو جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں سیاہ حلقوں میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی سفیدی اس طرح چمکتی تھی جیسے کسی شیر کے تاریک بھٹ میں بیل کی سوکھی ہڈیاں چمکتی ہوں، ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی اور لباس برف کی مثل سپید تھا۔ شیخ یہاں بیٹھا نیچے شہر اور میدان کو دیکھ رہا تھا۔ قلعہ کے عین نیچے آبادی کے مکانات سے لے کر نظر اس تاریک گھاٹی تک پہنچتی تھی، جس میں شاہ رُود بہتا ہوا پہاڑوں کی آڑ میں آ کر آنکھ سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اب اس نے اپنی نظر اُس پہاڑی کی طرف پھیری، جو قلعہ سے دوسری طرف واقع تھی۔ اس پہاڑی سلسلے کی کیفیت بیان کر دینی ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ قلعہ سے نیچے نشیب کی طرف پہاڑ کچھ دُور تک ڈھلوان ہوتا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی پہاڑ جس پر قلعہ واقع تھا، یک لخت سیدھا گھاٹی میں اُتر گیا تھا لیکن اس ڈھلوان پہاڑ پر ایک جگہ بڑا ٹکڑا زمین کے بالکل ہموار واقع ہوا تھا، جس پر درخت بکثرت تھے۔ گھاٹی کے پار ہو کر پہاڑوں نے پھر بلندی اختیار کر لی تھی۔ شروع میں یہ بلندی بتدریج پیدا ہوئی تھی لیکن پھر پہاڑ سیدھے اُٹھ کر چوٹیوں پر کنگورے دار ہو گئے تھے۔ یہ بلندی ایسی تیز تھی کہ جانوروں میں بھی صرف بُزِ کوہی وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ غرض جہاں پہاڑ کی ڈھال پر زمین کا ہموار قطعہ تھا، وہاں چنار اور صنوبر کے درختوں کا ایک بڑا جھنڈ تھا اور اس کے اردگرد ایک خوش رنگ غبار سا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پھولوں کے تختے دُور سے نظر آتے ہوں۔ درختوں کے اس جُھرمٹ کے بیچوں بیچ کوئی چیز بھوری بھوری ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی پتھر کی عمارت ہو۔ یہ درختوں کا جُھنڈ اور اس کے گرد پھولوں کا رنگین غبار اس طرح واقع ہوا تھا جیسے کسی سطح ہموار پر ایک نخلستان ہو، جس کے مشرق اور مغرب میں تاریک اور عمیق وادی ہو اور شمال میں اس پر پہاڑوں کی چوٹیاں سایہ کیے ہوں۔ قصہ مختصر یہ وہ مقام تھا جس پر شیخ الجبل کے محمد بن بزرگ امید کی نظر جمی تھی اور اس نظر میں تشویش کے

ساتھ کینہ اور بغض کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

آفتاب غروب ہوا۔ تاریکی بڑھی غلام روشنیاں لے کر ایوان میں حاضر ہوئے۔ شیخ فکر و تشویش کی حالت دور کر کے ریاست کے کاموں میں مصروف ہوا۔ معتمدین خاص میں سے ایک معتمد حاضر ہوا۔ امورِ دریافت طلب عرض کئے۔ اور مراسلات جو مختلف ملکوں سے حشیشئین کے بڑے بڑے نقیبوں نے بھیجے تھے، پیش کئے۔ اس کے بعد چند دائی حاضر ہوئے۔ جاسوسی کے ذریعے سے جو خبریں موصول ہوئی تھیں یا مختلف ملکوں میں جو کام اُن سے عمل میں آئے تھے، وہ بیان کئے شیخ محمد نے بہت جلد جو کچھ کہنا تھا وہ کہا اور جو حکم دینا تھا، وہ دیا لیکن جس قدر حکم جاری کئے۔ وہ سب شدت سے ظالمانہ تھے۔ اُن میں کہیں کوئی نرمی جو انسانی ہمدردی یا رحم دلی کا مقتضی ہوتی ہے، نام کو نہ تھی جس وقت یہ کل کام ختم ہوئے اور خدام قتل پیشہ میں سے ایک خادم چلنے کو ہوا۔ تو شیخ نے اس کو واپس بلا کر کہا" ہاں، وہ معاملہ کس قدر پیچیدہ ہے؟ مناسب ہے کہ سرِ دست اُس شخص کے لئے بہترین مشکلیں پیدا کر دی جائیں۔ ان کوششوں کے لئے میدان وسیع چھوڑا جائے تا کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی امیدیں پوری کرے اور اس کا مطلق علم نہ ہو، کہ کب وہ اپنی حدود سے باہر ہو گیا۔

اتنا حکم سن کر خادم نے سر جھکایا اور رخصت ہوا۔ شیخ اب قالین پر جو چیزیں رکھی تھیں۔ ان کو اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ اتنے میں ایک طرف کے در سے پردہ ہٹا اور ایک لمبے قد اور بارعب صورت کا سیاہ پوش خادم ہاتھ باندھ کر اندر آیا۔ شیخ نے اسے دیکھتے ہی کہا" اچھا اُس نوجوان کو حاضر کرو"۔ خادم نے فوراً پیچھے ہٹ کر پردہ ہٹایا اور قاسم ایک جوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ جوان اس کو وہیں چھوڑ کر فوراً باہر نکل آیا۔ اب قاسم شیخ الجبل کے سامنے تھا۔ فوراً اپنے باپ کی نصیحت یاد کر کے زمین بوس ہونے کے لیے پیشانی فرش تک جُھکا دی۔

شیخ نے کہا۔" اُٹھو" قاسم کھڑا ہوا اور اب چاروں طرف دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ایوان سادگی اور تکلفات کا ایک مجموعہ ہے۔ دروازوں کے پردے دیبا اور حریر کے ہیں۔ فرش نہایت قیمتی قالینوں کا ہے۔ جا بجا چینی صنعت کے ظروف اور گلدان رکھے ہیں۔ سونے کے ایک اونچے فتیل سوز پر برنجی چراغ روشن ہے۔ جس کی دھیمی دھیمی روشنی پردوں کے رنگوں اور گلدانوں کے چمکتے ہوئے حصوں پر عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ قاسم دیکھنے کو تو یہ دیکھ رہا تھا لیکن اس کی ساری توجہ شیخ کی جانب تھی۔ جو دیباج کی مسند پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ داہنے

ہاتھ کو ایک تلوار اور سامنے قالین پر ایک قلمدان اور کتاب اور اس کے پاس ہی ایک خنجر اور ایک چھوٹی سی نقشین ڈبیا معجون کی رکھی تھی۔ خنجر بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا قاسم کو صحرا میں اپنے سرہانے گڑا ہوا ملا تھا۔

تھوڑی دیر تک شیخ خاموش بیٹھا قاسم کو بغور ایسی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ قاسم کے دل میں گھس کر اس کے پوشیدہ سے پوشیدہ راز کو بھی دریافت کر لیں گی۔ قاسم نے دل میں کہا کہ اس جگہ کا نام آشیانہ عقاب کسی نے بہت ٹھیک رکھا ہے۔ کیونکہ یہاں کا حاکم ایک طائر خونخوار سے کم نہیں اور نظر اس کی ایسے درندے سے بھی زیادہ تیز ہے۔ جو اپنا شکار اندھیرے میں دیکھ لیتا ہے۔ جس طرح اُس درندے کی نظر کام دیتی ہے۔ اسی طرح شیخ الجبل کی نگاہیں بھی انسان کے قلب میں پہنچ کر اس کا بھید لے آتی ہیں۔

قاسم اسی خیال میں تھا کہ شیخ نے کہا۔ ''ہاں تو تم قاسم بن سلیم بن طاہر ہمارے فرقے کے راز و اسرار دریافت کرنا چاہتے ہو''۔

اتنا سنتے ہی قاسم نے دل میں کہا۔ ''جو بات میں سوچ رہا تھا۔ وہی نکلی۔ میرے دل کا اصلی حال اس شخص پر کھل گیا''۔ قاسم سر سے لے کر پاؤں تک سرد ہو گیا۔ جواب کچھ نہ دے سکا۔

شیخ نے کہا۔ ''اچھا ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ وقت بھی آ جائے گا کہ ہماری سب باتیں تم پر روشن ہو جائیں گی۔ لیکن اس وقت دن بھر کی مصروفیت کے بعد میں بہت خستہ ہوں اور تم بھی جیسا کہ تمہاری صورت سے معلوم ہوتا ہے۔ دُور کے سفر سے آ رہے ہو۔ اس وقت بہت تھکے ہوئے ہو گے۔ اس شہر کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جتنی راہیں اس تک آئی ہیں اُن میں بھوک اور پیاس ہمیشہ مسافر کی رفیق و ہمرکاب رہتی ہے۔ بہرکیف اب تم کچھ کھاؤ پیو''۔

اتنا کہہ کر شیخ نے چاندی کی ایک گھنٹی بجائی۔ ملازم فوراً طلائی کشتیوں میں خاصہ رکھے ہوئے دبے پاؤں حاضر ہوئے کشتیوں کے ساتھ سونے کی دو صراحیاں بھی تھیں اور ان پر ایسے رنگ میں مینا کاری کی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ شبنم کی بوندیں ان پہ پڑی چمک رہی ہیں۔ شیخ نے قاسم سے کہا ''بیٹھ جاؤ اور ما حضر سے شغل کرو''۔

قاسم کو معلوم ہوتا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر شیخ کا حکم سنتے ہی قالین پر وہ بیٹھا۔ چونکہ قاعدہ ہے کہ سخت پریشانی اور فکر کی حالت میں انسان اپنے آس پاس کی کسی چیز کو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ اسی طرح قاسم جس قالین پر بیٹھا تھا۔ اس کی وضع اور تراش پر غور کرنے لگا۔

قالین کے حاشیہ پر گلاب کے پھول سیاہ زمین پر بنے ہوئے تھے۔ متن دھانی رنگ کا تھا اور اس پر نرگس کے پھول ہلکے زرد رنگ کے دھانی زمین کو اور بھی روشن کرتے تھے۔ اس کیفیت کو دیکھتے دیکھتے قاسم کو اپنے پیارے باپ کا باغ یاد آیا۔ جواب یہاں سے صدہا میل دُور بغداد میں تھا۔ گلابوں کی کیاریوں اور بیچ والے گھاس کے تختے کا نقشہ جس پر بہن کے ساتھ چوگان کھیلا کرتا تھا۔ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ باوجود اس خیال میں محو ہونے کے بے اختیار ہاتھ صراحی کی طرف گیا۔ پیاس شدت کی تھی۔ صراحی اُٹھا کر منہ کو لگائی اور جونہی برف میں لگی ہوئی صراحی کا ٹھنڈا ٹھنڈا شربت حلق سے نیچے اُترا۔ قاسم کے ذہن سے سب نقشے مٹنے لگے۔ صراحی ہاتھ سے رکھ کر شیخ کی طرف دیکھا۔ شیخ اس وقت شیرینی کے ایک ٹکڑے سے شغل کر رہا تھا اور بیچ میں شربت کا بھی ایک ایک گھونٹ پیتا جاتا تھا۔ اس کے چہرے کی کیفیت بھی اب بدل چلی تھی۔ آنکھوں میں جو غضب بھرا تھا۔ اب دُور ہو گیا تھا۔ چہرے کے شکن بھی کم ہو گئے تھے۔ دھیمی روشنی میں ایوان کی جس قدر چیزیں تھیں۔ ان پر ایک عجیب قسم کا لرزہ پیدا ہوتا معلوم ہوا اور تمام کمرے میں باریک بادل سے اُڑتے نظر آئے اور اب قاسم کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سپید روئی کی مثل نرم بادل کا ٹکڑا اس پر اور کمرے کی تمام چیزوں پر چھا گیا ہے اور اس کی دھندلی روشنی میں شیخ کی صورت ایوان کا پرتکلف سامان۔ تکیے۔ قالین۔ چینی کے ظروف سب کی شکلیں کچھ مٹی مٹی غیر واضح سی نظر آنے لگی ہیں۔ کچھ دیر میں یہ محسوس ہوا کہ زمین کیا ساری دنیا اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر کہیں دُور بھاگی چلی جاتی ہے۔ بے اختیار چاہا۔ کہ کسی چیز کو پکڑ لے اور اسی کو دنیا میں اپنا سہارا سمجھے۔ پھر قالین کا خیال آیا۔ جس پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر دل میں کہنے لگا۔ یہ تو وہی قالین ہے۔ جو پہلے دیکھا تھا اور اس کے نقش و نگار۔ گلاب اور نرگس کے پھول بھی وہی ہیں۔ جو پہلے نظر آئے تھے لیکن متن کی ہلکی سبزی اور حاشیہ والے پھولوں کے بیچ میں ایک سیاہی مائل سرخی جیسے صبح کاذب کی روشنی ہوتی ہے۔ پیدا ہو چلی ہے۔ قالین کی سبزی گھر کے باغ کا سبزہ معلوم ہونے لگی اور یہ سمجھ میں آیا کہ وہ فی الواقعہ گھاس ہے۔ اتنے میں پھول اپنی صورت بدل کر چمن کی تیتریاں بننے لگے۔ روشنی کسی قدر نکھری اور قاسم نے دیکھا کہ حقیقت میں گھاس پر بیٹھا ہے۔ درختوں کی ہری بھری شاخیں سر پر ہیں۔ اور قدموں سے آگے سبزہ زار پھیلے پڑے ہیں۔ پانی کی جھلک بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ آسمان بالکل کورا تھا۔ ہر چیز پر ہلکی ہلکی دھوپ کھلی تھی اور اس دھوپ سے درختوں کا سایہ ایک ایسے باغ میں پڑتا

نظر آیا۔ جس کی مثل قاسم نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ بغداد والا باغ بھی حسن وخوش نمائی میں اس کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتا تھا۔

یہ باغ بہت بڑا تھا۔ ایک طرف اونچی اونچی جھاڑیوں کی باڑیں اور دوطرف گھنے اور گنجان درختوں کی صفیں کھڑی تھیں۔ ان میں سرو وصنوبر۔ چنار اور سفیدار اور دوسری قسم کے درخت تھے جن کو قاسم پہچانتا بھی نہ تھا۔ چوتھی طرف تین سنگ مرمر کے محل نہایت خوبصورت نقش ونگار کے کھڑے تھے۔ ان کی دیواروں اور برجوں پر روشنی کی چمک بہت تیز تھی لیکن برآمدوں اور محرابوں سے آگے کمروں کے اندر روشنی کم ہو کر ایک خوشگوار ہلکی سی تاریکی پیدا کرتی تھی۔ محلوں کے ایک طرف جدھر باغ ختم ہوتا تھا۔ عالیشان درختوں کی دوطرفہ قطاروں کے بیچ میں ایک سایہ وار راستہ دور تک چلا گیا تھا اور اس کے اختتام پر پہنچ کر پہاڑوں کا ایک بلند سلسلہ نظر آتا تھا۔ جن کی چوٹیاں کنگوروں کی شکل رکھتی تھیں۔ اس رُخ کہیں چٹانوں کی سیاہی اور کہیں درختوں کی سبزی پر روشنی عجیب عجیب رنگ دکھاتی تھی۔ باغ کے عین وسط میں ایک بڑا تختہ سبزۂ نودمیدہ کا تھا۔ جو ہر طرف سے جھکتا ہوا ایک صاف ستھرے پانی کے تالاب پر ختم ہوتا تھا۔ اس سبزے کے کنارے کنارے گلاب کے درخت تھے اور بیچ میں جا بجا نرگس اور سوسن کے پھول کھلے تھے اور پانی کی سطح پر کنول کے سرخ اور سپید پھول عجیب بہار دکھاتے تھے۔

قاسم نے اب حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ خود باغ میں ایک طرف گھاس کے تختے پر اپنے کو بیٹھا پایا۔ سر پر سفید گلاب کی شاخیں پھولوں کے مورچھل ہلا رہی تھیں۔ باغ پر ایک سکوت کا عالم تھا۔ پانی کے چلنے اور گرنے کی اُڑتی سی صدا آ رہی تھی۔ قاسم کو معلوم ہوا کہ اس کے قریب ہی ایک چشمہ جاری ہے اور یہ آواز اُسی کے پانی کی ہے۔ چشمے کا پانی اپنے خمدار راستے پر جس کے کنارے پر سیاؤشاں کی باریک باریک پتیاں زمین پر بچھی تھیں۔ بہتا ہوا بیچ والے تالاب میں گرتا تھا۔ قاسم شربت پی چکا تھا۔ مگر تشنگی اب بھی غالب تھی۔ اس حال میں چشمے کے قریب جا کر پانی پینے کو جھکا۔

فوراً ایک آواز آئی۔ ''ٹھہرو''۔ آواز ایسی شریں تھی۔ جیسے کوئل کی کوک۔ قاسم نے سر اونچا کیا، دیکھا! کہ ایک صورت سامنے کھڑی ہے۔ جو اس دنیا کی نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے۔ وہ انسان ہو اور پاس کے درختوں سے نکل کر چپکے سے سامنے آ گئی ہو لیکن اس کا دفعتاً ظاہر ہونا اور پھر اس کا حسنِ جاں فریب قاسم کو ایک فوق العادت کرشمہ معلوم ہوا۔ قاسم کی تربیت بڑی

پابندیوں کے ساتھ ہوئی تھی ۔گو یہ سچ ہے کہ زمانہ ایسا تھا کہ عیش وعشرت دولت اور اختیار نے اخلاق کی بندشیں کمزور کر دی تھیں ۔مگر قاسم اس قسم کے اثرات سے محفوظ رہا تھا۔ بجز اپنی ماں اور بہن یا گھر کی ماؤں کے جو کسی طرح بھی قبول صورت نہ تھیں ۔ قاسم نے کسی عورت کی صورت آج تک نہ دیکھی تھی ۔غریبوں کی عورتیں راستہ میں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں مگر ان میں بھی سوائے بُڑھیوں ٹھڑیوں کے سب منہ پر نقاب ڈالے ہوتی تھیں لیکن اس وقت جو حسین صورت سامنے تھی ۔ وہ بالکل بے نقاب تھی ۔قاسم کو خیال ہوا کہ یہ تو میری بہن خجستہ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے ۔دل میں رشک سا پیدا ہوا کہ کیوں میری بہن بھی ایسی حسین نہ ہوئی لیکن فوراً ہی سمجھ میں آیا کہ اس حسین عورت اور اس کی بہن میں بہت فرق ہے ۔ خجستہ خاتون صورت کی بہت اچھی تھیں ،اونچا قد تھا ،نقشہ پاکیزہ تھا ،جس سے ذہانت ٹپکتی تھی ، ہاتھ پاؤں بہت مضبوط تھے ،گو یا محنت اور مشقت کے لئے وضع ہوئے تھے ،کھیل کود ، پڑھنے لکھنے میں بھائی کی پوری جوڑ تھیں لیکن جو صورت اس وقت سامنے تھی ، بہت نازک اور حسین اور ایسے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں جس سے ہوا وہوس کو ترغیب ہو ،نرمی اور نزاکت کی از سرتا پا تصویر تھی ۔ چہرہ گول اور ایسا روشن تھا ۔جیسے چودھویں رات کا چاند اور اس پر انبساطِ زندگی کی ہر جنبش ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے آب مصفا پر تسیم کے ہلکورے ۔لمبی لمبی پلکوں میں سے آنکھوں کی سیاہ پتلیاں اس طرح چمکتی تھیں ۔جیسے شبنم کے غبار یا درختوں کی نازک شاخوں میں سے نکلتے سورج کی کرنیں دکھائی دیں یہ صورت دوسروں کے لئے مرنے اور جان کھونے کے لئے پیدا ہوئی تھی ۔عیش ومحبت کے افسانے قاسم نے سنے اور پڑھے ضرور تھے ۔مگر ان کی اصلی کیفیت اور اثر سے مطلق ناآشنا تھا ۔قاسم کو شرم سی آنے لگی اور دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا ۔

پھر وہی آواز آئی ۔ ’’ٹھہریئے یہ پانی نہانے کا ہے پینے کا نہیں ہے ۔میں آپ کے لئے جنت کا پانی لاتی ہوں‘‘ ۔

اب اس نوجوان صورت نے ہنسنا شروع کیا ۔اور اپنے گورے گورے بھرے بھرے ساعد و بازو قاسم کی طرف بڑھائے ۔

دونوں ہاتھوں میں بلور کی ایک صراحی تھی ۔ جس پر یاقوت اور زبرجد کے رنگ تڑپ رہے تھے اور جو کچھ اس صراحی کے اندر تھا ۔اس پر آفتاب کی روشنی آگ کے سے شعلے اٹھا رہی تھی ۔اب اور بھی حیرت طاری ہوئی ۔صراحی ان خوبصورت ہاتھوں سے لے کر منہ کو لگائی ۔ دو

چار گھونٹ حلق سے اُترے تھے کہ تن بدن میں آفتاب کی سی حدت ہوائے تند کی سی تیزی اور برف پوش پہاڑوں کی سی تازگی معلوم ہوئی۔ یہ کیفیت محسوس کرتے ہی قاسم بہت گھبرا کر اور ڈر کر بولا۔ ''ہائیں کیا یہ شراب ہے۔ حرام چیز! اور یہ کہہ کر صراحی لبوں سے ہٹالی۔ مگر پیاس بجھی نہ تھی۔ جی چاہا کہ صراحی پھر منہ سے لگا لے، قاسم کے یہ جملے سن کر اس نازنین نے کہا۔ ''شراب ہونے میں کلام نہیں۔ مگر یہ جنت کی شراب ہے۔ اس میں تسنیم اور سلسبیل کا پانی ملا ہوا ہے۔ جو جنت کے دو چشمے ہیں اور ایسے چشمے ہیں۔ جن کی تہ کے سنگریزے یاقوت دمرجان جن کی مٹی کافور اور جن کی زمین مشک وعنبر کی ہے اور کنارے زعفرانی ہیں۔ یہ وہ آب حیات ہے۔ جو بہشت میں مومنوں کے لئے مخصوص ہوا ہیا ور بہشت وہ مقام ہے۔ جہاں کسی چیز کی ممانعت نہیں ہے۔ اس لئے اور پیو''۔

قاسم سمجھا کہ یہاں سحر کا عمل ہے۔ مگر جو کچھ ہو۔ وہ مسرت انگیز ہے اور اب اس کے تمام ارادے اور قصد اس طرح پانی ہو گئے۔ جیسے موسم بہار میں تمازت آفتاب سے برف پگھل جاتی ہے۔ قاسم نے صراحی پھر منہ سے لگالی۔

وہ خوبصورت عورت پھر ہنسی اور کہنے لگی۔ ''دیکھو جس دنیا سے آئے ہو۔ وہاں کے گرد وغبار میں کیسے آلودہ ہو۔ اب تازہ دم ہو گئے ہو۔ بہتر ہے کہ جا کر نہاؤ''۔

قاسم نے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ وہ بالکل میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ منہ پر خاک جمی تھی اور بدن پر میل اور پسینے سے طبیعت بے چین تھی۔ دفعتہً اس نازنین نے قاسم کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ قاسم بلا تامل اُٹھا اور اب وہ اس کا ہاتھ پکڑے دوڑتی اور ہنستی ہوئی تالاب تک آئی لیکن اس حالت میں قاسم کو ایک اور حیرت انگیز چیز نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ سنگ مرمر کے ایک محل سے بہت سی جوان جوان لڑکیوں کا ایک غول گاتا اور دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ قاسم ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے ششدر رہ گیا وہ مسلمان تھا اور پابند شریعت تھا۔ جس کے مذہب میں ایک جانور تک کی تصویر بنانی یا دیکھنی درست نہ ہو۔ وہ ایک زندہ عورت کے ڈیل ڈول اور ترکیب اعضا کو کیونکر بغور دیکھ سکتا تھا۔ یہ جوان جوان لڑکیاں بجائے اس کے کہ بہت سے کپڑے پہنے اور منہ پر نقاب ڈالے ہوں۔ جیسا کہ عورت کے لیے زیبا ہے۔ نہایت بے شرمی کے لباس میں یا یہ کہئے کہ کسی قسم کے بھی لباس میں نہ تھیں۔ کیونکہ ان کے کپڑے نہایت باریک تھے اور کوئی کپڑا ایسا نہ تھا۔ جو گھٹنوں سے نیچے گیا ہو، رنگ بھی ان کے دھنک کے تھے۔ چنانچہ جب وہ

گاتی ہوئی باغ کے سبزے پر دوڑیں۔تو یہ معلوم ہوا کہ کسی نے پنجرے کی کھڑکی کھول دی ہے اور رنگ برنگ کی چڑیاں اس سے نکل کر اُڑی ہیں، قاسم کو پہلے تو کچھ خوف اور حجاب ہوا، لیکن پھر یہ کیفیت قابل تعریف معلوم ہونے لگی۔اس کے بعد ہی ایک اور تعجب کی بات پیش آئی۔وہ یہ کہ جب یہ جھرمٹ اس کے قریب آیا تو سب نے مل کر قاسم کے کپڑے جتنے اوپر کے تھے۔ سب کھینچ کھانچ دُور پھینک دیئے اور ہنستی ہنستاتی غل مچاتی۔قاسم کو گھسیٹ کر تالاب کے بیچ میں لے گئیں اور اب اس کے گرد پانی میں دوڑنا اور پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر اس کو ستانا شروع کیا۔ کسی نے گردن پکڑ کر پانی میں ڈبونی چاہی اور جب سر پانی سے باہر نکلا۔تو سب نے خوب قہقہے لگائے۔ جب اس کھیل کود میں وہ بھیگ کر بالکل چُوڑا ہو گئیں۔تو تالاب سے باہر نکلیں اور قاسم کے بازو پکڑ کر گھاس کے تختے پر دوڑنے لگیں۔ باریک کپڑے بھیگ کر بدن کو ایسے چمٹے کہ گویا تن پوشی کی خدمت سے بالکل آزاد ہو گئے۔قاسم کے لئے یہاں ہر ایک چیز ایسی بے حجابی کی تھی کہ وہ شرم وحیا کو ایک بیکار چیز اور اس حالت پر اعتراض کرنے کو ایک بناوٹ کی بات سمجھنے لگا۔غرض اسی حال سے قاسم اور جوان لڑکیوں کا یہ جھرمٹ اس محل میں پہنچا۔ جہاں سے شروع میں نکلا تھا اور قاسم کو تنہا چھوڑ کر محل میں غائب ہو گیا۔ ہنسنے کی آوازیں بھی رفتہ رفتہ قاسم کے کانوں میں آنی بند ہو گئیں۔

اب قاسم باغ کے محل میں تنہا تھا۔سنگ مرمر کی ایک چوکی پر ایک جوڑا کپڑوں کا رکھا تھا۔سمجھ گیا کہ سوائے میرے یہ اور کس کے لئے ہوسکتا ہے۔بدن خشک کر کے کپڑے پہنے۔ان میں ایک سادی عبا اور شلوار بالکل سپید ریشم کی تھی۔ دستار کا رنگ پیازی تھا اور ایک جڑاؤ کلغی ہیروں کی تھی۔ جو دستار میں سامنے کے رُخ لگانے کی تھی۔ یہ سب چیزیں پہن کر قاسم ایک کمرے میں گیا۔ جہاں ایک بڑا آئینہ رکھا تھا۔آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔خیال ہوا کہ اس صورت میں کوئی بات ایسی تو نہ تھی کہ ان لڑکیوں نے خواہ مخواہ مجھے ایک تماشا بنالیا۔کمبخت بڑی بے حجاب ہیں۔اگر ایک دفعہ اور نظر آجائیں تو خالی از لطف نہ ہو۔کم سے کم مجھے یہ کپڑے پہنے اور کلغی لگاتے تو دیکھ لیں۔شاید اب تو وہ میری صورت بھی نہ پہچان سکیں۔غرض یہی باتیں سوچتا ہوا محل سے نکل کر باغ میں آیا۔مگر دل سے یہ آرزو نہ گئی کہ پھر اُن حسینوں سے ملاقات ہو۔

باغ میں دن چھپ کر شام کی ہلکی ہلکی روشنی باقی تھی۔قاسم کو ایک اور بات حیرت کی یہ معلوم ہوئی تھی کہ جس وقت اَلموت کے شیخ کے سامنے پیش ہوا تھا۔تو رات شروع ہو گئی تھی۔مگر

اُسی وقت اس باغ میں دن کی روشنی موجود تھی اور اب کہیں جا کر شام ہوئی ہے۔ یہ معمہ کسی طرح حل نہ ہوتا تھا۔

قاسم باغ میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ مگر پھر وہ صورتیں نظر نہ آئیں۔ یہی تلاش تھی کہ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مُڑ کر دیکھا۔ تو وہی حسین صورت تھی۔ جس نے جنت کی شراب اور جنت کا پانی پلایا تھا۔ قاسم کا بازو پکڑ کر کہنے لگی۔ ''آیئے'' اور اتنا کہہ کر باغ میں ایک دوسرے محل کی طرف اس کو لے چلی، شام کی ہلکی روشنی محرابوں سے گذر کر برآمدوں میں کسی قدر موجود تھی، اندر چھت میں ایک جھاڑ لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی ہر طرف پھیلی تھی۔ زمین پر نرم نرم قالینوں کا فرش تھا اور جا بجا بڑے بڑے تکیئے رکھے تھے۔ یہ دونوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں دو جوان خواصیں روپہلی کپڑے پہنے جھم جھم کرتی آئیں۔ آتے ہی انہوں نے دسترخوان بچھایا اور نہایت لذیذ کھانے اور شیریں میوے چُن دیئے اور ایک بہت بڑا بلوری کاسہ سُرخ شراب سے بھرا ہوا ان کے پاس رکھ دیا۔ اتنے میں رات کی خاموشی اور سکوت میں عود اور چنگ کی سُریلی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ قاسم نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا بھوک اس کو اب ایک ایسی ذلیل خواہش معلوم ہوئی۔ جس کا سیر کرنا تہذیب و شائستگی کے خلاف معلوم ہوا۔ شراب البتہ تھوڑی سی پی، نازنین جو ساتھ تھی۔ اُس نے اور بھی کم کھایا۔ ساغر سے شراب البتہ کچھ پی۔ یا یہ کہیئے چوستی رہی۔ اب قاسم کے دل میں ایک نئی بات پیدا ہوئی۔ نظر بار بار اُس حسینہ کی طرف بے اختیار جانے لگی اور جب نگاہ اس طرف نہ ہوتی۔ تو اس بات کا علم دل میں ایک گدگدی پیدا کرتا کہ کسی کی چشم فتنہ زا اس پر اپنا وار کر رہی ہے اور یہی نہیں۔ بلکہ وہ اندام نازک اور اس کا اُبھرا جوبن بھی اس سے اتنا قریب ہے کہ اس کی گرمی عجیب بے چینی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ ہر چیز ظاہر ہے اور ہر چیز باریک لباس میں چھپی ہے۔

آخر کار قاسم نے اس سے باتیں کرنی چاہیں۔ اپنی آواز خود ہی عجیب معلوم ہوئی۔ حلق پھر خشک تھا۔ گر برف میں لگی شراب ابھی پی چکا تھا۔

قاسم نے پوچھا۔ ''یہ تو فرمایئے کہ آپ کون ہیں۔ نام کیا ہے''۔ قاسم نے زبان سے یہ جملہ کہا۔ مگر نگاہ اُس نازنین کی طرف نہ اُٹھ سکی۔ صرف اتنا محسوس ہوا کہ اس سوال پر وہ مُسکرائی اور کہنے لگی کہ ''میرا نام پری سمجھ لیجئے اور یہی نام لیا بھی کیجئے''۔

قاسم: ''اچھا پری تو آپ کا نام ہوا اور اس عجیب و غریب مقام کو کیا کہتے ہیں؟''

پری: ''یہ باغ فردوس یعنی جنت ہے''۔

قاسم: ''اتنا اور فرمایئے کہ وہ حسینوں کا غول کیسا تھا۔ جو مجھے تالاب پر لے گیا تھا اور وہاں اس نے عجیب عجیب شوخیاں اور شرارتیں کی تھیں''۔

پری: ''وہ جنت کی حوروں کا غول تھا۔ یہ حوریں اب سب آپ کی ہیں''۔

بچو! میں تم کو بتا چکا ہوں کہ سلیم بن طاہر نے تمہارے جد امجد قاسم کو بڑے اہتمام سے شرع شریف کی تعلیم دی تھی۔ نکوکاری اور پرہیزگاری سکھا کر ان کو محنت و مشقت کا خوگر بنا دیا تھا لیکن شیخ الجبل کی اس مصنوعی جنت کے سحر و طلسم نے ان کے دماغ پر برا اثر کیا اور شراب نے جو انہوں نے کبھی پہلے پی نہ تھی۔ ان کی عقل پر پردہ ڈال دیا اور وہ اس حالت مدہوشی میں سمجھنے لگے کہ یہ وہی جنت ہے۔ جس کا وعدہ مومنوں سے کیا گیا ہے اور جو ہر قسم کے شر اور فساد سے پاک ہے۔ جہاں نہ کسی گناہ کا ارتکاب ہو سکتا ہے اور نہ استغفار کی ضرورت ہے۔ جب ان باتوں پر نظر کی جائے۔ تو قاسم ہرگز تقصیروار نہ تھے، لیکن باوجود اس کے آگے چل کر ان خطاؤں کا خمیازہ ان کو بہت اٹھانا پڑا۔ جس وقت اس حسین عورت نے کہا کہ وہ جوان لڑکیاں حوریں تھی اور وہ سب حوریں آپ کو ملی ہیں۔ تو قاسم کو اپنی طبیعت پر قابو نہ رہا اور اس نے نظر اٹھا کر اس نازنین کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بھی عشق و الفت کا نور چمک رہا ہے اور اس نور کا عکس وہ قاسم کی نظر پر بھی ڈال رہی ہے اور اب اس کے لب قاسم کے رخسار سے اتنے قریب ہو گئے کہ قاسم کو اس کے سانس کی گرمی محسوس ہوئی۔ اس حالت میں آہیں بھرنے لگی جو دم کی حرکت کے ساتھ سینے کو ابھارتی تھیں اور شبنم کا باریک کرتہ اس کیفیت کو چھپا نہ سکتا تھا۔ قاسم نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا اور بوسے کے لیے اس کے لبوں کو ڈھونڈھنے لگا اور گریہ آمیز آواز میں بولا ''مجھے حوروں کی پروا نہیں۔ مجھے تو فقط تم درکار ہو۔ تمہارے سوا کسی دوسرے کی تمنا نہیں''۔

یہ سن کر پری کے منہ سے ایک آہ سرد ایسی نکلی۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی سخت روحانی تکلیف میں مبتلا ہے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بندھ کر قاسم کے سینہ پر اس طرح زور دیا۔ کہ قاسم پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اس کی صورت سے غصہ مطلق ظاہر نہ تھا۔ بلکہ نگاہیں رحم اور دردمندی کی خواستگار تھیں۔ اس بے کسی اور عاجزی کی نظر نے قاسم کو اور بے چین کر دیا، پری اُٹھی اور کہنے لگی۔ ''اب جس سے ملو گے اس کے سامنے میری کیا حقیقت ہے۔ گھاس کے تنکے کو گل سوسن سے کیا نسبت!''

قاسم بھی اُٹھا اور پری کے پیچھے پیچھے باغ میں آ گیا۔ آسمان پر تاریکی پھیل چکی تھی۔

ستارے خوب نکل آئے تھے۔ قاسم نے پری کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ البتہ کسی کے رونے کی دو چار سسکیاں ضرور سنائی دیں۔ قاسم نے چاہا کہ دوڑ کر پری کو تلاش کرے۔ مگر اس کوشش میں معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی۔ جس نے اس کو سنگ مرمر والے دیوان کی طرف پہنچا دیا۔ قاسم نے دیکھا کہ واقعی اس عالی شان کمرے سے سوسن کے پھول موجود ہیں۔ بیچ میں بلور کا ایک بڑا گلدان رکھا ہے۔ اور اس میں سفید پھول کھل رہے ہیں، لیکن ان پھولوں کے علاوہ بھی یہاں کوئی چیز تھی۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک جگہ قالین پر نرم تکیے رکھے تھے۔ غور کیا۔ تو ان تکیوں میں سیاہی اور سفیدی کا ایک ڈھیر سا پڑا نظر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قاسم پر واقعی خوف طاری ہوا۔

۞ ۞ ۞

ساتواں باب

قاسم جو کبھی نہ ڈرا تھا، اس وقت ڈر گیا مگر یہ ڈر لڑائی کے میدان کا سا خوف نہ تھا۔ جس سے انسان کا پِتّا پانی ہو جاتا ہے۔ ہتیار کوئی پاس نہ تھا۔ مگر بے اختیار تکیوں کے بیچ میں جو کوئی چیز تھی۔ اس کے قریب چلا گیا۔ یہاں دو روشن آسمانی رنگ آنکھوں کے نیچے دو گورے گورے بازو نظر آئے۔ فوراً ایک ہاتھ کو حرکت ہوئی اور کپڑوں میں سے کوئی چیز نکال کر پھر وہ اپنی جگہ آتا دکھائی دیا۔ کچھ فولاد کی سی چمک ہوئی، قاسم نے بڑھ کر فوراً کلائی پکڑ لی۔ دیکھا تو ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ اس حرکت کے ساتھ ایک چہرہ برف کی مثل پاکیزہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ سر پر سنہرے گھونگروالے بالوں کا ایک ڈھیر تھا۔ آنکھیں بڑی تھیں اور پتلیوں کا رنگ ایسا تھا۔ جیسے صبح کا کورا آسمان۔ قاسم اس کیفیت سے اس طرح متاثر ہوا جیسے کوہ قاف کی چوٹی پر کوئی صبح کی آمد دیکھ رہا ہو اور آفتاب کی کرنیں شبنم کا غبار دُور کر کے برف پوش کُہساروں پر یک لخت چمک اٹھی ہوں اور کُل منظر خوفناک مگر حسین اور حیرت خیز ہو۔ قاسم نے ایسی صورت کبھی نہ دیکھی تھی، سنا کرتا تھا کہ افرنجیوں کا رنگ بہت گورا اور سر کے بال بھورے بلکہ سنہری ہوا کرتے ہیں اور وہ کافر ہوتے ہیں۔ مگر یہ جنت ہے۔ یہاں کافر کا گذر کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جنت تو راحت اور الفت کا مقام ہے۔ مگر اُس چہرے سے تکلیف اور نفرت ظاہر ہو رہی ہے۔

اب دونوں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھنی شروع کی۔ کچھ دیر بعد قاسم نے کہا۔ ''یہ چھری آپ کے ہاتھ میں کیسی ہے۔ اس چیز کا جنت میں کیا کام''۔ قاسم کو فوراً خیال آیا کہ میں بڑا بیوقوف ہوں۔ عربی بول رہا ہوں۔ یہ غریب عربی کیا سمجھے گی۔ مگر اس فرنگن نے کچھ رک رک کر عربی میں جواب دیا کہ ''یہ جنت نہیں دوزخ ہے''۔

قاسم: ''دوزخ کیسے ہو سکتی ہے۔ مجھے تو یہی بتایا ہے کہ جنت ہے''۔

فرنگن: ''جس نے اسے جنت بتایا، وہ آپ سے جھوٹ بولا۔ مجھ سے سنئے کہ یہ دوزخ

کیوں کر ہے، لیکن پہلے میری کلائی چھوڑ دیجئے''۔
قاسم: ''کلائی تو میں جب چھوڑوں گا۔ جب آپ چھری پھینک دیں گی''۔
فرنگن: ''چھری تو میری جان کے ساتھ لگی ہے اور ہمیشہ یونہی رہے گی۔ یہی تو ایک چیز ہے۔ جو مجھے اس دوزخ سے نجات دے سکتی ہے''۔
قاسم: ''کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ اس چھری سے آپ اپنی جان لیں گی؟''
فرنگن: ''اپنی ہی جان نہیں۔ بلکہ آپ کی جان بھی۔ یہ چھری تو اس وقت سے چھپائے ہوں۔ جب سے قید ہوئی ہوں''۔

قاسم کی سیاہ آنکھوں نے نیلگوں آنکھوں کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ جو صورت سامنے ہے۔ وہ ایک عجیب پیکر نور ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی ایک اُجلی صاف اور شفاف چادر اونچے سیاہ پہاڑوں سے نیچے گر کر اُجلے اُجلے جھاگ اُٹھا رہی ہے۔ مگر قاسم کا دل اس کے حال زار پر نہایت افسردہ ہو گیا اور جب اس بات کا یقین خود بخود پیدا ہوا کہ یہ نازنین میرا اعتبار کر کے اپنی جان تلف کرنے سے باز رہے گی۔ تو قاسم نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

اس سپید مورت فرنگن نے اپنی نگاہ قاسم پر جمائے رکھی اور آہستہ سے کہا کہ ''آپ مجھے ہاتھ نہ لگائیں گے''۔

قاسم نے سر ہلایا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

فرنگن نے کسی قدر ترش ہو کر کہا۔ ''چھری سے آپ ڈر گئے؟''

قاسم: ''میں چُھری سے نہیں ڈرا۔ میں آپ سے ڈرا اور آپ کے لئے ڈرا''۔

جب فرنگن نے اتنا سُنا۔ تو چُھری اپنے سیاہ لباس میں چھپا لی۔ اب اس کی نگاہ قاسم کی طرف سے پھر کر ایوان کے اُن حصّوں کی طرف گئی۔ جو تاریک تھے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تو آواز اتنی ہلکی کر کے جیسے کوئی کسی کے کان میں بات کہتا ہو۔ قاسم سے کہا۔ ''سنئے۔ میں بتاتی ہوں کہ یہ دوزخ کیونکر ہے۔ میں بلاد شمال کے رہنے والی ہوں۔ یہاں کے لوگ ہماری قوم کو وحشی اور ناشائستہ سمجھتے ہیں، لیکن ہم لوگ اپنی عزت کو محفوظ رکھنا، اُن لوگوں سے بہتر جانتے ہیں۔ جو صاحب علم و فضل اور مہذب ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ارفہ کی لڑائی میں قید ہو گئی۔ اب تک مجھے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کیونکہ خود شیخ الجبل کو مجھ پر دعوےٰ ہے اور چند روز میں مجھے اس کی حرم میں داخل کیا جاتے گا اور پھر............'' اتنا کہہ کر کپڑوں میں

جس طرف چھری تھی۔ اپنا ہاتھ لے گئی۔ اس کے بعد کہنے لگی۔ ''آج اس عورت نے جس کا نام پری ہے اور جو تم کو یہاں تک لائی ہے۔ مجھے ایک خط پوشیدہ طور پر دیا تھا اور یہ خط یونانی زبان میں تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''آج شب کو اس باغ میں ایک نوجوان آدمی داخل ہوگا۔ تم اس سے ضرور ملاقات کرنا''۔ اسی ملاقات کی غرض سے یہ بندوبست کیا گیا کہ جہاں آپ اس وقت دیکھتے ہیں۔ وہاں موجود ہوں۔ میں ڈرتی تھی کہ اس میں کوئی دھوکا نہ ہو اور کہیں آپ مجھ پر دست درازی نہ کریں، لیکن اب مجھے یقین ہوگیا کہ آپ شریف اور خدا ترس ہیں۔ اور میری عزت و آبروں کو آپ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے''۔

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ قاسم کے دل میں ایک جوش پیدا ہوا کہ اس غریب الوطن کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھنا اسے اپنا فرض سمجھنا چاہئے، لیکن وہ خود بے بس ہے۔ قاسم نے کہا ''آپ فرمائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ خط جس نے آپ کو بھیجا ہے۔ بہرحال اس سے تو آپ واقف ہوں گی''۔

فرنگن: ''صرف ایک شخص ہے۔ جو اس قسم کا خط مجھے بھیج سکتا ہے اور میں نے اُسے دیکھا بھی ہے۔ نام سے اس کے میں واقف نہیں اور نہ یہ جانتی ہوں کہ وہ کس مرتبہ اور حیثیت کا شخص ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کے لوگوں سے وہ بالکل مختلف طبیعت اور مزاج کا آدمی ہے۔ اب سنئے کہ میں نے یہاں سب کو یہ باور کرادیا ہے کہ میں عربی نہیں جانتی۔ یہ اس خیال سے کہا ہے کہ میرے متعلق جو بات چیت ان میں ہو۔ اُسے میں سمجھ لوں اور ان کو علم نہ ہو کہ میں سمجھی، اس ترکیب سے مجھے اتنا پتا چلا ہے کہ یہ شخص جس نے خط بھیجا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قلعہ اُلموت کے حاکم کے محمد کے پنجۂ غضب سے مجھے چھڑالے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ممکن ہے کہ یہ کوشش اس لئے ہو کہ وہ خود مجھ پر قبضہ کرلے۔ اتفاق سے یہ شخص یونانی جانتا ہے اور معلوم نہیں۔ یہاں اور بھی کوئی اس زبان سے واقف ہے؟''

اس کل تقریر کو سن کر قاسم کی طبیعت اُلجھنے لگی۔ مگر یہاں کی سب ہی باتوں میں اُلجھن تھی کہنے لگا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ یہاں اور بھی کوئی یونانی جانتا ہے۔ جہاں تک میری بس کی بات ہوگی۔ میں آپ کی ہمدردی کرنے کو تیار ہوں گا، لیکن میں کس صورت سے آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔ اس کا بتانا آپ کا کام ہے''۔

فرنگن: ''یہ سب میں آپ کو بتادوں گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو یہاں سے جہاں آپ سے

باتیں کر رہی ہوں ۔ کسی طرح نکل جانا چاہئے ۔ اگر میرا یہاں آنا کسی کو معلوم ہو گیا تو پھر یا تو قتل کر دی جاؤنگی یا میری جان لینے کے لیے اس سے بھی بدتر کوئی صورت پیدا کر دی جائے گی ۔ آج رات آپ کو یہیں آرام کرنا ہوگا ۔ کل البتہ اس جنت کو جو دوزخ سے بھی بدتر ہے ۔ آپ خیر باد کہیں گے ۔ شاید آپ کو شہر میں جانے کی اجازت مل جائے ۔ اگر ایسا ہو ۔ تو ظہر کی نماز کے وقت آپ جامع مسجد کے صحن میں اس کے جنوب مغربی گوشہ پر کسی جگہ کھڑے ہو کر ایک بڈھے آدمی کے منتظر ہو جائیں ۔ اس کی ڈاڑھی مہندی سے سرخ رنگی ہو گی ۔ ایک عنابی رنگ کی عبا جس کی گوٹ نیلی ہوگی ۔ وہ پہنے ہوگا اور اس کے گلے میں ایک چاندی کا توڑا پڑا ہو گا ۔ جس وقت اس شخص کو آپ مسجد سے نکلتے دیکھیں ۔ اس کے پیچھے پیچھے ہولیں ۔ مگر تھوڑے فاصلے سے رہیں ۔ اس وقت میری مدد کرنے کی یہی ایک صورت ہے ۔ اچھا بس میں جاتی ہوں ۔ آپ یہاں آرام کریں ۔ اس شیشے کی صراحی میں تھوڑا سا ٹھنڈا شربت ہے اور تکیے سرہانے رکھنے کے لیے اور شال اوڑھنے کے لیے بھی وہاں موجود ہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ کھڑی ہوئی ۔ اب قاسم کو معلوم ہوا کہ وہ ایک نازک اندام ۔ خوش قامت اور خوش ادا نازنین ہے اور اس کا گورا رنگ ایوان کے سیاہ پردوں کے مقابل اور بھی میدہ وشہاب نظر آتا ہے ۔ کھڑے ہوتے ہی وہ کسی طرف غائب ہو گئی اور قاسم تنہا رہ گیا ۔ آگے بڑھ کر ایک محراب کے نیچے جا کھڑا ہوا ، باہر بالکل اندھیرا تھا ، ہوا بند تھی ، باغ میں پتا تک نہ ہلتا تھا ۔ کچھ دیر تک پری کے خیال میں رہا ۔ ارادہ ہوا کہ اُسے تلاش کرے ۔ یا نام لے کر پکارے ۔ مگر دل نہ چاہا ۔ اس پر قاسم کو تعجب سا ہوا کہ کچھ دیر پہلے اسی پری نے اس کے دل پر بالکل قبضہ کر لیا تھا ، لیکن اب اس کی طرف طبیعت مائل نہیں پاتا ۔

صرف ایک بات اُس کی البتہ بار بار یاد آتی رہی ۔ یعنی وہ اس کا مُٹھیاں باندھ کر قاسم کے سینے پر زور دینا اور پھر عاجزی کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنا اور رونے میں سکیوں کی آواز جو اس کے جاتے ہی اندھیرے میں سنائی دی تھی ۔ مگر یہ دوسری صورت جو بعد کو دیکھی تھی ۔ اس نے دل کی کیفیت کچھ اور ہی کر دی تھی ۔ کافر ہونے میں اس کے ، کیا شبہ تھا مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی مدد کرنے کے لیے دل ایسا کیوں بیقرار ہے ۔ اسی فکر میں تھا کہ کچھ ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے لگے ، تھکن معلوم ہوئی ۔ ایک دن اور ایک رات عجیب عجیب واقعات دیکھنے پڑے تھے ۔ حلق میں کانٹے پڑے جاتے تھے ۔ سر میں چکر تھا ۔ صراحی جس میں ٹھنڈا شربت

تھا۔ منہ سے لگا کر دو چار گھونٹ پیے اور سونے لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کیں۔ مگر فرنگن کی وہ آسماں گوں آنکھیں نیلم کے آبگینے خیال سے دور نہ ہوئے۔ کسی طرح اسے بچانا چاہیئے۔ کوئی صورت تو ایسی نکلے کہ اس بدہیئت و بدخو موذی گدھ کے چنگل سے جو قلۂ کوہ پر بیٹھا شکار تا کا کرتا ہے۔ اس معصوم کو نجات مل جائے۔ اس خونخوار اور منحوس شیخ کے خیال سے دل میں ایک نفرت اور کراہت پیدا ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ سوتا کچھ جاگتا تھا کہ شیخ کی صورت خود بخود سامنے آ گئی۔ دیکھا کہ اپنے ایوان میں مسند پر بیٹھا ہے۔ وہی خبیث صورت ہے۔ وہی ٹیڑھی ناک۔ شکرے کی سی چونچ منہ پر رکھی ہے اور آنکھیں گورستان کی دھنسی ہوئی قبریں تنگ پیشانی کے نیچے کچھ کچھ چمک رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہی منحوس دیدے۔ ایذا رسانی کے آلے زیادہ واضح اور روشن دکھائی دینے لگے۔ قاسم سوچنے لگا کہ جہاں اور بہت سے ڈراؤنے خواب دیکھے تھے۔ یہ بدبخت صورت بھی ذہن سے کیوں زائل نہیں ہو جاتی۔ مگر وہ ظالم خونی نگاہیں کسی طرح اس پر نہ ٹلتی تھیں اور اب قاسم کو محسوس ہوا کہ اسی قالین پر بیٹھا ہے۔ جو شیخ کے ایوان میں پہلے بچھا دیکھا تھا۔ وہی سرخ گلابوں کا حاشیہ ہے اور متن پر وہی سوسن کے زرد پھول ہیں۔ سونے کے فتیل سوز پر برنجی چراغ دھیما دھیما جل رہا ہے اور پردوں کی جھریوں سے صبح کی کچھ کچھ روشنی اندر آنی شروع ہوئی ہے۔

شیخ الجبل نے قلم اُٹھا کر کچھ لکھنا شروع کیا۔ قاسم مبہوت نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور دل سے سوال کرتا تھا کہ اس وقت جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہ خواب ہے۔ یا اس سے پہلے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ خواب تھا۔ آخر حالت واقعی کونسی تھی۔ اس وقت کا نقشہ تو ایسا اصلی نظر آ رہا ہے کہ وہ کسی طرح خواب نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز وہی ہے۔ جس طرح پہلے دیکھ گیا تھا۔ گویا بیچ میں کہیں گیا ہی نہ تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب شروع رات تھی۔ اور اب صبح ہونے کو ہے۔ یقینی بیچ میں جو کچھ دیکھا وہ خواب تھا۔ مگر اس بات کو بھی دل قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ گوری گوری پاکیزہ صورت جو دیکھ چکا ہوں۔ ہرگز خواب وخیال نہ تھی۔ وہ تو اصلی صورت تھی۔

شیخ نے لکھنا بند کر کے نظر اُٹھائی اور اب ایک دفعہ پھر اس کی تیز نگاہ قاسم کے سینے کو چھیدنے لگی۔

شیخ نے آہستہ کہا ’’کیوں کیا دیکھا؟‘‘

قاسم نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ’’چند عجائبات دیکھے۔ یہ خبر نہیں کہ وہ خواب تھے یا

واقعہ تھے"۔

شیخ: "خواب نہیں ہو سکتے۔ آخر تم نے کیا دیکھا؟"

قاسم: "ایک باغ دیکھا جس کو کسی نے بتایا۔ کہ جنت ہے"۔ آگے یہ کہنا درست نہ سمجھا کہ کسی نے اُسے دوزخ بھی بتایا تھا۔ کیونکہ یہ قول اُس فرنگن کا تھا۔ ایسی کوئی بات کہنے میں اس کی ملاقات کا حال کھلتا تھا۔ جس کا پوشیدہ رکھنا ضروری تھا۔

شیخ نے قاسم کا خواب سن کر کہا۔ "ہاں وہ جنت تھی۔ جس کی آرزو میں ہمارے ارادت مند بڑی بڑی جانبازیاں کرتے ہیں۔ وہ تم نے ابھی دیکھ لی۔ جب کوئی مومن ہمارے طریقے میں شامل ہوتا ہے۔ تو اسی جنت کا وعدہ اس سے کیا جاتا ہے۔ چاہے وہاں داخل ہونا آج نصیب ہو۔ چاہے کل۔ چاہے برسوں کے بعد مگر ہمارے ہر مرید کا یہی آخری مقام ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا"۔ یہ کہہ کر شیخ چپ ہوا اور قاسم کی صورت غور سے دیکھ کر بولا۔ "کیا تم ہمارے طریقے میں آنا چاہتے ہو؟"

اس سوال کے سنتے ہی قاسم کے دل میں معاً یہ خیال گذرا کہ اگر اس طریقہ میں شامل ہو گیا۔ تو پھر ان کے راز و اسرا سب دریافت ہو جائیں گے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ ان رازوں کو معلوم کرنے کیا قیمت ادا کرنی ہو اور کیسی کیسی خوفناک خدمتیں اس پر فرض کر دی جائیں۔ مگر جلدی جلدی سوچ کر یہی فیصلہ کیا کہ شامل ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ شیخ سے پوچھنے لگا۔ "وہ کیا شکل ہو سکتی ہے کہ میں اس طریقہ میں شامل ہو جاؤں"۔

شیخ الجبل نے جواب دیا۔ "نہایت آسان شکل ہے۔ ایک قسم تم کو کھانی پڑے گی۔ قسم کھانے پر کُل راز تم پر افشا کر دیئے جائیں گے"۔

قاسم سمجھا کہ منزل مقصود اب قریب ہے، لیکن ایک اور خیال بھی اس کے ساتھ آیا۔ جس نے دل کو بے چین کر رکھا تھا۔ وہ یہ کہ رازوں کو دریافت کرنا ہی اب اس کی خدمت نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز اور اس پر فرض ہو گئی ہے۔ کیا ان ملحدوں کے طریقے میں شامل ہونے سے اس دوسرے فرض کے ادا ہونے میں بھی آسانی ہو جائے گی؟ بہر کیف اس شرکت کے مضمون پر شیخ کے سامنے زیادہ شوق ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کسی قدر تامل کے بعد کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ جو قسم آپ مجھ سے لیں گے۔ وہ کس طرح کی ہو گی"۔

شیخ: "وہ قسم تم کو اس بات کا پابند کرے گی کہ ہمارے طریقے کے جس قدر قواعد و قوانین ہیں۔

ان پر ہمیشہ عمل کرتے رہو"۔

قاسم نے دل میں کہا کہ یہ کمبخت قواعد وقوانین بھی ایسے ہونگے جن میں قتل کرنے کی پہلے ہی سے اجازت ہوگی۔ یا شیخ کو اختیار دیا گیا ہوگا کہ جس کے قتل کا چاہے۔ حکم دیا کرے۔ قاسم اس خیال سے لرز اُٹھ، لیکن حصول مقاصد کی آرزو غالب ہوگئی اور جب کوئی دوسرا پہلو نظر نہ آیا۔ تو کہا "مجھے منظور ہے"۔

اتنا کہتے ہی قاسم کو اپنے والد کی نصیحتیں قسم کھانے اور ان پر قائم رہنے کے بارے میں یاد آئیں اور جونہی شیخ نے قالین پر سے ایک کتاب اٹھائی۔ قاسم سرد ہوگیا۔ کتاب کے اٹھاتے ہی اس کے نیچے ایک سرخ وسپید دستہ کا خنجر رکھا نظر آیا۔ اب قاسم کی حالت اور بھی اضطراب اور پریشانی کی ہوئی۔ نیم بیہوشی کی حالت میں معلوم ہوا کہ کسی نے وہ کتاب اس کے ہاتھ پر رکھ دی ہے اور اب شیخ الجبل نے بھاری آواز میں جو قاسم کو بہت دُور کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ یہ الفاظ نہایت ظلم و بے دردی کے لہجے میں کہے۔ "تم اس کتاب پر جو کلام اللہ ہے۔ اس بات کی قسم کھاتے ہو کہ آج سے تم حلقۂ حشیشین میں داخل ہو کر ہمیشہ اس کے نہایت سچے اور وفادار خادم رہو گے اور ہمارے حکموں کو خواہ وہ تمہارے عزیز سے عزیز دوستوں یا تمہارے ماں باپ یا اولاد یا خود تمہارے قتل کی نسبت نافذ ہوں۔ ہمیشہ تعمیل کرو گے اور تم ہمارے فدایان طریقت کی امداد میں کوئی امر فرد گذاشت نہ کرو گے اور کبھی کسی متنفس سے سوائے ان کے جو ہمارے طریقہ میں شامل ہیں۔ اُن رازوں کو افشانہ کرو گے۔ جو ہم تم پر ظاہر کرنے والے ہیں۔ اگر ان حکموں میں سے تم ایک حکم کی بھی نافرمانی کرو گے۔ تو پھر موت تمہاری سزا ہوگی اور اس زندگی میں تمہارا انجام آگ میں جلنا اور اذیت میں مبتلا رہنا ہوگا اور مرنے کے بعد دوزخ کے ساتویں طبقے میں تم پڑے آہیں بھرتے رہو گے"۔

قاسم یہ جملے سُن کر کانپنے لگا، لیکن قسم سے اب کیونکر پھر سکتا تھا۔ اس کے معنی موت یا موت سے بھی بدتر جیتے جی تکلیفوں اور اذیتوں کے تھے، شیخ الجبل نے یہ جملے ٹھہر ٹھہر کر بار بار کہے تھے اور جس طرح وہ کہتا تھا۔ اسی طرح قاسم ایک ایک لفظ کو دُہراتا جاتا تھا۔

اب کچھ دیر شیخ الجبل خاموش رہا۔ اس کے بعد پھر تقریر شروع کی۔ اس مرتبہ اس کی آواز قاسم کو بہت قریب اور ہیبت ناک معلوم ہوئی۔ شیخ نے کہا۔ "اس قسم کو ہمیشہ یاد رکھنا اور کبھی اس بات کو نہ بھولنا کہ تمہارے گرد وپیش ہر وقت اور ہر آن آنکھیں۔ کان اور خنجر موجود رہیں

گے، یاد رکھو، کہ خدائے واحد نے جو اپنی مخلوق کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ تمہاری قسم سُن لی ہے اور کاتبان عرش اس کو تحریر میں لے آئے ہیں''۔ اتنا کہہ کر شیخ خاموش ہو گیا۔ صبح کی روشنی جو کمرے میں آنی شروع ہو گئی تھی۔ پھر ظلمتِ شب ہو گئی۔ چراغ کو لو اُٹھی اور جھلملا کر بجھ گئی اور اب ایک وقفہ نہایت سکوت اور خاموشی کا پیدا ہوا۔ جس کے بعد یکایک بجلی کا کڑکا اس زور کا ہوا کہ سارا ایوان لرز گیا۔

شیخ نے کہا۔ ''دیکھو کارکنانِ قضا نے تمہاری قسم لکھ کر اس کا اعلان کر دیا۔ اچھا۔ اب ہمارے راز و اسرار سنو۔ انجم افلاک سے بھی دُور اور اس کون و مکان کی مشتعل دیواروں سے بھی ماوراء ہمارے اسرار۔ ہمارے نیک صلے اور ہماری سزائیں پوشیدہ ہیں۔ کون ہے جس کے گلے میں فنا کا پیرہن ہو اور وہ عرش بریں کا پردہ اُٹھا کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جو دین میں راسخ ہیں۔ وہ ہی مستحق انعام ہیں اور وہی ہمارا وہی سمجھنا چاہئے جو وحی کے ذریعے کتاب اللہ میں اُترا ہے۔ یعنی خدائے وحدہٗ لاشریک پر۔ اس کے ملائکہ پر۔ اس کی کتاب اور اس کے انبیا پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ قیامت، حشر ونشر اور تقدیر کے قائل ہیں۔ بس یہی باتیں جاننے کی ہیں اور انسان کے علم کے لئے کافی ہیں، لیکن میں وہ امام موعود ہوں۔ جس کے آنے کی پہلے سے خبر دی گئی تھی۔ عرش کے پردے میرے لئے اٹھا دیئے گئے تھے۔ تاکہ میری آنکھیں وہاں کے رازہائے پنہاں سے آشنا ہو جائیں۔ میں حقیقت کو دیکھ چکا ہوں اور وہ یہ ہے۔ کہ دنیا کو ایک داغ لگ گیا ہے اور وہ بڑھتا جاتا تھا۔ بڑے بڑے مقامات خون میں رنگے ہوئے ہیں اور اسلام میں فتنے برپا ہیں۔ سلطنتوں کے بادشاہ عدل وانصاف کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور گلشن توحید سے گمراہ ہو کر خارستان کفر د بت پرستی میں پہنچ گئے ہیں اور مومنوں کے خون ناحق سے ان کے ہاتھ سرخ ہو رہے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں صرف میں ایک متنفس ہوں۔ جو مجروحین ناکردہ گناہ کی آہیں سنتا ہوں۔ یہ مجروح اور مقتول انتقام کے لئے آہ وزاری کر رہے ہیں اور صرف انہی کی آواز ہے۔ جو ہر وقت میرے کانوں میں رہتی ہے۔ اس خاکدان ظلمت میں صرف میں ہی ایک انسان ہوں۔ جو ایک اولاد آدم کے بے انصافیوں اور دوسری طرف غضب الٰہی کے درمیان کھڑا مخلوق کی حفاظت اور اصلاح کا خواہاں ہوں، پس وہی لوگ جنہوں نے دین کے چشمۂ مصفا کو گدلا نہیں کیا ہے۔ مجھ سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میں ہی اکیلا وہ شخص ہوں۔ جو چراغ ہدایت بن کر گمراہوں کو ظلمت سے روشنی میں لا سکتا ہوں۔

پس اگر تم اپنی عاقبت اچھی چاہتے ہو۔تو میری فرمانبرداری کرو اور جو لوگ ہمارے حلقہ میں نہ ہوں۔ان کو دشمن دین و ایمان سمجھو،تمہارا پہلا اور سب سے ضروری فرض یہ ہے کہ دنیا کے جس قدر بادشاہ ہیں۔ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دو اور ان کی سلطنتوں کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دو۔ اس طریقہ سے ہمارا دائرہ اقتدار بڑھتا جائے گا اور دنیا کی تمام قومیں ہمارے دامن کرم میں پناہ لے کی اپنی عاقبت درست کرلیں گی"۔

اس تقریر کے بعد شیخ چپ ہوا اور قالین پر سے سرخ وسپید قبضے والا خنجر اُٹھا کر قاسم کو دیا اور کہا! کہ یہ خنجر خدا کے نافرمانوں اور دنیا کے سرکشوں کے سینے میں اتار دینے کے لیے ہے۔خدا کرے کہ اس خنجر سے تم اکثر کام لو اور کبھی وار خالی نہ جائے۔اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھنا اور اب صرف دو باتیں اور بتانے کی رہ گئی ہیں۔پہلی بات تو وہ علامتیں ہیں۔جو فدائی ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔اب تم فدائیوں کی جماعت میں شامل ہو چکے ہو۔اس لئے وہ علامتیں تم کو معلوم رہنی چاہئیں۔اگر کوئی تم سے پوچھے کہ قلعہ اَلموت کے سات برج ہیں یا اَلموت کی جگہ دمشق۔یروشلم یا انطاکیہ کا نام لے۔تو جواب دینا کہ اَلموت کے سات برج ہیں۔ زمین و آسمان سات دن میں پیدا ہوئے ہیں۔قرآن پاک کی پہلی سورت میں سات آیتیں ہیں۔سات ہی آسمان اور سات ہی طبقے دوزخ کے ہیں۔سات ہی سیارے،اور سات ہی سمندر ہیں۔سُر بھی سات ہیں۔رنگ اور معدنیات بھی سات ہیں۔اس کے بعد اپنے خنجر کا قبضہ اُسے دکھانا اور وہ اپنے خنجر کا قبضہ تمہیں دکھائے گا۔پھر سمجھ لینا کہ تم دونوں فدائی ہو۔جن کا کام دنیا کو خرابیوں سے پاک کرنا ہے۔یا تم کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔تو اسی طرح تم دوسرے سے سوال کرنا اور اگر وہ جواب صحیح دے۔تو اُسے اپنے حلقے کا آدمی سمجھ لینا۔ایسے ہی اور چند اسرار ہیں۔جو تم پر رفتہ رفتہ روشن ہوتے رہیں گے۔مثلاً کسی قلعہ کی دیوار پر چڑھ جانا۔ کسی محفوظ خیمے میں جہاں پہرہ بیٹھا ہو۔آنکھ بچا کر داخل ہو جانا۔بادشاہوں کے بھرے دربار میں بغیر کسی کو معلوم ہوئے پہنچ جانا۔ان سب باتوں کی ترکیبیں جو ہمارے ہاں کے مخفی راز ہیں۔ تم کو معلوم ہو جائیں گے۔اچھا اب دوسری بات یعنی جو کام تمہارے سپرد کرنا ہے۔وہ کیا ہے؟ میں تم کو تین بڑی خدمتوں کے انجام دینے کی عزت بخشنی چاہتا ہوں۔گو تم ہمارے طریقہ میں ابھی شامل ہوئے ہو۔وہ خدمتیں یہ ہیں۔اچھی طرح سُن لو۔میرا ایک فرزند ہے،جس کا نام حسن ہے۔یہ ہمارے طریقے کا اور ہمارا بدخواہ ہوگیا ہے۔کل اُسے واصل جہنم کردو۔تم اور چند

اور فدائی تمہارے ساتھ کر دیئے جائیں گے۔ تاکہ اس کو بہت جلد جہنم میں جگہ مل جائے اور پھر ہمارے طبقے میں کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔ یہ تمہارا سب سے پہلا کام ہوگا۔ دوسرا کام اتنا بڑا نہیں ہے۔ وہ محض اس دنیا سے ایک کافر کو کم کرنا ہے۔ یہ اپنے ملک کا ایک بڑا نامی شہزادہ ہے اور اگر وہ زندہ رہ گیا۔ تو ایک دن مسلمانوں میں سخت قتل و غارت کا بازار گرم کر دے گا۔ تیسرا کام جو تم کو کرنا ہے وہ بڑا شاندار ہے۔ یعنی ہمارے سخت سے سخت دشمن کو ہلاک کرنا ہے۔ وہ درحقیقت ایک منافق ہے۔ مگر اپنے تئیں مومن کہتا ہے اور اسلام کے سچے حامیوں کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہے اور اب......'' شیخ اٹھا اور قاسم کو ایوان کے بالکل سرے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ نیچے شہر کی عمارتوں۔ میدانوں اور قلعے کی دیواروں اور برجوں پر دھوپ خوب کھلی تھی۔ برجوں پر پہرے والے بے حس و حرکت کھڑے تھے اور تیز روشنی میں ان کی قد آدم تصویر مطلع کے مقابل صاف نظر آتی ہیں۔ لباس ان کا بالکل ان جوانوں کا سا تھا۔ جو قاسم کو شہر سے گرفتار کر کے شیخ الجبل کے پاس لائے تھے۔ یہ پہرے والے یوں تو بالکل ساکت کھڑے رہتے تھے، لیکن تھوڑے تھوڑے مقررہ وقفے کے بعد اُن کو اپنا رُخ بدل کر شیخ کے ایوان کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔

شیخ نے کہا۔'' قاسم میں اب تم کو فدائیوں کی اطاعت اور فرماں برداری کی کیفیت دکھاتا ہوں''۔ اتنا کہنے کے بعد جونہی ایک پہرے والے نے رُخ بدل کر ایوان کی طرف دیکھا۔ شیخ الجبل نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کر اُس کی طرف کچھ اشارہ کیا۔ پہرے والا اشارہ دیکھتے ہی بلا تامل برج کے کنگورے پر چڑھا اور وہاں سے ہزار ہا گز نیچے غار میں کود پڑا۔ قاسم نے دیکھا کہ وہ برج کے کنگورے سے پہلے برج کی بنیاد تک اور پھر وہاں سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتا ہوا پہاڑ کی پوری بلندی سے نیچے بالکل غار کی تہ پر پہنچ گیا اور وہاں ہڈیوں اور گوشت کا ایک ڈھیر معلوم ہونے لگا۔

شیخ نے قاسم کی طرف دیکھ کر بہت ہی اطمینان خاطر سے کہا۔'' دیکھو یہ شخص صالحین کی اس جنت میں پہنچ گیا۔ جسے تم دیکھ چکے ہو۔ ایسے ہی ستر ہزار آدمی ہیں۔ جو میرا حکم ایک اشارہ پر اسی طرح بجا لانے کے لیے اس وقت موجود ہیں۔ ان سے بھی میں جنت کا وعدہ اسی طرح کر چکا ہوں۔ جیسا تم سے اس وقت کرتا ہوں''۔

آٹھواں باب

اَلموت کے شیخ نے قاسم کو رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔ قاسم جونہی ایوان سے باہر نکلا۔ تو ایک غلام نے جو منتظر کھڑا تھا۔ ایک بقچی قاسم کے حوالے کر کے کہا کہ ''اس میں آپ کی وردی ہے۔ جو کل صبح آپ کو پہننی ہوگی۔ اس سے پہلے اس کے پہننے کا حکم نہیں ہے''۔ اتنا کہہ کر غلام نے دو فدائیوں کو قریب بلا کر قاسم سے کہا۔ ''اب آپ جائیں۔ یہ دونوں فدائی آپ کو قلعے کے دروازے تک پہنچا دیں گے۔ اتنا ضرور خیال رکھئے کہ یہاں کی کسی بات کا ذکر زبان پر نہ آئے۔ کل نماز مغرب کے وقت آپ کو یہاں حاضر ہو جانا چاہئے۔ جس وقت آپ آئیں گے تو یہ دونوں فدائی آپ کو دروازے پر ملیں گے اور جو کام آپ کے سپرد ہوا ہے۔ اس کے متعلق ضروری ہدائتیں بھی آپ کو اُسی وقت دی جائیں گی''۔

قاسم قلعے سے نکل کر شہر میں آیا۔ بازاروں میں چہل پہل تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ قاسم کو ایسے عجیب وغریب واقعات دیکھنے پڑے تھے کہ ان کے بعد ان معمولی چیزوں کو دیکھ کر دل کو چین سا آیا اور بے اختیار جی چاہا کہ یہاں سے بھاگ کر سیدھا بغداد پہنچے اور وہاں اپنے والد سلیم کو شیخ الجبل کے حالات اور اس کی گفتگو سنائے۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی اس لعبت فرنگ کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ جس سے مدد کا وعدہ کیا تھا اور اب سب خیالات کافور ہو کر یہ فکر پیدا ہوا کہ بھاگنے سے پہلے اس کی مدد کرنی ضروری ہے۔ اگر وہ صورت محض ایک خواب کی تصویر تھی۔ تو اس کی حقیقت آج ظہر کے وقت معلوم ہو جائے گی۔ جامع مسجد میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ چلنا ہی اچھا ہوگا۔ اس میں باپ نے جو خدمت سپرد کی تھی۔ اس کے فرض سے بھی ادا ہو جاؤں گا۔ اگر یہاں قیام کیا۔ تو ایک بے گناہ کے قتل میں مجبوراً شریک ہونا پڑے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی شیخ کے سامنے کتاب اللہ پر جو قسم کھائی ہے۔ وہ یاد آئی اور یہ قسم ویسی ہی تھی۔ جس کی نسبت باپ کا

خاص حکم تھا کہ وہ کسی حالت میں نہ ٹوٹے۔ بہر حال یہیں رہ کر جو کچھ پیش آئے۔ اُسے دیکھنا چاہیئے۔ اگر واقعی قتل کسی دشمن دین کا ہے۔ تو کیا اس میں شرکت قابل ثواب نہ ہوگی؟ اسی غور فکر میں دفعتہً یہ خیال آیا کہ اگر بھاگنا چاہا بھی اور قسم توڑنے کی جرأت بھی کی۔ تو ہر وقت بہت سی آنکھیں ہیں۔ جو مجھے دیکھ رہی ہیں اور بہت سے قدم ہیں۔ جو میرے تعاقب میں ہیں اور کوئی در ودریچہ ایسا نہیں۔ جہاں لوگ میری تاک میں نہ بیٹھے ہوں۔ یہ بلائیں مجھے کب صحیح سلامت یہاں سے نکلنے دیں گی اور نکلا بھی تو فوراً قسم توڑنے اور حکم کے خلاف ورزی عمل کرنے کے جرم میں خدا جانے کس طرح بوٹیاں نوچ نوچ کر مجھے جان سے مارا جائے۔

پس یہ اچھی طرح سے سمجھ لیا کہ شہر سے نکلنا ممکن نہیں اور اب اس کی زندگی خطرناک سازشوں کے جال میں ایسی گرفتار ہوئی ہے کہ آخری انجام خدا ہی کو معلوم ہے۔ اسی فکر و تردد میں غلطان پیچان سرائے کے دروازے پر پہنچا۔ یہاں پہنچے پر جب یہ معلوم ہوا کہ نوکر چاکر، سواری کے جانور سب خیریت سے ہیں۔ تو نوکروں کو کسی کام پر ٹال کر صندوق کا قفل کھولا اور وہ خنجر جو صحرا میں ملا تھا اور ایک زرہ جو باپ نے چلتے وقت دی تھی، نکالی۔ زرہ کپڑوں کے نیچے پہن کر یہ خنجر شیخ کے دیئے ہوئے خنجر کے ساتھ پیٹی میں اس طرح لگا لیا کہ باہر سے نظر نہ آئے۔ یہ زرہ جو اس وقت پہنی تھی۔ بڑی صنعت کی چیز تھی۔ نرم اتنی تھی جیسے ریشم کا کپڑا ہو اور کڑیاں ایسی مضبوط تھیں کہ کسی ضرب سے بھی نہ کٹ سکتی تھیں۔ قاسم نے صندوق میں پھر قفل لگا دیا اور جب نوکر واپس آئے۔ تو ایوب طبیب کا مکان تلاش کرنے نکلا۔ مکان جب مل گیا۔ تو دروازے پر دستک دے کر اپنے دوست بہرام کا حال دریافت کیا۔ ایک بہت ہی مؤدب نوکر اندر سے نکلا اور قاسم کو اوپر کی منزل میں لے گیا۔ یہاں بہرام کمرے کے دریچے میں جس کے نیچے گھر کا پائین باغ تھا، بیٹھا تھا۔ اس باغ میں تھوڑے سے درخت پھلوں کے تھے۔ پھولوں کا موسم نکل چکا تھا۔ باغیچہ کے بیچ میں ایک چھوٹی سی نہر جا رہی تھی۔ کنوئیں پر رہٹ چلا کر اس نہر میں پانی آتا تھا۔ بعض کیا یوں میں جہاں اس نہر کا پانی زیادہ پہنچتا تھا۔ دو چار درختوں میں پھول بھی کھلے تھے۔

بہرام اس وقت کھڑکی میں آرام سے بیٹھا سیٹی بجا رہا تھا۔ قاسم کو دیکھتے ہی اُچھل پڑا۔ دوڑ کے گلے ملا اور کہنے لگا۔ "مرحبا۔ مرحبا میرے محسن۔ میرے مسیحا۔ مرحبا۔ یہ رخ روشن۔ یہ روئے تاباں کیوں مجھ سے چھپا لیا تھا۔ آنکھوں میں دنیا تاریک کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ

گردوں پر خورشید نہ رہا اور پیمانہ شراب سے خالی ہو گیا۔ اس وقت بھی غم فرقت میں چند اشعار سوچ کر اپنی آہوں کا دھواں عرش بریں تک پہنچا رہا تھا۔ سبحان اللہ کیا کیا مضامین وارد ہوئے ہیں۔ عرض کرتا ہوں کہ یہ صدمۂ مفارقت وہ ہے۔ جس نے صحرا میں ریگ رواں کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیئے اور آسمان پر چشم کواکب کو بھی اشکبار کر دیا۔ آپ کے انتقال پُر ملال بلکہ مرگ مفاجات کو صنعت تشبیہ میں عرض کیا ہے کہ دائے برحال ما۔ ژالۂ برف بار نے غنچۂ سون کو کھلنے نہ دیا اور گلشن خوبی کا۔ بلبل گربۂ نابکار کے ہاتھوں طعمۂ اجل ہو گیا یا یہ کہ آپ کی جدائی نہ ہوئی۔ میری خوش دامن صاحبہ کے بے وقت موت ہو گئی۔ یہ آخری تشبیہ محض کنایہ کے طور پر لایا ہوں کہ مضمون گرنے نہ پائے۔ اب بفضلہٖ آپ کا دیدار ہو گیا۔ ارادہ ہے کہ تھوڑی سی ترمیم کے بعد ان اشعار کو خوش دامن صاحبہ نامبردہ کا نوحہ بنا دوں اور خسر صاحب کی خدمت میں روانہ کر دوں۔ وہاں بھی یہ کلام آنسوؤں کا دریا بہا دے گا، لیکن یہ سیل اشک منت گذاری کا ہوگا۔ کیونکہ مرحومۂ نامبردہ کی زندگی سب کے لئے ایک وبال جان تھی''۔

یہ کُل جملے بہرام نے ایسی تیزی و روانی کے ساتھ کہے کہ قاسم حیران اس کی صورت دیکھتا رہ گیا اور بہت دیر کے بعد یہ دریافت کر سکا کہ ایوب کا مزاج اب کیسا ہے۔ اور ان کو کیا مرض ہوا تھا۔

بہرام نے جواب دیا۔ ''ایوب میں کچھ باقی نہ تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی جب سنا کہ حالت نازک ہے۔ فوراً مریض کے بالین پر پہنچ کر اپنی غزل کے چند اشعار گانے شروع کئے۔ پھر کیا تھا۔ ذرا غور فرمایئے۔ سحر خوش نوائی کی یہ ایک جدید مثال ہے۔ دو چار ہی بول مریض کے کانوں تک پہنچے تھے کہ دفعتہً وہ لیٹے سے اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔ میں بالکل تندرست ہوں اور اپنے روزمرہ کے کاروبار میں مصروف ہونا چاہتا ہوں۔ صورت سے یہ معلوم ہونے لگا کہ کبھی بیمار ہی نہ ہوا تھا۔ بستر سے اُٹھ کر فوراً اپنے مریضوں کو دیکھنے چلا گیا۔ مرض نے مطلق عود نہیں کیا۔ غرض میرا وقت پر پہنچ جانا بہت غنیمت ہوا۔ آیئے میں آپ کو اپنے دوست سے ملاؤں۔ کھانے کا وقت بھی قریب ہے''۔

ایوب ایک قد آور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ ڈاڑھی لمبی اور چہرہ عبوس تھا۔ جس سے مزاج میں سختی ظاہر ہوتی تھی۔ اپنے دوست بہرام کے محسن سے وہ بہت خاطر و مدارات سے ملا، لیکن چہرے سے کوئی خوش دلی ظاہر نہ ہوئی۔ بلکہ جب سب لوگ دسترخوان پر بیٹھے۔ تو بہرام

کی باتیں ایوب کو کچھ ناگوارسی گذرتی معلوم ہوئیں۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے دوپہر کا وقت آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ قاسم نے اُٹھ کر کہا'' جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا قصد ہے۔ فرصت ہوئی تو پھر حاضر ہوں گا''۔ قاسم کے اس زہد وورع پر بہرام معترض ہو کر بولا'' جو شخص صبح شراب پیتا ہے۔ وہ اس پھول کی مثال ہوتا ہے جو خوشبو سے معطر اور شبنم میں تر کسی چمن میں کھلتا ہے، لیکن جو صبوحی سے پرہیز کرے، اور ظہر پڑھنے جائے۔ اس کی مثال ایسے سائل کی ہے۔ جو کسی بڑے آدمی کے سامنے بغیر منہ دھوئے عرضی پیش کرنے چلا آئے''۔

ایوب نے بہرام کے اس خیال کی نہ تائید کی۔ نہ تعریف۔ جب قاسم اُٹھ کر چلنے کو ہوا۔ تو بہرام دروازے تک ساتھ آیا اور کہنے لگا'' قاسم یہ بات تم سے کہنی ضروری ہے کہ اس شہر کی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ قارون کا خزانہ بھی اگر پاس ہو تو بھی شراب کا ایک چلّو مول کو نہیں مل سکتا۔ یہاں تو بس ایسے ہی زاہدانِ خشک کا گذر ممکن ہے۔ جیسے ہمارے دوست ایوب ہیں۔ سادہ پانی پیتے پیتے جگر خراب ہو گیا ہے۔ اگر سادہ پانی سے بہتر کسی عرق ءنے یہاں کی گرد کو میرے حلق سے نیچے نہ اُتارا۔ تو اندیشہ ہے کہ یہ نور کا گلا بیکار ہو کر میرے کمال میں فرق پیدا کردے۔ بس یہی قصد ہے کہ اپنے دُرہائے مضامین کے لئے کہیں اور جا کر خریدار تلاش کروں۔ اگر آپ کی بھی معیت ہو۔ تو دونوں کے حق میں مفید ہو۔ میں آپ کو اپنے نغموں سے مسرور کرتا رہوں اور آپ تلوار سے میری جان کی حفاظت کریں''۔

قاسم نے بہرام کا یہ قصد جس کے تمام فوائد یک طرفہ تھے۔ کچھ بہت توجہ سے نہ سنا۔ بہرکیف اتنا ضرور کہا کہ'' آپ کے جانے سے پہلے انشاءاللہ ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوگی۔ اس وقت البتہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں۔ اس پر غور ہو سکے گا''۔ اتنا کہہ کر قاسم رخصت ہوا، لیکن مسجد کی طرف جب چلا۔ تو خیال آیا کہ اگر اب پھر بہرام کی صورت دیکھنے میں آئی۔ تو ایک تعجب کی بات ہوگی۔ افسوس تقدیر نے اپنی کمند پھینک کر اس کو گھسیٹنا شروع کر دیا ہے اور خدا جانے اب اس کے قدم کن خطروں اور پیچیدگیوں کی طرف جا رہے ہیں۔

شہر اَلموت کی جامع مسجد ایک وسیع چوک کے سامنے تھی۔ جس کے تین طرف سرورختیاں تھیں۔ مسجد کے دروازے میں بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچنا ہوتا تھا۔ عمارت کچھ سیاہی مائل رنگ کے پتھر کی تھی۔ دروازے میں داخل ہوتے ہیں صحن آتا تھا اور صحن کے سامنے مسجد کے دالان اور دالانوں کے باہر دونوں پہلوؤں پر دو اونچے مینار تھے۔ تمام عمارت پر دہری پارسائی

برس رہی تھی۔ جو ایوب کے چہرے پر تھی۔ قاسم سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہوا۔ حوض کے کنارے بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ نمازیوں کا ہجوم دل پر اثر کرتا تھا۔ مگر وہ اس وقت بھی اپنے ہی خیالات میں مستغرق تھا اور سوچتا تھا کہ اب کچھ دیر میں یہ عقدہ حل ہو جائے گا کہ باغ میں جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ محض خواب وخیال تھا۔ یا واقعی وہ گوری گوری صورت کوئی اصلیت رکھتی تھی اور درحقیقت مبتلائے الم تھی۔ وہ محض خواب وخیال تھی۔ تو پھر اس کی مدد کرنی ایک بے معنی چیز ہے۔ جسے ترک کر دینا چاہئے۔ اس کے بعد اگر کوئی مجبوری رہ جاتی ہے۔ تو وہ قسم ہے۔ جو کتاب اللہ پر اس سے لی گئی ہے۔ اگر یہ مجبوری بھی نہ رہے۔ تو پھر اس شہر سے نکل کر بغداد کا رستہ اختیار کرنا چاہئے۔ تاکہ جو کچھ حالات دریافت ہوئے ہیں۔ اپنے باپ سے عرض کرے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور بہن خجستہ کو دیکھ کر کیسا دل خوش ہوگا۔ خجستہ کے ساتھ پھر چوگان کھیلوں گا۔ آسائش کا مکان ہوگا۔ اچھے اچھے کھانے کھانے میں آئیں گے اور دل کو اطمینان رہے گا کہ جو خدمت سپرد ہوئی تھی۔ وہ خیر وخوبی سے انجام پا گئی۔ ان تمام خیالات سے دل بہت خوش ہوتا تھا، لیکن قلب کے سب سے پوشیدہ پردے سے یہی آرزو نکلتی تھی کہ ایسا نہ ہو۔ تو بہتر ہے اور آرزو یہی تھی۔ مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔

غرض اسی فکر وتشویش میں وضو کر کے نمازیوں کی بھیڑ میں سے گذرتا ہوا مسجد کے جنوب مغربی گوشہ پر پہنچا اور وہاں ایک جگہ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ لوگ مسجد میں اس کثرت سے تھے کہ کسی کا پتا چلانا مشکل تھا۔ گو سرخ ڈاڑھی ایسی علامت تھی۔ جس کے جلد نظر آ جانے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اس اثنا میں نماز شروع ہو گئی۔ قاسم فوراً شریک ہوا اور ختم نماز پر جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ تو اُسی صف میں جس میں خود تھا۔ قریب ہی ایک سرخ ڈاڑھی کی سی جھلک نظر آئی۔ نمازی اُٹھ کر باہر جانے لگے۔ سب سے اخیر میں وہ مرد ضعیف بھی اُٹھا۔ جس کی ڈاڑھی مہندی میں رنگی ہوئی تھی اور جو عنابی رنگ کی عبا جس کی گوٹ نیلی تھی۔ پہنے تھا اور گلے میں چاندی کی ایک زنجیر تھی جس میں ایک بڑا سا تعویذ لٹک رہا تھا۔ اُٹھ کر دروازے کی طرف آہستہ قدم چلا۔ قاسم کو اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اسے کے سینے میں ایک دل کی جگہ دو دل ہو گئے ہیں۔ ایک خوش ہوتا ہے اور دوسرا پوچھتا ہے کہ خوش کیوں ہوتے ہو اور اب یہ حالت سخت تکلیف دہ تھی کہ ایک طرف عقل اور دوسری طرف کوئی قوت جس کا مقابلہ ممکن نہیں۔ آپس میں دست وگریباں ہیں۔

وہ مردِ مُسن نیچی نظریں کئے مسجد کی سیڑھیوں سے اُترا۔ قاسم کسی قدر فاصلے سے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا اور یہ دونوں بازار میں سے نکل کر شمال کی سمت میں اس پہاڑ کی طرف جاتے نظر آئے۔ جس پر اَلموت کا قلعہ واقع تھا۔ جب بڈھے آدمی نے اَلموت والے پہاڑ کا قصد کیا۔ تو قاسم کو وہم ہوا کہ ضرور اس وقت کوئی نیا فریب کیا جا رہا ہے اور یہ کارروائی بھی شیخ الجبل نے اس امتحان لینے کے لے کی ہے۔ ابھی تک موقع ہے۔ یہیں سے بغداد کا رستہ لوں۔ یہ سوچتے ہی شیخ کی بے رحم صورت اور حلقے میں دھنسے ہوئے دِیدوں اور ان تکلیفوں اور ایذاؤں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ جو عدول حکمی کی حالت میں شیخ نے نہایت ظالمانہ لہجے میں پہلے ہی بیان کر دی تھیں۔ جی چاہا کہ آدمیوں کی بھیڑ میں غائب ہو جائے۔ چلتے چلتے ٹھہرا اور قدموں نے بھاگنے کا قصد بھی کیا کہ ایک دوسرا نقشہ آنکھوں کے سامنے آیا اور وہ یہ تھا کہ ایک نازک ونحیف حسین چہرہ سامنے ہے۔ جس پر ہمت اور استقلال برس رہا ہے۔ مگر آنکھیں عاجزی کے ساتھ رحم کی طالب ہیں۔ فوراً سمجھ میں آیا یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے۔ کوئی فریب اور دھوکا نہیں ہے۔ اب قاسم نے دل کی اُن صداؤں کو جو خطرے سے بچنے اور احتیاط کی نصیحت کر رہی تھیں۔ خاموش کر دیا اور اس مرد سرخ ریش کے پیچھے پیچھے بدستور چلنے لگا۔

رفتہ رفتہ دونوں اس پہاڑ کے نیچے پہنچے۔ جس پر اَلموت کا قلعہ تھا۔ یہاں سے وہ پیر مرد بائیں ہاتھ کو مُڑا اور کچھ دُور تک پہاڑ کے نیچے اس کی گولائی کو طے کر کے اُس نے پھر اپنا رُخ بدلا اور اب دائیں ہاتھ کو مڑ کر پہاڑ کے گوشے کو ختم کر کے ایک ایسے تنگ راستے پر چلنے لگا۔ جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ یہ راستہ پہلے تیز چڑھائی کا تھا۔ پھر چڑھائی کم ہو گئی تھی۔ اب یہ لوگ قلعہ اَلموت کی پشت پر آ گئے اور اس مقام سے قریب ہوتے گئے۔ جہاں پہاڑی سلسلے میں ایک درہ اور درختوں کا ایک بڑا جھنڈ تھا اور ایک رنگین غبار ایسا نظر آتا تھا۔ جیسے کوئی پھول باغ دور سے دکھائی دیتا ہو۔ اس سے آگے پہاڑ گھاٹی سے اُٹھ کر اس طرح اونچا ہوا تھا کہ اس پر چڑھنا ممکن نہ تھا۔ جس راستے پر اس وقت یہ لوگ چل رہے تھے۔ وہ شہر کی سطح سے بلند ہونے کے بعد بہت دشوار گذار اور پیچیدہ ہوتا گیا تھا۔ راستے کے ایک طرف اتنا نیچا کھڈ تھا کہ دیکھے سے چکر آتا تھا اور دوسری طرف پہاڑ بالکل دیوار کی طرح اونچا اُٹھا چلا گیا تھا۔ قاسم نے بہر کیف اس کھڈ میں نیچے کی طرف دیکھا اور فوراً اُدھر سے نظر پھیر لی۔ کیونکہ جو پہرے والا فدائی شیخ کے حکم سے برج پر سے نیچے کودا تھا۔ پہاڑوں کی ٹکر سے اس کی لاش ٹکراتی ہوئی اس طرح

کھڈ میں پہنچی تھی کہ ہڈیوں کی ڈھیریوں اور گوشت کے لوتھڑے جا بجا نیچے کی چٹانوں پر بکھرے پڑے تھے۔ جب ادھر سے کر نظر اونچی کی۔ تو دیکھا کہ پہاڑ کے اوپر جس کی شکل خود ادھر دیوار کی سی تھی۔ قلعہ الموت کی دیواریں سیدھی اور بلند قائم ہیں۔ اب چلتے چلتے یہ تنگ اور دشوار راستہ یک بیک اس طرح ختم ہوا کہ ایک بلند اور چکنا پہاڑ اس کے سامنے آ گیا۔ قاسم اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے نظر کی۔ تو وہ پیر مرد بھی جس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ غائب ہو گیا اور قاسم اب راستہ پر بالکل تن تنہا رہ گیا۔ بڈھے کے غائب ہونے کے معنی سوائے اس کے کیا ہو سکتے تھے کہ کھڈ میں کود پڑا ہوگا۔ مگر وہ ایک بڑا بزرگ صورت آدمی تھا۔ اس کی طرف سے ایسا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ خیال گذرا کہ یا تو یہاں کسی طلسم کا اثر ہے۔ یا کوئی فریب اور دھوکا خاص طور پر دیا جا رہا ہے۔

اب قاسم اس راستے میں جو پہاڑ کی گگر پر یہاں تک آیا تھا۔ بالکل مقید ہو گیا۔ چاروں طرف حیران ہو کر دیکھتا تھا اور کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ اتنے میں سامنے سے ایک ہلکی سی آواز سیٹی کی سنائی دی۔ قاسم اس آواز کی طرف چلا۔ آگے بڑھ کر جہاں راستہ بند ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ کو پہاڑ کے پہلو میں ایک شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف اس طرح گوشے میں واقع تھا کہ جب تک قریب نہ پہنچو نظر نہ آتا تھا۔ قاسم نے کمر سے خنجر کھول لیا اور اس شگاف میں سے سمٹ سمٹا کر بمشکل اندر پہنچا۔ آگے ایک سرنگ تھی۔ جہاں بالکل اندھیرا تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ کوئی آدمی آگے چل رہا ہے۔ قاسم اسی طرح خنجر ہاتھ میں لئے آگے بڑھا۔ اس آدمی نے ہاتھ اونچا کیا اور آہستہ سے سیٹی بجائی۔ اب اندھیرے میں ذرا نظر جمی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ وہی پیر مرد ہے۔ جو ابھی نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔ قاسم نے دبی آواز سے پوچھا کہ "آپ مجھے کہاں لئے جاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس دروازے کے کواڑوں میں جو بند تھے۔ مضبوط لوہے کے قبضے لگے ہوئے تھے اور اب اس سرنگ میں بھی آگے راستہ نہ تھا۔ پیر مرد آگے بڑھا اور جیب سے کنجی نکال کر دروازے کا قفل کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی یک لخت تیز روشنی ہو گئی اور قاسم نے زنجیروں کی چھن چھن سنی۔ اب یہ دونوں آدمی دروازے سے نکل کر روشنی میں آئے اور دیکھا کہ سرنگ سے نکلنے کے بعد وہی راستہ جس پر چل رہے تھے۔ اب پہاڑ کے دوسرے دامن سے ملا ہوا ہے۔ دروازے سے آگے قدم

بڑھاتے ہی زنجیروں کی آواز کا معمہ کھلا۔ دیکھا کہ دو بڑے بڑے خونخوار چیتے دروازے کے دونوں جانب زنجیروں سے بندھے ہیں۔ قاسم کو دیکھتے ہی دونوں نے جھپٹ کر ٹانگ پکڑنی چاہی مگر گلے کی زنجیروں نے وہاں تک پہنچنے نہ دیا۔ جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹے۔ دونوں بھوک سے بیتاب منہ پھاڑ پھاڑ کر دانت دکھاتے اور غُراتے تھے۔ بڈھے نے چمکار کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور دروازے کو ادھر سے مقفل کیا۔ چیتے بہت پیار اور اخلاص سے بڈھے کو لپٹنے لگے۔

اب یہ دونوں آدمی پھر پہاڑ کے دامن دامن راستہ چلنے لگے۔ یہاں اوپر کی طرف قلعہ اَلموت کی دیواریں۔ مورچے وغیرہ سب ختم ہو گئے تھے اور پہاڑ جن پر یہ قلعہ واقع تھا۔ ڈھلوان ہوتا ہوا درے تک چلا گیا تھا۔ درے کا دہن شہر سے اتنا چوڑا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جیسا کہ یہاں آ کر معلوم ہوا۔ سروں سے اوپر ایک بہت اونچی دیوار نظر آئی۔ جو قلعہ کے اختتام سے پہاڑ کے اوپر اوپر کھچی ہوئی تھی۔ یہ دیوار تھوڑی دُور جا کر ایک عمارت سے جا ملی تھی۔ جس میں بہت اونچی اونچی کھڑکیاں ادھر کو دکھائی دیتی تھیں۔ عمارت کے ختم سے وہی دیوار پھر شروع ہو کر نیچے درے تک چلی گئی تھی اور درے سے گذرتی ہوئی پھر اونچان پر آ کر اس کا سلسلہ کچھ دور تک جاری رہنے کے بعد دائیں ہاتھ کو دفعتہً مڑ گیا تھا۔ یہ دیوار جہاں بہت نیچی گئی تھی۔ اس سے بھی کہیں زیادہ نشیب میں وہ راستہ تھا۔ جس پر قاسم اس وقت چل رہا تھا اور یہاں سے دیوار اور عمارت تک پہاڑ کی بلندی ایسی دشوار گذار تھی کہ اس پر چڑھنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔

جب قاسم اور وہ مردِ مسن درے سے گذر لئے۔ تو راستہ چڑھائی کا ہو گیا۔ مگر چڑھائی ابھی تیز نہ تھی۔ اخیر میں البتہ پہاڑ بالکل سیدھا اور اونچا ہو گیا تھا اور اس کی چوٹیاں کنگرے دار ہو گئی تھیں۔ اب یہ لوگ اس مقام کے قریب آ گئے۔ جو درے سے ایک رنگین غبار سا معلوم ہوتا تھا اور جس کے بیچ میں پتھر کی ایک عمارت دور سے کوئی بھوری بھوری چیز معلوم ہوتی تھی۔ راستہ یہاں زیادہ عریض ہو گیا تھا اور اس کے دونوں طرف سرو اور صنوبر کے اونچے اونچے شاندار درخت تھے۔ اب یہ لوگ اس عمارت کے سامنے آئے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی منزل کی ہے۔ بہت سے کمرے برابر بنے ہیں اور ان سب کے سامنے ایک تنگ اور لمبا برآمدہ ہے۔ اب یہ لوگ بائیں ہاتھ کو مڑے اور ڈھلوان پہاڑ کے بالکل سرے پر پہنچ گئے۔ یہاں گلاب اور

اور بہت سے قسم کے پھولوں کے درخت تھے۔ سب میں بکثرت پھول کھلے ہوئے تھے۔ جہاں یہ پھولوں کے تختے انسان کی مشقت کے ثمرے ختم ہوتے تھے۔ وہیں سے خودرو پھولوں کا ایک جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ بلسان دریحان۔ اشبان وخربق کے پھولوں سے سارا میدان پٹا پڑا تھا اور ٹھیک اس مقام پر جہاں انسان کا لگایا ہوا باغ ختم ہو کر قدرت کے لگائے ہوئے پھولوں کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا، جوان تھا۔ مگر قاسم سے عمر زیادہ نہ تھی۔ رنگ گورا تھا۔ مگر زردی مائل۔ نقشہ چہرہ کا بہت پاکیزہ تھا۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا شاعر یا فلسفی ہے۔ ان لوگوں کو جب اس نے دیکھا تو گھاس کے تختے پر جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں سے اٹھا نہیں۔ مگر صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ قاسم کے انتظار میں تھا۔ قاسم جب قریب پہنچا۔ تو اس نے غور سے دیکھ کر کہا۔ ''آپ لاطینی زبان جانتے ہیں۔ یعنی بلاد مغرب کے شہر روما کی زبان سے واقف ہیں؟''

قاسم کو اس سوال پر اس قدر تعجب ہوا کہ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ گردن ہلا دی۔ جس کے معنی تھے کہ نہیں جانتا''۔

نوجوان شخص: ''لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ شہر روما سات پہاڑوں پر واقع ہے؟ قاسم کو اس سوال پر بھی تعجب ہوا۔ مگر فوراً کوئی بات یاد آئی اور جلدی سے کہا۔ ''ہاں اور قلعہ اَلموت کے ساتھ برج ہیں اور دنیا سات دن میں پیدا ہوئی ہے...........''

نوجوان شخص: ''بس بس۔ آگے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے''۔ یہ کہہ کر دونوں نے اپنی اپنی کمر سے خنجر تھوڑے تھوڑے سے اوپر کو اس طرح نکالے کہ ان کے قبضے کا رنگ معلوم ہو جائے۔

قاسم سمجھا کہ اب ضرور کسی مشکل معاملے پر گفتگو ہوگی، لیکن اُس نوجوان نے دوسرا سوال جو کیا۔ وہ بھی کچھ کم عجیب نہ تھا۔ پوچھنے لگا: ''آپ یونانی زبان جانتے ہیں؟''

اس سوال کا جواب قاسم نے کسی قدر خودداری سے دیا کہ ''میں یونانی نہیں جانتا، لیکن میری تعلیم کسی طرح کم نہیں ہے۔ میرے والد نے اس میں بہت اہتمام کیا تھا۔ عربی اور فارسی میں تکمیل کر چکا ہوں، لیکن معلم جو مجھے گھر پر پڑھاتے تھے۔ یا جو مدرس مدرسے میں تعلیم دیتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی یونانی زبان سے واقف نہ تھا''۔ اتنا کہہ کر قاسم کو فوراً خیال آیا کہ میں تو اصفہان کا ایک قالین فروش بنا ہوا ہوں۔ یہ باتیں کیسی بے جوڑ کر رہا ہوں۔ بھلا ایک

دکاندار باپ کو بیٹے کے لئے گھر پر معلم مقرر کر کے پڑھوانے کی کب ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ اتنے میں قاسم نے دیکھا۔ کہ وہ نوجوان مسکرا رہا ہے۔ قاسم نے فوراً غلطی رفع کرنے کے خیال سے کہا کہ ''علاوہ اس کے یہ دونوں زبانیں کافروں کی ہیں۔ ایسی زبانوں کا پڑھنا کب درست ہے؟''

نوجوان نے یہ تقریر سُن کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ سلیم بن طاہر بڑے پکے مسلمان ہیں۔ وہ ایسی زبانوں میں تعلیم دینا کب گوارا کر سکتے تھے''۔

قاسم اپنے والد کا نام سُن کر دنگ رہ گیا۔ پھر اس نوجوان نے کہا۔ ''مگر یہ غلطی ہے۔ میں دونوں زبانوں سے واقف ہوں اور یونانی کو لاطینی سے بہت بہتر سمجھتا ہوں، لیکن اس بحث سے پہلے میں قاسم بن سلیم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس ناچیز کو آپ بات کرتے سن رہے ہیں۔ وہ کون ہے۔ میرا نام حسن ہے اور صاحب قلعہ اَلموت یعنی شیخ الجبل کے محمد میرے والد ہیں''۔

اب قاسم کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اَلموت میں یہی حسن بن محمد ایسا شخص ہے۔ جو یونانی زبان جانتا ہے اور جو اُس فرنگی حسینہ کو قید سے رہائی دے سکتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہی حسن وہ ہے جس کے قتل کرنے کا شیخ الجبل کی طرف سے مجھے حکم ملا ہے۔

نواں باب

حسن نے قاسم کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”فرمائیے! شیخ کی کڑک اور گرج سُن لی۔ حلف بھی اُٹھالیا اور سارے سانگ میں بھی شریک ہو لئے“۔

قاسم نے متعجب ہو کر کہا۔ ”سانگ۔ وہ سانگ نہ تھا۔ بلکہ حشیشیوں کے راز و اسرار کی رسمیں تھیں“۔ قاسم نے زبان سے تو یہ کہا۔ مگر واقعات جو پیش آئے تھے۔ ان کی حقیقت خود بخود دل پر روشن ہونے لگی۔ سوچنے لگا کہ آخر ان تمام کاوشوں کے بعد جو باتیں دریافت ہوئیں۔ ان کا خلاصہ کیا نکلتا ہے۔ اسلام کے عقائد جس قدر سننے میں آئے، وہ متمولی تھے۔ جنہیں ہر مسلمان جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔ شیخ کا یہ دعویٰ کہ مخلوق کی جانب سے جس قدر تعظیم و تکریم کا وہ مستحق ہے۔ دوسرا نہیں ہے اور انسان کو مصیبت سے بچانے کی قدرت جس قدر اس میں ہے۔ دوسرے میں نہیں۔ تو یہ دونوں باتیں مشتبہ ہیں۔ نہ ان کے ثبوت میں کوئی شہادت ہے اور نہ غور و خوض کے بعد کوئی ان کی تہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اب سوائے ان علامتوں یا اشاروں کے جن سے ایک فدائی دوسرے فدائی کو پہچان لیتا ہے اور کیا باقی رہا۔ تو کیا میں نے صرف اتنی ہی بات معلوم کرنے کے لئے ایسی بڑی قسم کھا کر اپنی آزادی ہاتھ سے کھودی؟ قاسم جس وقت جس وقت یہ باتیں سوچ رہا تھا۔ تو اس کا چہرہ بالکل سہا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

حسن اس کیفیت کو کسی قدر لطف کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے متعلق زبان سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ پوچھنے لگا۔ ”آپ نے بہشت بھی دیکھی؟“

قاسم اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔ مگر سوال سنتے ہی چونکا اور گھبرا کر کہنے لگا۔ ”جی ہاں۔ ایک نے کہا کہ یہ بہشت ہے۔ دوسرے نے کہا نہیں یہ دوزخ ہے“۔

حسن کی صورت سے ایسا ظاہر ہونے لگا کہ گویا اس مضمون سے اُسے خاص دلچسپی ہے۔ کہنے لگا۔ ”کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں۔ ایک چیز جو ایک شخص کے

لئے بہشت ہے۔ وہی دوسرے کے لئے دوزخ ہوسکتی ہے۔ عمر خیام کے اشعار کا مضمون ہے:۔

''یہ سارا گنبد گردوں میرے تن نازک میں موجود ہے۔ صیحوں میرے چشم اشکبار کا ایک قطرہ اور دوزخ میری آہ بے سود کا ایک شرارہ ہے۔ مگر ''یک ساعتے عیش'' بس یہی میری بہشت ہے۔

قاسم کی تعلیم نہایت مختصر جامع و مانع اصول دین میں ہوئی تھی۔ کہنے لگا کہ ''عمر خیام ساری خدائی کا استہزا کرنے والا۔ ایک بے دین وکم عقل ملحد تھا۔ اس کی احمقانہ حکمت وفلسفہ پر یقین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

حسن: ''عمر خیام کو آپ بے عقل سمجھتے ہیں۔ وہ ایک مشہور منجم۔ جید عالم اور قوانین فطرت کا زبردست ماہر تھا۔ جو انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین سے کہیں زیادہ واضح واستوار اور ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔ عمر خیام کی عزت کرنی اب آپ کا فرض اس لئے بھی ہے کہ جس طریقہ میں آپ اس وقت شامل ہوئے ہیں۔ اس کے بانی حسن صباح کا وہ ہم مکتب رہ چکا تھا''۔ حسن نے اپنی تقریر کے یہ جملے نرمی اور طنز کو ملا کر کچھ اس طرح کہے۔ جیسے موسم بہار میں کسی قدر حدت کے بعد مطلع آسمان پر بادل اُٹھ کر اولے برساتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد حسن متفکر ہو کر میدان خیال میں اتنی دُور نکل گیا کہ اس کی آواز بھی دور کی صدا معلوم ہونے لگی، بغیر کسی کو خطاب کیے خود ہی چپکے چپکے کہنے لگا۔ ''ہائے وہ تصویر دل میں اُتری چلی آتی ہے کہ امام موفق اپنے باغ میں بیٹھے ہیں۔ درختوں سے پھول گرتے اور شاخوں میں طیور سرگوشیاں کرتے ہیں اور استاد کے سامنے اس کے تین عزیز شاگرد بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک نظام الملک ہے۔ جو سلجوقیوں کی سلطنت کو مستحکم اور مخلوق خدا میں صلح وامن قائم کرے گا۔ مگر ہمارا سب سے بڑا دشمن ہوگا اور ہمارے ہی ہاتھ سے قتل بھی کیا جائے گا۔ دوسرا حسن صباح ہے۔ جو سلطنتوں کا غارت کرنے والا ثابت ہوگا۔ دونوں گویا جب ہی سے اپنے اپنے منصوبوں کو سوچنے میں مصروف اس دنیائے دنی کے بُطل وتکبر میں مبتلا ہیں۔ تیسرا شاگرد عمر خیام ہے۔ مگر یہ چیز ہی کچھ اور ہے۔ اس کے سینے میں سپر درخشاں کی فضا۔ چشم جادو فریب کی سیاہی اور شراب کی مستی موجود ہے۔ اشیاء حاضرہ کی قدر اور حسنِ کائنات وقوانین ازلی سے اس کا قلب معمور ہے۔ دنیا کے مروجہ مذہبوں اہل باطن واہل صوف کی ابلہ فریبیوں پر وہ ہنستا ہے۔ غلطیوں پر—'' آگے کچھ کہنے کو تھا کہ دفعتاً اس سلسلۂ خیال کو اس طرح چھوڑا۔ جیسے کوئی سوتا آدمی اُٹھ بیٹھے، پھر کہنے

لگا۔ ''عمر خیام بڑا عاقل و دانا تھا۔ اس کی نگاہ اس بازیگاہ دنیا کو دیکھتی ہوئی آگے پہنچ کر نظام عالم کی نہ بدلنے والی حقیقت پر قادر تھی، لیکن یونانیوں کے مقابلے میں عمر خیام کی بھی کچھ حقیقت نہ تھی۔ آپ اس وقت یہاں موجود ہیں۔ ذرا چاروں طرف نگاہ کیجئے۔ اس سبزہ و گل کی دلربائی پہاڑوں اور وادیوں کی شان ملاحظہ کیجئے۔ سکوت اور خاموشی پر بھی غور کیجئے۔ انہی چیزوں کو یونان کا ایک شاعر کیا خوب کہہ گیا ہے۔ افسوس ترجمے میں اصل کا لطف کہاں۔ مگر پھر بھی مضمون پُر اثر اور اس منظر کے حسب حال ہے:۔

''یہ مقام ہے۔ جہاں گلہ بان بھی کبھی اپنے گلّے چرانے نہیں آتا۔ یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں نہ کبھی تیغ کا گذر ہوا ہے نہ تلوار کا۔ البتہ موسم بہار میں شہد کی مکھی پھولوں کے شوق میں کبھی کبھی بے تکلفی سے ادھر آ نکلتی ہے''۔

دیکھئے کیا حسین خیال ہے اور یہاں کی خاموشی کی تصویر کس خوبی سے ان اشعار میں اتفاقاً بیان ہو گئی ہے''۔

قاسم اس عجیب شخص کی گفتگو سُن کر حیران تھا کہ کیا کہے۔ ''بجا۔ بجا'' کہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ حسن کی یہ گفتگو بہر حال بے موقع نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اس جگہ نہ کبھی تیغ کا گذا ہوا ہے۔ نہ تلورا کا۔ ضرور کچھ معنی رکھتا ہے۔ حسن کا حال پہلے سے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لئے ہوشیار رہنا چاہئے۔ قاسم طبیعت کا بہت سیدھا سادہ تھا اور اس کی عمدہ تعلیم و تربیت اس موقع پر اس کے کام آئی۔ حسن قاسم کی طرف منتظر نگاہ سے دیکھنے لگا۔ قاسم کو کہنا پڑا۔ ''چاروں طرف دیواریں مضبوط اور پہرے بیٹھے ہوں۔ تو یہاں کی خاموشی میں گلہ بان یا تلوار دونوں کی طاقت نہیں کہ کبھی مخل ہو سکیں۔ مگر جنوب مغرب کی غارت گر ہوا کا کیا تدارک ہے۔ کسی نے کہا ہے'' گو میرے باغ کے گرد درخت کتنے ہی گنجان ہوں، لیکن بادِ خزاں اپنا راستہ کئے بغیر نہ رہے گی اور پھولوں کی پنکھڑیاں پھولوں سے ٹوٹ کر زمین پر بکھر جائیں گی''

حسن نے کہا۔ ''خوب فرمایا۔ مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہوا کبھی موافق بھی چلتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ'' آرزوؤں کے ماہ تاباں پر جس وقت رشک و حسد کا بادل چھا جاتا ہے۔ تو پھر بادِ جنوب و مغرب کے جھونکے گو سرد ہوں۔ مگر ان کا آنا مبارک ہوتا ہے''۔

قاسم کی عقل دنگ تھی۔ حسن کی صورت دیکھتے دیکھتے جنوب مغرب کی طرف نگاہ کی۔ تو

دیکھا کہ پہاڑوں کے لالہ زار دامن ۔ تاریک درۂ کوہ ۔ درختوں کے جھنڈ اور اونچے چٹانوں سے آگے قلعہ اَلموت کے سب سے اونچے برج پر شیخ الجبل کی چھت چمک رہی ہے ۔ تیسرے پہر کی دھوپ نے سونے کی چادروں سے روشنی کے انعکاس میں اور بھی تیزی پیدا کردی ہے ۔ قاسم سمجھ گیا ۔ اس کے دل کا حال حسن کی باتوں نے اس پر روشن کردیا ۔ قاسم نے سر نیچا کرلیا اور قلب کی یہ کیفیت ہوئی ۔ جیسے سمندر کی موج کنارے سے ٹکرا کر صدہا قطروں میں بکھر جائے ۔

حسن نے کہا '' میں سمجھ گیا ۔ تم ماہر نجوم عمر خیام کی شاعری کی قدر نہیں کرتے ۔ مگر پرکار کے دونوں سروں کو سمجھتے ہو کہ کہاں ہیں ۔ ممکن ہے ۔ میں تمہاری مدد کروں اور تم میری مدد کرو ۔ تمہاری سب سے بڑی آرزو ہمارے طریقہ کے راز بافت کرنا ہے '' ۔

قاسم بالکل بے اختیار ہو کر بولا ۔ '' اور کسی کو دوزخ سے نکالنا '' ۔

حسن : '' اتنی عجلت نہ کیجئے ۔ اگر ایک اشرفی میں ایک قبا مول کو ملتی ہے ۔ تو دو قباؤں کے لئے دو اشرفیاں درکار ہوں گی ۔ پہلے اس کا ثبوت دینا ہوگا کہ ایک اشرفی بھی جیب میں رکھتے ہو ۔ تمہارے دل میں دو آرزوئیں ہیں ۔ یہ سوچ لو کہ کونسی آرزو پہلے پوری کرنی ہے '' ۔

قاسم کا دل اس خیال سے پارہ پارہ ہونے لگا ۔ ایک طرف باپ کا خیال تھا ۔ جس سے بے حد محبت تھی ، قاسم سمجھتا تھا کہ جو کچھ ہوں اُسی کی بدولت ہوں ۔ جو خدمت اس نے سپرد کی ہے ۔ اسی کے حسن انجام پر باپ کی عزت بلکہ اس کی جان و مال کی سلامتی مبنی ہے ۔ دوسری طرف اس بت فرنگ کی صورت تھی ۔ وہ آسمانی رنگ آنکھیں ۔ وہ سنہری بال گورے گورے ساعد و بازو ۔ سیاہ لباس سے چھری کا نکالنا اور نگاہوں میں کبھی اپنی جان لینے کی دھمکیاں اور کبھی دل مضطر کی فریاد طالع بد کی مہیب شکلیں اور ان کا مہیب تر علاج ۔ یہ سب چیزیں یکلخت دماغ پر ہجوم کر آئیں ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا فیصلہ کرے ۔ دل اندر ہی اندر کروٹیں بدلتا تھا ۔ آخر کار ایک بات سمجھ میں آئی ۔

حسن اس وقت قاسم کی صورت کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا ۔ کہنے لگا ۔ '' گل سوسن پر شبنم کے قطرے سمندر کے تاریک پانی سے جس کی تہ کا پتا نہ ہو ۔ زیادہ حسین اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں ۔ شبنم کے قطرے تمازت آفتاب سے فنا ہو جاتے ہیں ۔ سوسن کا پھول مُرجھا جاتا ہے ، لیکن سمندر قائم رہتا ہے ''

قاسم سوسن کا نام سنتے ہی چوکنا اور متعجب ہوا کہ حسن کو اس کے دل کا حال کیونکر معلوم ہوا ۔ سوچنے لگا ۔ '' یہ سچ ہے کہ اس باطنی فرقے کے راز و اسرار تو مرنے والی چیز نہیں ، لیکن وہ

دوسری چیز ـــ'' قاسم سوچتے سوچتے رُکا اور خوف کی حالت میں چلا کر کہا۔'' مگر ہائے اس قسم کو جو کتاب پر کھائی ہے۔ کیا کروں؟''

حسن نے یہ فقرہ سُن کر کہا۔'' تو تم سفید قبا کو سیاہ پر ترجیح دیتے ہو، لیکن جس اشرفی میں وہ مول مل سکتی ہے۔ اس میں تمہیں تذبذب ہے کہ آیا وہ اشرفی تمہاری ہے بھی یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس کتاب پر تم نے قسم کھائی ہے۔ وہ واقعی کتاب اللہ تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ حلف تم نے حالت مجبوری میں اٹھایا ہے اور ایسے وقت اٹھایا ہے کہ تمہاری عقل سلامت نہ تھی۔ یونانیوں کا مقولہ ہے کہ زبان نے قسم کھائی ہے۔ دل نے قسم کھائی، لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی تمہیں درست معلوم نہ ہو۔ تو پھر اس سے بھی زیادہ مضبوط دلیل میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ تم نے قسم اس بات کی کھائی تھی کہ سوائے ان لوگوں کے جو باطنی طریق میں شامل ہوں۔ اور کسی پر کوئی راز ظاہر نہ کرو گے۔ میں اس طریقے میں شامل ہی نہیں ہوں۔ بلکہ اس کی اندرونی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں''۔

جب سونے اور جواہرات کا ایک پہاڑ بالکل سامنے ہو۔ تو پھر اس غار عمیق کا خوف نہ کرنا چاہئے۔ جو بیچ میں حائل ہے۔ اگر زال پدر رستم والا عظیم الجثہ سیمرغ بھی ملے۔ تو اس کے پروں پر بیٹھ کر اس غار کو عبور کر لینا چاہئے۔ آخری دلیل جو حسن نے پیش کی تھی۔ وہ قاسم کو بالکل درست معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے کہا'' میرا مقصود اول اس فرنگی عورت کو بچانا ہے اور اس کار خیر میں آپ میری مدد کریں اور اس کے بدلے میں حفظ ماتقدم کی غرض سے اطلاع دیتا ہوں کہ شیخ الجبل نے حکم دیا ہے کہ کل شب کو آپ قتل کر دیئے جائیں اور قاتلوں میں ایک میں بھی مقرر ہوا ہوں''۔

اس خبر سے حسن کے چہرے پر شکن تک نہ آیا۔ کہنے لگا۔'' پدر بزرگوار سراپا شفقت و کرم ہیں۔ اُن کے اس حکم پر مجھے مطلق تعجب نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ سے مجھے یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ میرے لئے مشکلات کا سامنا قریب ہے۔ اب چونکہ تم نے اُن کے مقصد سے مجھے مطلع کر دیا۔ اس لئے میں ان کے قصد کی مخالفت میں تم سے مدد لوں گا۔ اور اس عوض میں اس مصیبت زدہ عورت کو قید سے رہا کرنے میں تمہاری مدد کروں گا۔ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن اگر اس کو انجام دینا ہے۔ تو پھر دیر نہ کرنی چاہئے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمت اور ارادے میں پختہ ہو؟''

قاسم نے اس کا جواب فقط یہ دیا کہ'' میرے باپ کا نام سلیم بن طاہر ہے''۔

حسن: ''بالکل بجا ہے، لیکن اگر اس فرنگن کو قید سے رہا کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ تو پھر اُس کا کیا کرو گے؟''

قاسم نے اس پہلو پر پہلے غور نہیں کیا تھا۔ سوچنے لگا کہ اس شہر سے نکال کر اس کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دینا ضروری ہوگا۔ مگر خلیفہ اور باپ نے جو خدمت سپرد کی ہے۔ اسے بھی تو انجام دینا ہے۔ اس صورت میں اس مصیبت زدہ عورت کو میں خود کسی محفوظ مقام تک کیونکر پہنچا سکتا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی قاسم کا چہرہ نہایت افسردہ ہوگیا اور حسن سے پوچھنے لگا۔ ''کیا اس کے عزیز و اقارب نہیں ہیں؟''

حسن: ''عزیز و اقارب سب ہیں، لیکن وہ یہاں سے بہت دُور ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ اس ملک سے بہت فاصلے پر اقلیم شال کی ارض باروہ میں ایک ملک ہے۔ جس کا نام ناروے ہے۔ اس کے گرد جس قدر سمندر ہیں۔ ان میں ہمیشہ طوفان آتے رہتے ہیں اور کفوں کی وجہ سے ان کی سطح بالکل سپید رہتی ہے۔ دریا بھی اس ملک کے سفید ہیں۔ کیونکہ ان کا پانی پہاڑوں میں بڑی بڑی بلندیوں سے گہرے گہرے غاروں میں گر کر اپنی سطح پر سفید سفید جھاگ لاتا رہتا ہے۔ پہاڑ بھی وہاں کے سپید ہیں۔ کیونکہ برف سے بارہ مہینے ڈھکے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں کے آدمیوں کا رنگ بھی سمندروں۔ دریاؤں اور پہاڑوں ہی کے رنگ کا ہوتا ہے۔ جاڑا ہمیشہ اس ملک میں رہتا ہے۔ مہینوں تک یہ کیفیت رہتی ہے کہ مشرق سے آفتاب طلوع ہو کر زیادہ بلند نہیں ہوتا۔ بلکہ افق کے کنارے کنارے چل کر دنیا کو ایک خوف زدہ بچے کی طرح جھانکتا ہوا چھپ جاتا ہے اور ملک پر اکثر تاریکی چھائی رہتی ہے۔ یہاں کا بادشاہ سیگرو نامی اس تاریکی اور خوفناک منظروں سے گھبرا کر مگر بظاہر یہ کہہ کر کہ دین کی خدمت نے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔ وطن سے نکلا۔ ملک کے باشندوں کو سمندر کے ساتھ خاص دلچسپی ہے۔ وہ بڑے جہاز راں ہیں، لیکن ان کے سمندر بھی ان کے حق میں ایسے ہی نامہربان ہیں جیسے ان کی زمینیں ہیں۔ غرض بادشاہ سیگرو پچپن جہازوں کا ایک بیڑہ لے کر اپنے ملک سے جنوب کے سمندر اور گرم ملکوں کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہی سپید رنگ کے وحشی تھے۔ ان میں کسی کے بال سنہری تھے۔ کسی کے سیاہ۔ صلیب پرستی ان لوگوں کا دین تھا۔ شدہ شدہ فلسطین میں یروشلم کے افرنجی بادشاہ کے ساتھ یہ سب لوگ ہوگئے اور انہوں نے مل کر بحر شام کے کنارے صیدون کے شہر کو فتح کر لیا۔ جب اس واقعہ کو تین برس گذر گئے۔ تو سیگرو کو خیال ہوا کہ اب حمایت صلیب

اور دین مسیحی کی خدمت ادا ہو چکی بہتر ہے کہ اپنے سرد اور ویران ملک کو واپس جائے۔ جہاں کا وہ بادشاہ ہے، لیکن اس کے بعض ہمراہیوں نے اس بات کو بالکل خلاف عقل سمجھا کہ ایک مہذب ومتمدن گرم اور روشن ملک کو چھوڑ کر وہ اپنے سرد اور تاریک مولد ومسکن کو واپس جائیں۔ ان ہی لوگوں میں ایک خوب رُو نوجوان شریف زادہ تھوراستین نامی تھا۔ اس نے دیکھا کہ افرنجہ کے امیر اس ملک میں اپنے وطن کی ریاستوں سے بھی بڑی ریاستیں پیدا کر رہے ہیں۔ خود بھی کچھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ بادشاہ روم کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ ملک روم کو یونان کے لوگ بیزنطیہ کہتے تھے۔ اس ملازمت میں تھوراستین نے بہت ترقی کی، لیکن پھر طلب دنیا نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ قصد یہ کیا کہ تلوار کے زور سے خود اپنی ایک ریاست جدا قائم کرے۔ چنانچہ اسی قصد سے وہ شہر ارفہ کے قوس یعنی عیسائی حاکم سے جا ملا اور کئی برس تک اس کی طرف سے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑتا رہا، لیکن انجام یہ ہوا کہ اتابک زنگی والی موصل نے جسے عیسائی خونی شہزادہ کہتے تھے۔ ارفہ کے قومس کو شکست دے دی اور اس ہنگامہ میں تھوراستین مارا گیا۔ جس وقت یہ تھوراستین بادشاہ روم کی ملازمت میں تھا۔ تو اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی یہ بڑی ہو کر نہایت حسین نکلی اور یونانی زبان میں اس نے بڑی دستگاہ پیدا کر لی۔ اتابک زنگی، جس نے وقت عیسائیوں کو ارفہ پر شکست دے دی۔ تو یہ لڑکی جو اس وقت جوان تھی۔ لڑائی میں گرفتار کر لی گئی۔ جب اور قیدیوں کے ساتھ فروخت کی گئی۔ تو شیخ الجبل نے اس کو خرید لیا۔ یہ کل واقعات اس لڑکی نے خود مجھ سے بیان کئے تھے۔ کیونکہ یونانی میں وہ مجھ سے بے تکلف گفتگو کر سکتی تھی۔ تم یونانی نہیں جانتے۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کس زبان میں اس نے باتیں کیں''۔

اتنا کہہ کر حسن یونہی کچھ ہنسا۔ قاسم کو اس کا ہنسنا بُرا معلوم ہوا مگر بُرا ماننے سے ہوتا ہی کیا تھا۔ حسن کی مرضی اور مدد پر اس کل معاملہ کا دار و مدار تھا۔ اب ان دونوں نے تھورفرید کو رہا کرنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کیں، لیکن بار بار یہی سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر رہا کر بھی لیا۔ تو پھر اس کو کہاں پہنچانا ہوگا۔ حفاظت کی صورت صرف یہی معلوم ہوتی تھی کہ قید سے نکالتے ہیں اس کو فلسطین پہنچا دیا جائے جہاں اس کے ہم مذہب عیسائی بکثرت موجود تھے۔ حسن نے اس خیال سے اتفاق کر لیا اور قاسم کو بھی اطمینان ہو گیا، لیکن فلسطین کون پہنچائے۔ اس میں حسن اور قاسم متفق الرائے نہ ہوتے تھے۔ قاسم کو اس پر اصرار تھا کہ پہلے وہ شہر میں حسن کے ہوا خواہوں میں روپوش رہے۔ پھر

موقع ملتے ہیں قاسم خود اسے لے کر نکلے اور فلسطین تک خیریت سے پہنچنے کا بندوبست کر دے۔ حسن کو اس سے اتفاق نہ تھا کہ خود قاسم اس کو شہر سے لے کر نکلے۔ کیونکہ اس قسم کا قصد ظاہر ہو جائے گا۔ شہر کے دروازے فوراً بند کر دئے جائیں گے یا ور گھر گھر تلاشی شروع ہو جائے گی۔ یا لوگ تعاقب کریں گے۔ قاسم کے ساتھ کسی عورت کو دیکھتے ہی شبہ گذرے گا۔ فدائی ہر جگہ موجود ہیں۔ کوئی کونا کھدرا ایسا نہیں۔ جہاں وہ نہ چھپے بیٹھے ہوں۔ یہ کمبخت ہر وقت دوسروں کی مخبری یا آپس میں ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے رہتے ہیں۔ اُن سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں۔

قاسم یہ سب باتیں سمجھتا تھا، لیکن اس پر طبیعت نہ جمتی تھی کہ کوئی دوسرا آدمی اُسے ساتھ لے کر نکلے۔ اس کام کے لئے کوئی معتبر آدمی اس کو نظر نہ آتا تھا۔ آخر کار سوچتے سوچتے دفعتاً بہرام کا خیال آیا کہ وہ عنقریب اَلموت سے باہر جانے والا ہے۔ آدمی کچھ بہت بھروسے کا تو ہے نہیں۔ کیونکہ بہت ہی مہمل اور یاوہ گو ہے۔ مگر صحرا میں چونکہ اس کی جان بچا چکا ہوں۔ اس لئے وہ میرا بہت احسان مانتا ہے۔ بُرائیاں اس میں ضرور ہیں۔ مگر وہ ایسی نہیں ہیں۔ جن سے دوسروں کو کوئی نقصان پہنچے۔ دل کا اچھا ہے۔ اب سوائے اس کے کوئی تدبیر نہ تھی کہ تھور فریدا کو بہرام کے ساتھ کر دیا جائے۔ قاسم نے حسن کو یہ تدبیر سنائی۔ حسن نے جب اسے پسند کر لیا۔ تو قاسم دل میں بہت خوش ہوا۔

اب تیسرا پہر ختم ہونے کو ہے۔ حسن نے قاسم سے کہا کہ ایک گھنٹے تک اچھی طرح آرام کر لو۔ تھور فریدا کو میں اطلاع کئے دیتا ہوں کہ ہم نے اس کی رہائی کی کیا تدبیر سوچی ہے'' حسن نے ہنس کر یہ بھی کہا کہ ''یہ میرا حسن مذاق اور ہر چیز میں خوبصورتی پیدا کرنے کا ذوق تھا کہ والد بزرگوار ہمیشہ میرے محتاج رہتے تھے۔ اگر میں اپنی ذہانت اور عقل کو کام میں نہ لاتا۔ تو ان کی یہ بہشت بہشت نہ بنتی۔ بہشت کے رہنے والوں سے اب بھی بات چیت کرنے کے ذریعے مجھے حاصل ہیں، لیکن باوا جان کی بدگمانیاں اب اتنی بڑھی ہیں کہ جس بے تکلفی سے پہلے وہاں آمد و رفت رکھ سکتا تھا۔ اب وہ بات نہیں ہے۔ پہلے بہشت سے کسی کو معمولی راستوں سے باہر لے آنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بہر کیف تھور فریدا کو اطلاع کر دی جائیگی اور وہ وقت پر تمہاری منتظر اور قید سے نکلنے کے لیے تیار رہے گی''۔

دسواں باب

اب ذرا تصور کیجئے کہ قاسم جس رستہ سے حسن کے گھر پہنچا تھا۔ اسی رستے پر ایک جگہ کھڑے ہو کر سر کے اوپر ایک بلند عمارت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ عمارت وہی ہے۔ جو دیوار کے سلسلے کو شکست کر کے اس کے بیچ میں آ گئی تھی۔ قاسم کے کندھے پر کمان اور ترکش ہے اور ترکش میں بہت سے تیر ہیں۔ ہاتھ میں ایک بہت لمبا بھالا ہے اور کمر میں ایک پتلی مگر مضبوط رسی لپٹی ہوئی ہے۔

اس شکل سے قاسم چپ کھڑا اوپر کو دیکھ رہا ہے۔ چونکہ ایک بہت دشوار اور مشکل کام درپیش ہے۔ اس لئے دل کی حرکت بہت تیز ہے۔ خطرے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ کیونکہ سامنے جو بلندی ہے۔ وہ بجری اور کنکروں کا ایک ڈھلوان پہاڑ ہے۔ جس میں جابجا سالم پتھر کی چٹانیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ ڈھال پر کنکروں اور کتلوں کا یہ حال ہے کہ ان پر قدم رکھتے ہی نیچے پھسل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چڑھائی ایسی دشوار ہے کہ رات کے اندھیرے میں اوپر پہنچنے کا قصد دیوانگی سے کم نہ ہوتا۔ سورج چھپنے سے پہلے کسی طرح عمارت کی دیوار تک پہنچنا ضروری تھا۔ گو اس میں یہ خوف تھا کہ دن کا وقت ہے۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر اتفاق سے ایک طرف کو چٹان کا ایک کونا کچھ اس طرح باہر کو نکلا ہوا تھا کہ قلعہ اَلموت کے پہرے والوں سے پہاڑ کا یہ حصہ آڑ میں آ جاتا تھا۔ پھر بھی خطرہ ضرور تھا۔ کیونکہ پہاڑ کا یہ رُخ غرب رویہ تھا اور شام کو روشنی اس پر خوب پڑتی تھی۔

حسن نے قاسم سے کہہ دیا تھا کہ جس رستہ سے آئے ہو۔ اُس میں ایک مقام سے کوئی پندرہ گز کی بلندی پر ایک چٹان بجری اور کنکروں سے باہر کو چھجے کی طرح نکلی ہوئی نظر آئے گی۔ اس چٹان پر تمہارا پہنچ جانا ضروری ہے۔ پھر وہاں سے عمارت کی کھڑکیوں تک تقریباً دس گز کی بلندی رہ جائے گی۔ حسن کی ہدایت کے مطابق قاسم رستہ پر ٹھیک اس چٹان کے نیچے آ کر کھڑا

ہوا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد یہاں سے کسی قدر شمال کی طرف ہٹ کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ لمبا بھالا اٹھا کر زور سے اوپر کو جمایا اور بایاں پاؤں اٹھا کر کنکروں پر رکھا۔ پاؤں رکھتے ہیں کچھ کنکر لڑھکتے ہوئے رستہ پر آئے اور وہاں سے گدّ اکھا کر گہرے کھڈ میں جا گرے۔ شام کے سناٹے میں ان کے گرنے کی آواز بڑی مہیب معلوم ہوئی اور خوف ہوا کہ کہیں کوئی دوسرا نہ سنتا ہو۔ جب یہ آواز بند ہوئی۔ تو قاسم نے دایاں پاؤں اُٹھا کر اوپر جمایا اور بھالے کو اکھاڑ کر جلدی سے اوپر کو گاڑا پاؤں کے نیچے کنکر پھر پھسلتے معلوم ہوئے۔ مگر کسی طرح ایک قدم اور اوپر چڑھ کر ہاتھ پاؤں کچھ اس طرح کر لیے کہ بدن کا پورا بوجھ کسی ایک چیز پر نہ پڑے۔ اسی شکل سے دو چار قدم اور اوپر چڑھا۔ مگر اب چڑھائی بہت سخت تھی۔ قاسم کوشش کر کے اوپر چڑھتا تھا۔ مگر پاؤں نیچے کو پھسل پڑتے تھے۔ کنکر اور کتلیں لڑھکتی ہوئی کھڈ میں گرتی تھیں۔ اگر یونہی قدم اُکھڑتے اور نیچے کو پھسلتا رہا۔ تو پھر رکنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کنکروں اور پتھروں کی طرح وہ بھی گدّے کھاتا صدہا گز نیچے غار میں جا گرے گا۔ اس حالت کو روکنے کے لیے قاسم بھالے کو زور سے کنکروں میں گاڑ کر زمین کو اس طرح چمٹا کہ سارا چہرہ کنکروں میں چھپ گیا۔ پھر بھی نیچے کو پھسلتا رہا۔ کچھ دیر یہی حالت رہی۔ جان سے مایوسی ہوگئی۔ اتنے میں نیچے کو کھسکنا بند ہوا۔ قاسم نے سر اٹھا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ راستہ جہاں سے چڑھنا شروع کیا تھا۔ پہاڑ کی آڑ میں آ کر نظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اب نیچے سوائے ایک گہرے اور تاریک غار کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آفتاب سامنے کے کوہسار کے پیچھے غروب ہو کر پہاڑوں کا سایہ غار میں پھیلا رہا تھا اور ان کی چوٹیوں کی ڈراؤنی پرچھائیاں قاسم کی طرف اس طرح بڑھتی آتی تھیں۔ جیسے کوئی خبیث دیو آدم زاد کو کھانے کے لئے منہ پھاڑے چلا آتا ہو۔ آدمی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ صرف اس کے کالے غار کے منہ پر ایک بڑا بھاری گدھ پر پھیلائے منڈلا رہا تھا۔ قاسم اس وقت موت اور زندگی دونوں کے درمیان معلق تھا۔

اب پھر بہت احتیاط سے کئی قدم اونچا اُٹھا اور ایک موقع ایسا آیا کہ بایاں ہاتھ بڑھا کر ایک چٹان کے کونے کو خوب مضبوط پکڑ لیا اور اسی ہاتھ پر زور دے کر کچھ اوپر کو کِھسکا۔ آس پاس کے پتھروں اور چٹانوں کی ریخوں میں پاؤں ٹکاتا ہوا کچھ اور اونچا ہوا۔ سینے کو پتھروں پر رکھ کر زور دیتے دیتے پسلیاں ٹوٹنے لگی تھیں۔ ناک مٹی اور کنکروں میں دبتے دبتے دم گھٹنے لگا تھا۔ ہاتھ لہولہان ہوگئے تھے اور ریت کے ذرّے پڑ جانے سے آنکھوں میں شدت کی کھٹک ہو

رہی تھی۔ آخر کار جوں توں کر کے چٹان سے بالکل جاملا۔ بائیں ہاتھ سے اُس کا کونا تو پہلے ہی سے مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔ اب اُسی ہاتھ کی کہنی بھی اوپر جمادی اور چاہاں کہ اُچک کر اوپر آ جائے، لیکن پاؤں کے نیچے کنکروں نے پھر دھوکا دیا۔ اور اوپر نہ پہنچ سکا۔ بلکہ اسی طرح ہاتھ کی ایک کہنی چٹان پر جمی ہوئی اُدھر لٹک گیا اور اب فوراً بھالا پھینک دائیں ہاتھ کو خالی کر اس ہاتھ کو بھی چٹان پر جما دیا۔ بھالا کھڑکھڑاتا ہوا کھڈ کی تہ پر پہنچا اور قاسم دونوں ہاتھوں پر زور دے۔ ایک دم سے اُچھل چٹان پر پہنچ گیا۔ یہ وہی چٹان تھی۔ جس پر پہنچنے کے لئے حسن نے کہا تھا۔ چٹان کے اوپر آ تو گیا، لیکن بالکل بے دم ہو کر دیر تک پڑا ہانپتا رہا۔ جب دم قابو میں آیا۔ تو سامنے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ گہرے غار کے بعد بلند پہاڑوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ سورج ان کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور پہاڑوں کا تاریک سایہ اب قاسم تک پہنچتا تھا۔ ادھر سے نظر پھیر کر عمارت کی طرف دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد دیوار شروع ہو جائے گی۔ دیوار کی کیفیت یہ تھی کہ ایک اونچے اور سیدھے پہاڑ پر اسی کے ساتھ سیدھی اُٹھی تھی۔ کھڑکیاں بھی دیوار میں بہت اونچان پر تھیں اور ان میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ واقعی اس مکان سے کسی کا نکل بھاگنا آسان کام نہ تھا۔

عمارت کی کھڑکی میں سے کسی سپید چیز کی ایک جھلک معلوم ہوئی۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر کو نکلی۔ قاسم نے غور کیا تو وہ سوسن کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔ ذہن فوراً ان پھولوں کی طرف منتقل ہوا۔ جو باغ میں ایک چینی کے گلدان میں دیکھے تھے۔ دل بڑھا ہمت بندھی۔ چٹان جس پر بے دم پڑا تھا۔ بہت تنگ اور آگے کو غار کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ فوراً اٹھا۔ کمان کندھے سے اتاری، ترکش سے تیر نکالا اور اس کے سرے پر ایک ڈوری باندھی اور پھولوں کے گچھے کی طرف تیر آہستہ سے چلایا۔ تیر نازک پھولوں میں سے گذر کر کھڑکی کی اوپر والی سنگین چوکھٹ میں لگ کر نیچے گرا۔ گر کر خدا جانے کہاں تلپٹ ہو جاتا۔ مگر وہ تو سرے میں ڈوری بندھی تھی۔ قاسم نے تیر گھسیٹ لیا اور اب ایک ہلکی سی آواز تعریف اور حیرت کی کھڑکی میں سے سنائی دی۔ قاسم نے پھر تیر چلایا اور وہ پھولوں کے گچھے سے پار ہو کر کھڑکی سے ٹکرا کر پہلے کی طرح پھر نیچے گرا۔ قاسم نے اُسے پھر گھسیٹ لیا۔ اب اُس نے چاہا۔ کہ تیر اس طریقے سے چلائے کہ کھڑکی کے اندر پہنچے، لیکن کھڑکی سر کے اوپر ایسی سیدھی واقع ہوئی تھی کہ تیر کا اندر پہنچانا ممکن نہ تھا۔ یہ وقت قاسم پر بڑی دشواری اور پریشانی کا تھا۔ سوچتا تھا کہ یہ ساری محنت و مشقت جو یہاں تک آنے میں

ہوئی ہے اور جان جوکھوں میں ڈالی ہے۔ وہ سب اکارت گئی۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھڑکی میں سے ایک بہت گورا ہاتھ باہر کو نکلا۔ ہتھیلی نیچے کی طرف پھیلی تھی۔ گویا منتظر تھی کہ تیر اس پر چلایا جائے۔ قاسم ڈرا۔ ہاتھ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ایسی نازک چیز کو زخمی کرنے کا دل کہاں سے لاتا۔ اتنے میں ایک دوسرا ہاتھ مگر رنگت میں کسی قدر سانولا باہر کو نکلا اور اس نے گورے ہاتھ کو پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور اب اس سانولے ہاتھ کی ہتھیلی منتظر ہوئی کہ تیر کا نشانہ بنے۔ قاسم سمجھ گیا کہ یہ وہ پہلا ہاتھ نہیں ہے۔ مگر ہاتھ کسی کا بھی ہو۔ اس کو زخمی کرنا کب درست ہے۔ اتنا خیال البتہ آیا۔ کہ سانولے ہاتھ کو اتنی جرأت نہ ہونی چاہئے تھی کہ گورے ہاتھ کو اندر کھینچ لیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اوپر خوب کشتم کشتا ہو رہا ہے۔ گورا ہاتھ پھر باہر نکلا۔ اس مرتبہ وہ خالی نہ تھا۔ ایک لمبے سے تکئے کا جو کسی موٹے کپڑے کو لپیٹ کر بنا لیا تھا۔ ایک سرا پکڑے تھا اور اس کا دوسرا سرا باہر کو نکال رکھا تھا۔ قاسم نے اس تکئے پر تیر چلایا۔ تیر فوراً اس میں کھب گیا اور ہاتھ مع تیر و تکیہ کے اندر کھینچ لیا گیا۔

تیر میں ڈوری بندھی تھی۔ اسی ڈوری میں قاسم نے ایک ریتی باندھی۔ ڈوری اوپر کو کسی نے گھسیٹی اور تھوڑی دیر میں یہ نظر آیا کہ کھڑکی کی ایک سلاخ کو دو ہاتھ ریتی سے جلدی جلدی کاٹ رہے ہیں۔ سلاخیں پتلی اور زنگ خوردہ تھیں۔ ان میں سے ایک اوپر کے سرے کی طرف جلد کٹ گئی اور اب دو گورے اور دو سانولے ہاتھوں نے اس سلاخ کو پکڑ کر اندر کی طرف نیچے کو موڑ دیا اور پھر فوراً دوسری سلاخ کو کاٹنے میں یہ ہاتھ مصروف ہو گئے۔ قاسم دیکھتا تھا کہ ان ہاتھوں میں خاص کر گورے ہاتھ سلاخ کو کاٹنے میں بے حد محنت و مشقت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ دوسری سلاخ بھی کٹ گئی اور اس کو بھی پہلی سلاخ کی طرح اندر کو موڑ دیا گیا اور اب تھور فریدا کا چہرہ کھڑکی کے باہر نظر آیا۔ قاسم کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور ڈوری کو حرکت دی۔ قاسم نے اپنی کمر سے فوراً رسی کھولی۔ رسی پتلی اور دوہری تھی۔ سروں کے تھوڑے تھوڑے بل کھول کر ان کو ملا کر پھر اس طرح بٹا تھا کہ ساری رسی ایک جان ہو گئی تھی۔ رسی دیکھنے میں پتلی تھی۔ مگر اس میں اتنا کس تھا کہ ایک آدمی کا بوجھ بخوبی سہار لے۔ قاسم نے تیر والی ڈوری میں رسی کو باندھا۔ جب یہ کام ہو لیا تو کسی نے ڈوری کھینچی۔ ڈوری کے ساتھ رسی بھی اوپر پہنچ گئی اور اب کھڑکی کی سلاخیں جو کاٹ کر اندر کی طرف موڑ دی گئی تھیں۔ ان کے نیچے یہ رسی اس طرح پھنسا دی گئی کہ بوجھ پڑنے کی صورت میں اپنی جگہ سے کھسکے نہیں۔

شام کی ہلکی ہلکی روشنی ابھی باقی ہے۔ کھڑکی میں سے یکا یک ایک صورت کچھ باہر کو نکلی اور رسّی کو کھینچ کھینچ کر یہ دیکھنے لگی کہ نیچے ہزار ہا گز کا گہرا غار تیرہ و تاریک ہے۔ اس حالت میں رسّی اتنی مضبوط ہے کہ ایک عورت اپنی جان اس کے سپرد کرے اور اب وہ صورت رسّی کو پکڑے ہوئے کھڑکی سے بالکل باہر آ گئی اور رسّی میں لٹکی۔ اِدھر اُدھر زور زور سے جھونکے کھانے لگی۔ یہ کیفیت دیکھ کر قاسم کو چکر آنے لگا، لیکن جونہی رسّی کا جھولنا ذرا کم ہوا۔ تو وہی صورت بہت پھرتی اور احتیاط سے ایک دو ہاتھ تین ہاتھ نیچے اُترنے لگی۔ ہاتھ اور بازو گورے تھے۔ سر پر سے کپڑا ہٹ جانے سے سُنہری بالوں کی لمبی لمبی لٹیں بکھر کر تاریکی میں بھی روشن نظر آئیں اور جب یہ صورت قاسم کے بالکل سر کے اوپر آ گئی۔ تو قاسم نے اُسے سنبھالنے کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھوں میں آ گئی۔ قاسم نے بہت آہستہ سے اُسے چٹان پر لٹایا۔ آسمانی رنگ آنکھوں نے تعریف اور شکریہ سے قاسم کی طرف دیکھا۔ نظروں کے دوچار ہوتے ہی قاسم کے قلب میں ایک نئی قوت خطروں کو جھیلنے کی ایسی پیدا ہوگئی کہ اُن خوبصورت آنکھوں میں تعریف اور شکریہ کی جو روشنی چمک رہی تھی۔ وہ گل نہ ہونے پائی۔

قاسم جھک کر تھور فریدا کے کان میں ہمت بڑھانے کے لیے کچھ کہنے کو تھا کہ رسّی کو یک لخت جنبش ہوئی۔ اوپر نظر کی۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ اُسی کھڑکی سے ایک اور صورت باہر نکلی ہے اور رسّی کو پکڑے جھونکے کھاتی نیچے چلی آتی ہے۔ مگر رسّی پر گرفت مضبوط نہیں ہے۔ ہاتھ کمزور پڑ گئے ہیں۔ اتنے میں رسّی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ایک زور کی چیخ اس گرتی صورت کے منہ سے نکلی۔ اندیشہ ہوا کہ چٹان کی کگر سے ٹکر کھا کر سیدھی غار میں گر کر چکنا چور ہو جائے گی۔ قاسم کھڑا تو ہو ہی گیا تھا۔ فوراً ہاتھ پھیلا دیئے ہاتھ پھیلانے تھے کہ قاسم کے ہاتھوں اور سینے سے وہ گرتی صورت اس زور سے ٹکرائی کہ قاسم لڑکھڑایا اور سمجھا کہ دونوں چٹان سے نیچے غار میں گر رہے ہیں۔ غار بھی وہی مہیب اور خوفناک جس کے منہ پر ایک بہت بڑا گدھ پَر پھیلائے چکر کاٹ رہا تھا۔ صرف یہی نہ تھا۔ اس خوف کی ساعت میں بہت سے تصور بند تھے۔ ان میں سب سے زیادہ دل شق کرنے والا خیال یہ تھا کہ وہ گورے رنگ کی مہ جبین اسی چٹان پر بے آب و دانہ اکیلی بیٹھی سوکھ سوکھ کر ختم ہوگئی ہے۔ گدھ اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ یا یہ خیال بندھتا تھا کہ کسی نے اس کو چٹان پر تنہا بیٹھے دیکھ لیا ہے اور گرفتار کر کے پھر اُسے قید میں ڈال دیا ہے۔ یا قید سے بھی بدتر عذاب پہنچا کر اس کی جان لی جاتی ہے۔ اس قصد سے کہ یہ

مہیب خیالات کوئی عملی شکل اختیار نہ کرنے پائیں۔ قاسم نے نہایت زبردست کوشش سے اپنے تئیں سنبھالا۔ اوپر کا دھڑ چٹان پر لٹکا دیا۔ جس گرتی صورت کو سنبھالنا چاہا تھا۔ وہ اسے برابر لپٹی رہی۔ باوجود سخت کوشش کے قاسم کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دھڑ چٹان پر سے نیچے کو کھسک رہا ہے اور اب کوئی دم میں غار میں گر جائے گا۔ مگر کسی نے اس کی دونوں کلائیاں زور سے پکڑ لی ہیں اور نیچے کو کھسکنا اب بند ہو گیا ہے۔ قاسم نے فوراً چٹان کی گگر کے نیچے ایک جگہ اپنے گھٹنے اڑا دیئے اور ایک مرتبہ پھر سخت کوشش کر کے چٹان کے اوپر آ گیا جن ہاتھوں نے اس کی کلائیاں پکڑی تھیں۔ وہ تھور فریدا کے ہاتھ تھے۔ آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ لبوں پر تعریف کے جملے تھے اور ہاتھ اس صورت کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ جس نے اپنی اور قاسم کی جان لینے میں کچھ باقی نہ رکھا تھا۔ اب وہ صورت بے جان ہو کر چٹان پر پڑی تھی۔ تھور فریدا نے کہا۔ ''یہ پری ہے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ میرے ساتھ ہی وہ بھی اس قید سے نکلے گی۔ عورتوں کی باتیں آپ جانتے ہی ہیں۔ دنیا سے نرالی ہوتی ہیں''۔

جب پری کے حواس کچھ درست ہوئے۔ تو قاسم نے ان دونوں عورتوں کو چٹان سے نیچے اُتارنے کی فکر کی۔ رسّی کے سرے جہاں سے جڑے تھے۔ ان کو کھولا اور ایک سرا پکڑ کر گھسیٹا تاکہ کھڑکی کی سلاخوں میں سے رسّی نیچے کھنچ آئے۔ جب رسّی نیچے آ گئی۔ تو ایک سرا اس کا چٹان کے ایک کونے سے جہاں پتھر باہر کو نکلا ہوا تھا۔ خوب مضبوط باندھ دیا۔ اکہرے ہونے پر بھی رسّی اتنی مضبوط تھی کہ ایک آدمی کا بوجھ سہار لے۔ بالخصوص موجودہ صورت میں جبکہ اُتار بالکل سیدھا نہ تھا۔ بلکہ ڈھلوان تھا اور قدموں کو کنکروں اور پتھروں کا کچھ سہارا مل سکتا تھا۔ رسّی اکہری ہو کر اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ اس رستہ تک جہاں سے قاسم چڑھا تھا۔ پہنچ گئی۔ اس میں تھوڑی تھوڑی دُور پر گرہیں بھی تھیں۔ تاکہ گرفت اچھی طرح ہو سکے غرض۔ پہلے ایک اور پھر دوسری عورت نے نیچے اُترنا شروع کیا۔ ہاتھوں سے رسّی کو مضبوط پکڑے ہوئے پاؤں کنکروں اور کنلوں پر کہیں ہلکے سے اور کہیں زور سے ٹکاتی ہوئی نیچے اُتر آئیں۔ سب کے بعد قاسم اُترا۔ رسّی کو جس پتھر میں باندھا تھا۔ وہاں سے چھڑوا نہ سکا۔ مجبوراً اُسے اسی طرح چھوڑا اور اب یہ تینوں حسن کے گھر کی طرف چپ چاپ روانہ ہو گئے۔

عورتوں کے پہنچتے ہی حسن نے ان کی روانگی میں مطلق دیر نہ کی۔ برقعے پہلے سے تیار تھے۔ ان کو پہن کر دونوں سر سے پاؤں تک ڈھک گئیں۔ صرف آنکھوں کی جگہ کپڑے میں

سوراخ تھے۔ تھور فریدا کے گورے ہاتھ پاؤں۔ چہرہ اور سنہری بال اخروٹ کی چھال کے پانی سے رنگ کر سانولے اور سیاہ کردیئے گئے۔ اس عرصہ میں قاسم نے ایک مختصر سا خط بہرام کے نام لکھا۔ مگر اس کا دل یہی کہتا تھا کہ ان عورتوں کی روانگی کے لئے جو کچھ انتظام کیا گیا ہے۔ وہ ہرگز قابل اطمینان نہیں ہے۔ بار بار یہی خوف اور اندیشہ پیدا ہوتا تھا کہ کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے۔ قاسم نے حسن سے کہا کہ میں خود کچھ دور تک ان عورتوں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ حسن نے اجازت دی۔ مگر بہت کچھ تامل کے بعد۔

اب قاسم اور وہ سرخ ریش بڈھا۔ تھور فریدا اور پری چاروں شہر کے ارادے سے چل پڑے۔ رستہ اتنا تنگ تھا کہ صرف دو آدمی برابر برابر چل سکتے تھے۔ آگے آگے وہ پیر مرد اور پری اور پیچھے پیچھے کسی قدر فاصلے سے قاسم اور تھور فریدا چلے۔ یہ کی طبیعت مرعوب ہوئی جاتی تھی اور بار بار یہی خوف ہوتا تھا کہ دیکھئے اس بدبخت شہر سے وہ کیونکر صحیح سلامت نکلتی ہے۔ اب یہ لوگ اس پہاڑی سرنگ کے قریب آ گئے۔ جس میں دروازہ تھا اور دروازے پر دو خونخوار چیتے زنجیروں میں بندھے پاسبانی کرتے تھے۔ آخر کار تھور فریدا نے اس سکوت کو توڑا اور عربی زبان میں قاسم سے بہت چپکے سے کہنے لگی۔ ''آپ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا اور اب پھر اسے خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آخر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں''۔

قاسم نے جواب دیا۔ ''اس بہشت یا دوزخ کی ملاقات تو آپ کو یاد ہوگی۔ وہاں جو کچھ آپ نے فرمایا تھا۔ اُسے میں بھولا نہیں اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے''۔

تھور فریدا نے ایک آہ سرد کھینچی۔ آواز نہایت شیریں تھی۔ مگر معلوم ہوتا تھا۔ دل میں کوئی غم ایسا ہے۔ جو بے اختیار آنکھوں میں آنسو لئے آتا ہے۔ کہنے لگی ''میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ میرا شکریہ قبول فرمایئے، لیکن آپ کو اپنا بھی کچھ خیال ہونا چاہئے۔ آپ کی جان بہت خطرے میں ہے۔ جس طرح ہو۔ اس منحوس شہر سے نکل کر کہیں چلے جایئے۔ اگر آپ ہمارے ہی ساتھ چلیں۔ تو..........'' اتنا کہہ کر تھور فریدا خاموش ہوگئی اور اس طرح خاموش ہوئی۔ جیسے زبان بے قابو ہو کر سب کچھ کہہ دینا چاہے۔ مگر طبیعت فوراً اس کو روک دے، قاسم کو انتظار رہا کہ تھور فریدا آگے کچھ کہے گی، لیکن جب وہ کچھ نہ بولی۔ تو کہنے لگا۔ ''میں کیونکر یہاں سے جا سکتا ہوں، حسن سے وعدہ کر چکا ہوں کہ ابھی یہیں رہوں گا''۔ قاسم نے یہ جملہ کہا تو مگر دل کو سخت گراں گذرا۔ کیونکہ اس کی طبیعت بے قرار تھی اور چاہتا تھا کہ تھور فریدا کو وہ خود شہر کے

دروازے اور وادی اَلموت کی سرحد سے بلکہ پہاڑوں اور صحرا کی حدود سے بھی باہر اور اگر ممکن ہو۔ تو بلاد کفار تک جہاں تھور فریدا کے عزیز و اقارب رہتے تھے۔ حفاظت سے پہنچا دے۔

تھور فریدا نے پھر باتیں کرنی شروع کیں اور کہا ''آپ نے ان لوگوں سے جو وعدے کر لئے ہیں۔ وہ سب فضول ہیں۔ یہ بد بخت نہایت موذی اور شریر ہیں۔ میں آپ کو ان سے خبردار کئے دیتی ہوں۔ ان بے ایمانوں سے کوئی وعدہ بھی آپ کیجئے۔ اس کی پابندی آپ پر لازم نہیں ہو سکتی''

قاسم: ''مگر میں نے یہ وعدہ حسن سے کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی نیت اچھی ہے یا بُری۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ بغیر اس کی مدد کے میں آپ کو دوزخ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس حد تک تو ضرور حسن نے آپ کی جان بچائی ہے اور اسی احسان کے بدلے میں نے اس کی جان بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ حساب برابر ہوا''۔

تھور فریدا کسی قدر تیز ہو کر بولی۔ ''نہیں، حساب برابر نہیں ہوا۔ ہاں اگر وہ آپ کی جان بچاتا۔ تو......'' اتنا کہہ کر تھور فریدا پھر پہلے کی طرح چپ ہو گئی۔ مگر قاسم اس مرتبہ کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر کے بعد تھور فریدا خود ہی کہنے لگی اور اب اس کی آواز صاف تھی۔ تیزی یا غصہ مطلق نہ تھا۔ ''میری یہ مجال نہ ہونی چاہئے کہ میں دوسروں کی جان خطرے میں ڈالوں۔ میں کسی کی نظر میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ اگر کچھ ہوں۔ تو صرف ایک شخص کی نظر میں ہوں۔ مگر اسے اتنی بھی خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ دنیا میں صرف وہی ایک شخص ہے۔ جس کا فرض ہے کہ میری مدد کرے'' ان باتوں میں یہ دونوں سرنگ والے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ سرخ ریش قفل کھولنے لگا۔ چیتے اس کو پیار سے لپٹنے اور پری کو دیکھ کر غرانے لگے۔ قاسم اور تھور فریدا نے چال آہستہ کی اور تھور فریدا نے آواز ہلکی کر کے کہا۔ ''اور وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ مگر جو پیچ پڑ گیا ہے۔ اسے میں ہی خوب سمجھتی ہوں۔ وہ لوگ اُسے میرے حال کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ اس کی ماں مجھ سے جلتی ہے اور اس کا باپ بیٹے سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ ایک ایسی یتیم لڑکی سے شادی کرنی چاہتا ہے۔ جس کے پاس زر ہے۔ نہ زمین سارا قصہ یہ ہے۔ بس اب میں آگے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیجئے اب ہم جدا ہوتے ہیں۔ آپ کو خدا کے سپرد کیا۔ میں کسی طرح آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی، لیکن بھول جانا مجھے نہیں آتا۔ آپ کو ہرگز نہ بھولوں گی''۔

اُدھر چیتے بھوک میں تیز دانت اور خونی آنکھیں دکھا رہے تھے۔ اِدھر یہ دونوں ایک

دوسرے سے رخصت ہو رہے تھے۔ تھور فریدا کا چہرہ برقع میں چھپا تھا، لیکن جب آخری جملے منہ سے نکلے تو آواز پر گریہ کا اثر تھا اور اب وہ قاسم سے جدا ہو کر آگے بڑھی۔ سرنگ والے دروازے میں داخل ہوئی۔ داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ قاسم بت بنا کھڑا رہا۔ دل میں ایک کشمکش تھی۔ جس نے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ یہ بھی خبر نہ تھی کہ دونوں چیتے لپک لپک کر اس کی طرف آتے اور زنجیروں سے رک کر غل مچاتے ہیں۔ قاسم آخر کار مڑا اور حسن کے گھر کی طرف چلا۔ جو درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔

جب حسن کے گھر پہنچا۔ تو دونوں مل کر ایسی تدبیریں سوچنے لگے کہ شیخ الجبل نے کل شب کو حسن کے قتل کے لئے جو منصوبے کئے ہیں۔ وہ کسی طرح ناکام رہیں اور حسن کو موت سے جو اس کے لئے تجویز ہو چکی ہے۔ بچا لیا جائے۔ جو طریقہ حسن کی جان بچانے کا اس وقت سوچا گیا تھا۔ وہ بہت پیچیدہ تھا۔ اس طریقہ کو قصہ میں وہاں بیان کرنا بہتر ہوگا۔ جہاں قاسم کو فی الواقع اس سے کام لینا پڑا۔ اگر پہلے ہی بتا دیا۔ تو جلال الدین اس وقت سن کر پھر جب وہ اپنے موقع پر بیان کیا جائے گا۔ سنتے سنتے سو جائے گا اور قصہ کی اور بہت سی دلچسپ باتیں بھی اس کے سننے سے رہ جائیں گی اس وقت تو صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ حسن کو اس بات کا بڑا دعوے تھا کہ آلات حرب بنانے اور آتش یونانی تیار کرنے میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ گویا دشمن کے حملے سے اپنے کو بچانا وہ خوب جانتا ہے، لیکن قاسم کو ان دعووں پر مطلق اطمینان نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے قاتل فدائی مقرر ہوئے تھے اور فدائیوں کی مثال کہ وہ شیخ الجبل کے حکموں کو کس طرح مانتے ہیں۔ آج ہی دیکھ چکا تھا اس لئے اسے اپنی زرہ کا خیال آیا کہ حفاظت کے لئے وہ بہترین شے ہے۔ چنانچہ وہ زرہ اُتار کر قاسم نے حسن کو دی۔ بچو! اب آگے صرف ایک شبانہ روز کے واقعات تمہیں سناؤں گا۔ یعنی اس رات سے جس میں تھور فریدا کو قید سے نکالا۔ دوسرے دن شام تک جب کہ قاسم کو قلعہ اَلموت کے دروازے پر حسن کے قتل میں مدد دینے کے لئے حاضر ہونا پڑا۔ کیا کیا حالات پیش آئے۔

جب قاسم اور حسن نے تمام تدبیریں سوچ لیں۔ تو یہ فیصلہ ہوا کہ قاسم اس وقت شہر کو واپس چلا جائے۔ چنانچہ حسن نے اس سے کہا۔ میرا ملازم جو یہاں تک آپ کو لایا تھا۔ اس کا نام فضل ہے۔ یہ نام عام طور پر کسی کو معلوم نہیں ہے۔ بہر کیف اس وقت جب وہ ان مستورات کے ساتھ جانے لگا۔ تو میں نے اُسے سمجھا دیا کہ سرنگ والے دروازے کو ادھر سے مقفل نہ

کرے۔ کواڑ یونہی بھیڑ کر آگے بڑھ جائیے۔ غرض دروازہ اب آپ کو مقفل نہ ملے گا۔ چیتوں سے آپ نہ ڈریئے گا۔ قفل کے ساتھ نہ ہونے سے وہ ضرور آپ پر جھپٹیں گے، لیکن ایک شیشی میں آپ کو دیتا ہوں۔ اس میں سے عرق کے چند قطرے ان جانوروں کے قریب زمین پر چھڑک دیجئے گا۔ اس کے بعد ان کا غصہ جاتا رہے گا اور وہ خوش ہو کر چپکے بیٹھ جائیں گے"۔

اب حسن نے ایک چھوٹی سی شیشی دے کر قاسم کو رخصت کیا۔ قاسم جب روانہ ہو گیا تو حسن نے اس زرہ کو غور سے دیکھ کر گردن ہلائی کہ گویا وہ بہت ہی نادر چیز ہے اور یہ کہا۔ 'کسی نے خوب کہا ہے کہ دشمنوں کی کھال کھینچو اور دوستوں کے کپڑے اتار لو۔ قاسم گو نو عمر ہے۔ مگر بڑا وفادار اور بیدار مغز معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو اس قسم کا آدمی ہے کہ اگر میں اپنے والد مہربان کو بھی اس دنیا سے چلتا کرنا چاہوں۔ تو میری مدد کرنے میں دریغ نہ کرے۔ اس کا یہ شوق کہ کسی طرح ہمارے طریقے کے راز معلوم کرے۔ ہمارے حق میں بہت مفید ہے لیکن اگر اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس ریاست کی گدی پر مجھے بٹھانے میں اس نے مدد کی۔ تو اسے بالکل مایوس ہونا پڑے گا۔ کیونکہ پھر یہ سارا ورق ہی اُلٹ جائے گا اور یہاں کا کوئی راز راز نہ رہے گا۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہو۔ آگے دیکھا جائے گا"۔

قاسم حسن سے رخصت ہو کر اسی تنگ پہاڑی رستہ سے جس سے یہاں پہنچا تھا۔ شہر کی طرف جانے لگا۔ سرنگ والے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو چیتے اس کو دیکھتے ہی غراتے ہوئے لپکے۔ قاسم نے کچھ دُور کھڑے رہ کر شیشی سے عرق کے قطرے زمین پر چھڑک دیئے۔ عرق کے چھڑکتے ہی اس سے نہایت سخت بدبو پیدا ہوئی۔ مگر چیتے فوراً ہی بیٹھ گئے اور اس طرح غرغر کرنے لگے۔ گویا اس بدبو سے انہیں بہت ہی راحت پہنچ رہی ہے۔ اب قاسم بے خوف ان درندوں کے بیچ میں سے گذرتا ہوا دروازے پر پہنچا کواڑوں کو دکھا دیا۔ وہ کھل گئے۔ اب وہ سرنگ میں سے ہوتا ہوا پھر کھلے راستہ پر آ گیا۔

غرض کسی طرح شہر میں داخل ہو کر سرائے کی طرف چلا، لیکن بازاروں اور سڑکوں کی کچھ عجیب کیفیت دیکھی۔ رات بے شک ہو گئی تھی۔ مگر ابھی زیادہ نہ گئی تھی۔ بازاروں میں یہ بڑی چہل پہل کا وقت تھا۔ مگر چہل پہل کیسی۔ دکانیں یا تو بند تھیں۔ یا جو کھلی تھیں۔ ان میں چراغ تک نہ تھا اور نہ سڑک پر کہیں لوگوں کا کوئی مجمع نظر آتا تھا۔ گھر تمام تاریک پڑے تھے۔ کہیں سے روشنی کی جھلک یا گانے بجانے کی آواز مطلق نہ آتی تھی تمام شہر پر خاموشی طاری تھی اور

خاموشی بھی اس قسم کی جیسے طوفان کے آنے سے پہلے ہوا بند ہو کر ہر چیز پر مردنی سی چھا جائے۔ قاسم بالکل اکیلا رستہ پر چلتا رہا۔ جدھر دیکھتا تھا، آثار ایسے ہی معلوم ہوتے تھے کہ کوئی سخت آفت عنقریب نازل ہونے والی ہے۔ سرائے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سب خیریت ہے۔ مگر دل میں ایک ڈر سا بیٹھ گیا تھا۔ گو پتا نہ چلتا تھا کہ کس بات کا ڈر ہے۔ سرائے میں مطلق دل نہ لگا۔ جس طرح بیٹھا تھا پھر اسی طرح اندھیری رات میں نکل کھڑا ہوا۔ سنسان بازاروں اور کوچوں میں پھرتے پھرتے کیا دیکھتا ہے کہ ایوب حکیم کے دروازے پر کھڑا ہے۔ حیران ہوا کہ بلا قصد یہاں کیسے پہنچ گیا۔ دل سے پوچھنے لگا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ عقل نے جواب دیا، کسی مصیبت کے عنقریب آنے کی خبر تو پہلے ہی سے دے رہے تھے۔ جس عورت کو قید سے چھڑانے میں مدد کی ہے۔ اس کی نسبت بھی تمہیں خطرے نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے تمہارے یہاں پہنچنے کا مطلب یہی معلوم کرنا ہے کہ اس بد بخت شہر سے اس کے فوراً نکلنے کا سامان ہو گیا ہے یا نہیں۔

ایوب کے مکان پر بالکل اندھیرا چھایا تھا۔ دروازے پر دستک دی، کسی نے بہت ڈرتے ڈرتے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور اندر ہی سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

قاسم: ''میں اصفہان کا قالین فروش ہوں۔ اپنے دوست بہرام سے ملنے آیا ہوں''۔

کواڑوں کے پیچھے سے آواز آئی ''آپ بہت ہی بے وقت اور بے موقع آئے ہیں''۔ اس کے بعد کسی نے بہت ہی تامل اور تذبذب کے ساتھ دروازہ پورا کھول دیا۔'' قاسم نے دیکھا۔ تو دروازہ کھولنے والا خود ایوب حکیم تھا۔ قاسم سمجھا کہ یہ احتیاط اس وجہ سے کی گئی ہے کہ دو عورتیں گھر میں موجود ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی موجودگی کی اطلاع کسی کو نہ ہو۔ ایوب نے بہت ہی دبی آواز سے کہا۔ ''آپ کے دوست بہرام بالا خانہ پر اپنے فن کا شغل فرما رہے ہیں''۔ یہ کہہ کر ایوب قاسم کو اوپر کے کمرے میں لے گیا۔ جہاں بہرام شاعر اُترے ہوئے تھے۔ قاسم کو دیکھتے ہی بہرام ہڑ بڑا کر اُٹھے اور پھر اسی پرانے ولولۂ شوق اور جذبۂ محبت کا اظہار کر کے دوست کا خیر مقدم کرنے لگے اور کسی قدر طنز کے انداز میں خندہ پیشانی سے بولے ''واللہ! یہ بھید تو اب کھلا ہے۔ اب تو ماشاء اللہ آپ بڑے بڑے کاموں میں مصروف ہیں۔ محض قالین فروشی اور بے کسوں کی گلو خلاصی یا بے کار نمازیں پڑھنی ہی آپ کا شغل نہیں رہا ہے بلکہ مضمون کچھ اور ہی ہو چلا ہے لیکن یار عزیز میں نے تو آپ کا قصور پہلے ہی معاف کر دیا ہے کیونکہ آپ کی اس عنایت میں بھی نغمہ کی قوت سے ایک نئی دنیا کو مسخر کرنے کا موقع مجھے ملتا

ہے۔ ظاہر ہے کہ ولایت فلسطین کے بہت سے شہر آج کل ایک جاہل اور وحشی قوم کے قبضے میں ہیں لیکن باوجود اس کے وہاں وہ نعمتیں موجود ہیں کہ دشت وصحرا میں بھوک پیاس کی تکلیفیں اُٹھانے اور زاہدان خشک کے اس ڈربے میں بندر ہنے کے بعد وہ بڑی تسکین وہ چیزیں ثابت ہوں گی۔ ان تمام شہروں میں مسلمان تاجر بکثرت آباد ہیں اور ان باہر کے وحشیوں کی عورتوں کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے زیور، انگوٹھی چھلّے، ہار، پرندوں کے خوبصورت پر، کار چوبی کام کے کپڑے فروخت کر کے خوب روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔ پس یقین کامل ہے کہ جب یہ طوطی شکر زبان ایک اختر تابندہ کی مثل ان کے مطلع تاریک پر طلوع کرے گا۔ تو مسرت انگیز نعروں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر کے اپنی دولت کا بیش قدر حصہ بطور نذرانے کے اس کے سامنے حاضر کریں گے۔ علاوہ بریں ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ فلسطین میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں۔ دودھ کو تو چھوڑیئے معدہ اتنا ضعیف ہے کہ اس سے کہیں زیادہ مشروبات مقوی و مُسکن کی ضرورت رہتی ہے، لیکن اب یہ سننے میں آتا ہے کہ دودھ اور شکر کی جگہ بادۂ ناب کے چشمے اُبل پڑے ہیں اور مہ جبینانِ فرنگ کی وہ کثرت ہے کہ سارا ملک رشک پرستان بنا ہوا ہے، کیونکہ وہ وحشی اس ملک پر قابض ہیں۔ گو وہ جاہل اور کُندۂ ناتراش ہیں۔ مگر اتنا وصف ضرور رکھتے ہیں کہ شراب کے بے حد قدردان ہیں...... وہ کیسی مبارک ہوگی۔ وہ سرزمین جہاں لبنان کی شراب یونان کی شراب وافرنجہ کی شراب نصیب ہوتی ہوگی۔ رہیں وہ پرستان کی پریاں............"

بہرامؔ کی اس ناپاک تقریر پر ایوب بہت ہی مکدر ہوا اور اس خوف سے کہ خدا جانے آگے ہو کیا کہنے والا ہے۔ بہرام کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "بہرام خدا کے لئے زبان تالو سے لگاؤ"۔ ان نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کو تو معاف رکھو۔ کیا عصیان پرستی کا سبق پڑھا کر ان کو بھی غارت کرو گے"۔

بہرام: "بھلا میں ان حضرت کو کیا سبق پڑھاؤں گا۔ ان کے قدم تو پہلے ہی حرم عشق کے مقدر سے مقدس مقام میں پہنچ چکے ہیں۔ میں کسی بُری بات کی ترغیب ان کو نہیں دیتا۔ بلکہ ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ عورت اور بربادی ایک بات ہے"۔

ایوب نے چیخ کر کہا "رحم کرو، اپنے فسق وفجور کے یہ مقولات اس نوعمر لڑکے کے سامنے نہ دہراؤ"۔

قاسم نے کہنا چاہا۔ "مگر یہ تو فرمایئے......" لیکن بہرام کس کی سنتا تھا۔ ایوب کی بات پر

جھلا کر بولا''۔میری باتیں فسق وفجور کی نہیں ہیں۔اگر صبر کے ساتھ اخیر تک میری بات سنئے گا۔ تو معلوم ہو گا کہ میرے مقولات مصلح اخلاق ہیں۔مخرب اخلاق نہیں ہیں۔یہی نوجوان جو یہاں......مگر میں انہیں کیوں الزام دوں ایک زمانہ ہمارا بھی ایسا ہی رہ چکا ہے۔اب تو یہ قدم وادی عمر میں نیچے اُتر رہے ہیں۔ایک وقت وہ بھی تھا کہ ہم بھی غیرت مجنوں اور رشک فرہاد تھے۔کوچہ عشق والفت میں ٹھوکریں کھا کر جتنے سبق ہم نے حاصل کئے تھے۔دوسرا کوئی کیا حاصل کرے گا۔غرض میرے کہنے کی یہ ہے کہ ہماری بیتی سُن کر یہ نوجوان نصیحت پکڑے،حُسن عجب چیز ہے۔گلیوں اور بازاروں میں بھی اس کے پھول اسی طرح کھلتے ہیں جیسے گندے تالاب کی سطح پر نیلوفر اپنی بہار دکھاتا ہے۔مگر ان پھولوں اور گندے پانی کے نیچے کیچڑ ہوتی ہے اور ایسی ہوتی ہے کہ پاؤں دھنسے پر ہاتھی بھی ہو۔تو نہ نکل سکے۔عورتوں کی دلفریبیاں ہمارے لئے ایک بے معنی چیز ہیں۔ہمارا عیش ورنگ تو اسی میں رہ گیا ہے کہ ساغر کا شراب سے عقد کرتے رہیں۔میں اس نوجوان کو کیا گمراہ کرونگا۔یہ تو خود مجھے گمراہ کرنا اور اس پیری میں میرے سپید بالوں کو پھر محبت کے پھندوں میں الجھانا چاہتا ہے۔اگر یہ نہیں ہے۔تو پھر ان دین وایمان کی غارت گرنیوں کو کیوں میرے حوالے کیا ہے؟''

قاسم کا منہ غصہ سے لال ہو گیا اور بولا''دین وایمان کی غارت کرنے والیاں!یہ جملہ آپ نے کیا کہا۔یہ تو دو ستم رسیدہ عورتیں ہیں۔جن کی جان خطرے میں ہے۔میں نے ان کو اس خیال سے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ فلسطین جا رہے ہیں۔ان کو حفاظت سے وہاں پہنچا دیں گے،لیکن یہ میری سخت نادانی تھی کہ میں نے ایسا کیا''۔

ایوب:''اس میں شبہ نہیں کہ یہ آپ کی بڑی غلطی تھی۔مگر شکر ہے کہ غلطی کی اصلاح وقت پر ہو گئی''۔

قاسم نے سخت متعجب ہو کر ایوب سے پوچھا۔''اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''لیکن پیشتر اس کے کہ ایوب کچھ جواب دے۔بہرام نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔''واللہ کیا تجاہل عارفانہ ہے۔گویا کوئی مطلب ہی آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔سچ ہے ایسے گل نوخیز کو جس کہ بہار بھی شروع ہوئی ہے۔مرجھانے سے پہلے ہاتھ سے دے دینا کس کو گوارا ہو سکتا ہے اور پھر ایک ہی نہیں،دو دو ہیں۔یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ آپ ایک پر کفایت نہ کر سکے۔پھر ایسے دو پھولوں سے جدائی کس کا جگر ہے کہ اس صدمہ کو برداشت کر لے۔یہی وجہ ہے کہ قہر کی صورت بن کر ہم پر جھوٹ موٹھ کی آگ برسانے تشریف لائے ہیں۔دیکھئے یہ تماش بینی اور عیاشی بھی

بُری بلا ہے۔ مکاری بھی اس سے پیدا ہو جاتی ہے"۔

قاسم بہرام کے منہ سے یہ جملہ سُن کر آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا۔ "ارے پُرانے گنہگار۔ اب مجھ کو تجھ پر ہرگز اعتبار نہیں رہا۔ اب میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ یہ عورتیں تیرے ساتھ سفر کریں۔ فوراً ان دونوں کو میرے سپرد کر۔ میں ان کے سفر کے لئے کوئی اور بندوبست کروں گا"۔ قاسم آگے کچھ کہتا، لیکن ایوب کے چہرے کی پریشانی دیکھ کر چپ ہوا۔

ایوب نے کہا "صاحبزادے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ ہماری توہین کریں۔ بے شک بہرام کی گفتگو افسوس کے قابل ہے لیکن ہم اب ان عورتوں کے ذمہ دار نہیں ہیں......"

بہرام بیچ میں بول اُٹھا۔ "لیجئے۔ یہ لطیفہ ہی کچھ اور ہے۔ پہلے گھر میں نقب لگا کر خود مال غائب کیا اور پھر اسی گھر پر چڑھائی کر کے مال مسروقہ طلب فرماتے ہیں"۔

قاسم کو ایسی سخت گفتگو سُن کر مطلق تاب نہ رہی اور کہنے لگا۔ "ان عورتوں کو فوراً میرے حوالہ کر دو۔ ورنہ میں تم کو مجبور کروں گا۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

بہرام نے قاسم کو کنکھیوں سے دیکھ کر پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ "کہاں ہیں! بھیڑیے نے بھی بھیڑ کے بچہ کو کھا کر اس کی ماں سے یہی پوچھا تھا"۔

اتنا سُن کر قاسم کو اب مطلق ضبط نہ رہا۔ دوڑ کر بہرام کے دونوں شانے پکڑ کر اُسے خوب جھنجوڑا۔ شاید اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی، لیکن ایوب نے قاسم کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا۔ "یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ بہرام بے شک سزا کے قابل ہے، لیکن اس قصور میں نہیں۔ عورتیں دونوں ایک معقول مرد کے ساتھ بے شک یہاں آئی تھیں۔ ہم نے ان کی بہت عزت کی اور کمرہ علیحدہ ان کے لئے مخصوص کر دیا لیکن وہی مرد جس کے ساتھ وہ آئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آیا اور کہنے لگا کہ قاسم نے ان کے سفر کے لئے دوسرا بندوبست کیا ہے اور انہیں واپس بلایا ہے۔ اس پر ہم نے ان دونوں عورتوں کو اُسی مرد کے حوالے کر کے رخصت کیا"۔

گیارھواں باب

اتنا سنتے ہی قاسم ایوب کے گھر سے بھاگا۔ اس حرکت پر طبیب اور شارع دونوں حیرت میں رہ گئے۔ قاسم اس خیال پر پیچ و تاب کھاتا بھاگ رہا تھا کہ دیکھو اس لال ڈاڑھی والے فضل نے کیسا دھوکا دیا ہے مگر اس کا کیا قصور، وہ تو نوکر ٹھہرا۔ یہ تمام فریب یا تو شیخ الجبل کا ہے یا حسن کا اگر حسن نے یہ دغا بازی کی ہے تو اس سے اچھی طرح سمجھوں گا۔ قاسم کو اس وقت نہ اپنے ہاتھ پاؤں کا خیال تھا نہ جان کا۔ اندھیری رات میں اس تنگ پہاڑی رستہ پر بے تحاشا بھاگتے بھاگتے آخر کار وہاں پہنچا جہاں پہاڑ میں سرنگ تھی۔ سرنگ کے اندر جا کر اس کے اخیر میں جو دروازہ تھا اسے کھولنا چاہا۔ مگر وہ دوسری طرف سے مقفل تھا۔ دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ کواڑوں کی دھڑ دھڑ اور سرنگ میں ان کی گونج کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چیتے جو دروازے کے دوسری طرف بندھے رہتے تھے ان کے غرانے یا دہاڑنے کی آواز بھی کانوں میں نہ آئی۔ سر پر ایک جنون سوار تھا اور غصہ سے کلیجہ پھُکا جاتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر سرائے میں آیا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے تھک کر چُور ہو گیا تھا۔ لیٹتے ہی نیند نے آنکھیں بند کر کے صبح تک تمام تکلیفوں سے آزاد کر دیا۔

دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی وہی بے قراری اور پریشانی پھر شروع ہو گئی۔ کل دن کو جو جو باتیں پیش آئی تھیں ان کو نہایت رنج و تشویش کی حالت میں سوچتا رہا۔ آج شام سے پہلے کوئی کام جس سے کوئی مفید نتیجہ نکلے کرنے کو نہ تھا سوچنے لگا کہ شام کا انتظار کیوں کروں۔ کل جس قدر باتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ وہ درحقیقت میرے آزمانے کی پیش بندیاں تھیں۔ اس آزمائش میں مَیں پورا نہ اُترا۔ اپنی قسم کا میں پابند نہ رہا۔ شیخ الجبل کے دشمن کی اعانت کی جو حقیقت میں اس کا دشمن نہیں ہے۔ بلکہ مجھے دھوکا دینے کو دشمن بن گیا ہے۔ شیخ کی حرم سرائے سے دو عورتوں کی فراری میں مَیں نے پوری پوری مدد کی بس، اب شام کو جو قلعہ میں طلبی ہوئی

ہے۔ وہ کسی خاص کام کے لئے نہیں ہے بلکہ طرح طرح کے عذاب اور ایذائیں پہنچا کر میری جان لینے کے لئے ہوئی ہے۔ عذاب بھی وہ جو حشیشیوں اور ان کے بادشاہ کے سامنے حلف اطاعت لے کر اس کے توڑنے میں ایک مجرم فدائی کو دیئے جاتے ہیں۔ بس بہتر یہی ہے کہ ابھی یہاں سے بھاگ جاؤں بلا سے کوئی گرفتار کر لے یا تعاقب کرے مگر یہاں سے کسی طرح نکل جاؤں، یہ سوچ کر اُٹھا اور نوکروں سے کہا سفر کے لئے تیار ہو جاؤ مگر مُنہ سے یہ لفظ نکلے ہی تھے کہ ایک صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ جو نہایت شیریں آواز سے کہتی تھی ''میں نہ بھولتی ہوں اور نہ بھولوں گی''۔ قاسم اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا'' اور جو لوگ بھی ہوں مگر یہ صورت تو میرے برخلاف سازش میں نہیں ہے۔ اگر سازش میں شریک بھی ہے۔ تو ایک بے گناہ معصوم ومظلوم کی حیثیت سے۔ اگر وہ نہیں بھولتی تو میں کیونکر اسے بھول جاؤں اس بیکسی کی حالت میں اس کو چھوڑ کر یہاں سے چلا جانا کس طرح ممکن ہے۔ اس وقت وہ یا تو قلعہ اَلموت میں ہے یا حسن نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے''۔ اسی قسم کے خیالات دماغ میں چکر کھا رہے تھے کہ وہی صورت پھر نظر آئی بیقراری، اضطراب، جان کا خوف وہ جانتی بھی نہ تھی کہ کس کو کہتے ہیں۔ قاسم نے اب قطعی فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو آج شام کو قلعہ اَلموت میں ضرور حاضر ہو جانا چاہئے اور کسی بات کی تو کیا امید ہو سکتی ہے ممکن ہے اس کی آواز ہی سننی نصیب ہو جائے۔ شاید موت سے پہلے جو اس کے اور میرے لئے ایک ہی وقت میں تجویز ہو اس کی صورت ایک مرتبہ پھر دیکھ لوں''۔ قاسم نے نوکروں سے کہا کہ ابھی جانے کی تیاری نہ کرو''۔

مغرب کا وقت ہوا۔ مینار سے موذن نے اذان دی بہت سے لوگ مسجد کی طرف دوڑے بہت سے جہاں تھے وہیں نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے ختم ہونے پر قاسم قلعہ کے دروازے پر یا یہ کہئے کہ موت کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس وقت وہ فدائیوں کا سرخ وسفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایسا ہی لباس اور لوگوں کو بھی پہنے اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے قاسم کو اشارہ کر کے اپنے پاس بُلایا۔ جب قاسم قریب پہنچا تو دونوں مل کر دروازے کے سامنے بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر جو پہاڑ میں کٹی ہوئی تھیں قلعہ میں داخل ہوئے اور یہاں ایک بہت بڑے کمرے کے اندر گئے جو سامان سے بالکل خالی تھا مگر اس میں دو دو چار چار آدمی کچھ یہاں کچھ وہاں ملے ہوئے کھڑے تھے۔ قاسم نے دیکھا، کہ وہ سب فدائی تھے کیونکہ سب کے لباس سرخ وسپید تھا۔ یہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ کچھ لوگ جو فدائیوں

کے افسر معلوم ہوتے تھے کبھی باہر سے کمرے کے اندر آتے اور کسی گروہ کی طرف اشارہ کر کے اُسے کسی گوشہ میں لے جا کر چپکے چپکے حکم دیتے اور پھر باہر چلے جاتے۔

انہی افسروں میں سے ایک افسر قاسم اور اس کے ساتھی کے قریب آیا اور دونوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ قاسم سمجھا کہ ''بس اب موت کا وقت آ گیا یہ دونوں درحقیقت جلاد ہیں جو قتل کرنے کے لئے مجھے یہاں لائے ہیں'' لیکن قاسم کا یہ خیال غلط نکلا اور اس افسر نے جو اُن دونوں کو یہاں لایا تھا کہنا شروع کیا۔ ''میں تمہارا سردار مقرر ہوا ہوں۔ تم دونوں میری ماتحتی میں ہو۔ جو حکم دوں گا۔ اس کو بجالانا تم پر فرض ہوگا۔ شیخ الجبل نے تم کو ایک بڑی خدمت پر مامور کیا ہے۔ جو آج ہی تھوڑی دیر میں انجام پانی ضروری ہے۔ آج رات بہت سے لوگ جہنم واصل کئے جائینگے لیکن تمہارے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ تم حسن بن کے محمد کو جو شیخ کا نہایت نافرمان فرزند ہے جہنم کی سیر کرا دو، یہ ناخلف اپنے باپ اور ہمارے طبقے کے برخلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ صرف سازشیں ہی نہیں کرتا بلکہ شیخ کی اولاد سے ہونے کا انکار کر کے اپنے تئیں ایسے خاندان سے منسوب کرتا ہے۔ جو تقدس میں سب پر فائق ہے۔ اس کے علاوہ دعویٰ پیغمبری کر کے اپنے تئیں آسمان پر چڑھاتا ہے پس تمہارا فرض ہے کہ شیخ الجبل نے جس بڑے کام کے لائق تم کو سمجھا ہے۔ فی الحقیقت اس کے لائق اپنے تئیں ثابت کرو۔ اب عداوت اور نفرین کے صیقل پر اپنے اپنے خنجر تیز کر لو اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر اس خدمت کو حسن عمل انجام دیا۔ تو جنت میں ہمیشہ کو آسودہ کر دیئے جاؤ گے۔ اُسی جنت میں جس کی لذتوں سے شیخ الجبل نے تم کو تھوڑا بہت پہلے ہی آشنا کر دیا ہے''۔

اس تمہید کے بعد جو کام جس طرح کرنے کے تھے۔ وہ سب بتائے۔ درختوں کے چھوٹے سے غنچے میں حسن کا مکان اور مکان کے گرد باغ کا نقشہ کھینچ کر سمجھایا۔ اس مکان میں صرف تین کمرے برابر برابر تھے۔ سرے کے دونوں کمروں میں سے ایک کمرے میں حسن اور دوسرے کمرے میں حسن کا خادم رہتا تھا۔ ان دونوں کمروں کے دروازے برآمدے میں تھے۔ بیچ کا کمرہ کسی آئے گئے کے لئے تھا۔ اس کا دروازہ برآمدے میں نہ تھا۔ بلکہ اُس میں دو دروازے اندر کو تھے۔ جن میں سے ایک حسن کے کمرے میں اور دوسرا حسن کے خادم کے کمرے میں کھلتا تھا۔ قاسم کا یہ کام مقرر ہوا تھا کہ وہ حسن کے خادم کو۔ جس کی ڈاڑھی لال بیان کی گئی تھی اور جو حسن کا بڑا وفادار ملازم تھا۔ جان سے مار ڈالے۔ باقی فدائی جو ساتھ کر دیئے گئے

تھے جن کا کام حسن کو قتل کرنا تھا وقت پر ان کی مدد کرنی بھی قاسم کے ذمہ تھی، سردار نے کہا'' حسن اور اس کے ملازم کے سوا اس مکان میں اور کوئی نہیں ہے۔ حسن بہت تنہائی پسند ہے۔ سوائے مطالعہ اور سازشوں میں مصروف..........''

یہ لفظ منہ سے نکلے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ کسی نے زور سے دھڑ دھڑایا۔ سردار نے بڑھ کر دروازہ تھوڑا سا کھولا اور وہیں کھڑے ہو کر کسی آدمی سے جو باہر ہی رہا۔ چپکے چپکے باتیں کرنے لگا۔ آخر کار یہ دروازہ بالکل کھل گیا اور اب قاسم کو اس دروازے سے بڑے کمرے میں سے گذرتا ہوا جو آدمی نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس آدمی کی صورت منحوس ضرور تھی اور کسی قدر مانوس بھی تھی۔ گو یہ یاد نہ آتا تھا کہ کہاں دیکھی ہے مگر قاسم کا دل جس چیز کو دیکھ کر سہم گیا تھا وہ ایک رسّی تھی۔ جو اس آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ اس رسّی میں جابجا گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ قاسم کو ذرا شبہ نہ رہا کہ یہ وہی رسّی ہے۔ جس سے اس نے تھور فریدا اور پری کو حرم سرا سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

جب یہ خبیث صورت کا آدمی باتیں کر کے چلا گیا۔ تو سردار نے دوراز بند کر کے کہا۔ ''اس وقت ایک عجیب واقعہ سننے میں آیا ہے۔ شیخ الجبل کی حرم سرا سے دو عورتیں فرار ہو گئی ہیں اور شبہ کیا جاتا ہے کہ اس جرم کا مرتکب بھی شیخ کا فرزند ہے۔ کیونکہ اس کے خادم کو جو ایک مشہور بدمعاش ہے۔ دو برقع پوش عورتوں کے ساتھ بازار سے نکلتے ہوئے لوگوں نے دیکھا ہے۔ اخیر مرتبہ جب عورتیں نظر آئی ہیں۔ تو وہ حسن کے گھر کی طرف جاتی دکھائی دی تھیں۔ اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ اس وقت وہ حسن ہی کے گھر میں روپوش ہیں۔ پس اب ہمارا کام حسن اور اس کے خادم کو قتل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں عورتوں کو گرفتار کر کے شیخ کی حرم سرا میں پہنچانا بھی ضروری ہے مگر یہ بڑا دشوار کام ہے۔ کیونکہ حرم کی کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا یا اُسے ہاتھ لگانا سخت ناروا بات ہے لیکن خوش قسمتی سے اس وقت دو باہر کے فدائی ملک شام کے نقیب کے پاس سے سرکاری کاغذات لے کر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت اس وقت ایک قاصد کی ہے اور جہاں سے وہ آئے ہیں۔ وہیں ان کو فوراً واپس جانا ہے۔ چونکہ یہ دونوں فدائی اس ملک کے نہیں ہیں اور انہوں نے چُپ رہنے کی بھی قسم کھا رکھی ہے۔ جیسا کہ قاصد ہونے کی حالت میں ہم لوگوں کا عام طریقہ ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ان عورتوں کی گرفتاری ان کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ باقی جس قدر ہم ہیں۔ ان عورتوں کو نہ کوئی چھو سکتا ہے

اور نہ ان کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا۔ تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں''۔

سردار نے یہ کہہ کر قاسم اور اس فدائی کو جو قاسم کو قلعہ کے دروازے سے یہاں تک لایا تھا۔ بہت غور سے دیکھ کر دروازہ کھولا اور اب وہ دونوں ملک شام کے فدائی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر قاسم کے دل پر بہت اثر ہوا۔ یہ نو عمر بھولی بھولی صورت کے دو لڑکے تھے۔ جن کی ڈاڑھی مونچھ ابھی کچھ نہ نکلی تھیں۔ ایک کا قد میانہ تھا۔ دوسرا اس سے بھی چھوٹا تھا لیکن جو بات قاسم کو ان کی صورت میں عجیب معلوم ہوئی۔ وہ ان کی آنکھیں تھیں۔ یہ کچھ ایسی بے آب اور بدرونق تھیں۔ جیسے نشہ بازوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ جب سردار ان کو ہدایتیں کرنے لگا۔ تو ان کے سننے کا انداز بھی ایسا تھا۔ جیسے کوئی نیند میں کسی کی بات سنتا ہو لیکن جو کچھ ان سے کہا جاتا تھا۔ اُسے سمجھتے خوب تھے اور کبھی کبھی آہستہ سے گردن ہلا دیتے تھے۔ زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ بات کرنے کی انہوں نے قسم کھا رکھی تھی۔

اب سردار باہر جا کر سب کے لئے کھانا لایا اور کہا کہ اب آپ سب کچھ دیر کے لیے آرام کر لیں۔ فدائی جو قاسم کو قلعہ کے دروازے سے یہاں تک لایا تھا اور دونوں پردیسی فدائی کچھ کھا پی کر سو گئے مگر قاسم کو نیند نہ آئی۔ دل میں بڑے بڑے بھیانک خیال آنے لگے۔ سوچنے لگا کہ ''افسوس میں نے بھی کیسے کیسے دھوکے کھائے ہیں۔ سب سے پہلے شیخ الجبل سے دھوکا کھایا۔ پھر حسن نے تھور فریدا کی رہائی میں مجھے دھوکا دیا۔ یہ بات اب صاف ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں ساری بدمعاشی حسن کی ہے اور اس میں مطلق شبہ نہیں کہ تھور فریدا اس وقت حسن کے گھر میں ہے۔ حسن کے قتل اور تھور فریدا کی گرفتاری اور گرفتاری کے بعد خدا جانے کیسی کیسی ایذا رسانیوں کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ خود میری یہ حالت ہے کہ ادھر حسن کو قتل کرنے میں شرکت کا وعدہ شیخ الجبل سے کر چکا ہوں۔ اُدھر حسن کو یہ قول دے چکا ہوں کہ اسے ہرگز قتل نہ ہونے دوں گا اور پھر سب سے بڑھ کر کسی کا احترام جس کی نہ کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور نہ وہ بیان میں آ سکتا ہے۔ ایک پیمان وفا بن کر دل کو مجبور کر رہا ہے کہ اس وقت تھور فریدا کی عزت و آبرو بلکہ جان تک معرض خطر میں ہے۔ جس طرح ہو اس کو آفات سے بچایا جائے۔ یہ بات اب بالکل صاف سمجھ میں آتی تھی کہ حسن نے ایک نہیں بلکہ دو طرح سے دھوکا دیا ہے۔ پہلا دھوکا تو یہ کہ اپنی ہوا و ہوس کو پورا کرنے کے لئے تھور فریدا کو قید سے رہا کرنے کا کام مجھ سے لیا۔ دوسرا دھوکا یہ کہ خود موت سے بچنے کے لئے بھی مجھی کو ذریعہ بنانے کی امید رکھتا ہے۔ بے

شک حسن اسی لائق ہے کہ قتل کیا جائے اور اس کا قتل بھی میرے ہاتھ سے ہو''۔ اتنا سوچ کر کمر کے پٹکے کے نیچے ہاتھ لے جا کر ٹٹولنے لگا کہ حسن نے جو چیز دی تھی غائب تو نہیں ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ موجود ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز تھی جس سے قاسم کو قوی امید تھی کہ اُسی کے ذریعے سے حسن کی دغابازیوں کے جواب میں اس کا خون بہا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لے گا۔

غور کرنے لگا کہ حسن کو قتل کرنے کے بعد تھور فریدا کی جان اور عزت کی سلامتی کے لئے جہاں تک امکان میں ہو گا کوشش کروں گا۔ اگر کچھ نہ ہو سکا تو اتنا ضرور ہو گا کہ دونوں ساتھ ساتھ جان دیں گے۔ مرتے وقت تو کم سے کم دونوں چین سے مریں گے۔ ایسے ہی خیال دل میں پکاتے پکاتے دفعتاً محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے ہیں مگر غنیمت ہے کہ جہاں تھے وہیں موجود ہیں اور صرف موجود ہی نہیں ہیں بلکہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم میں ایک حیرت انگیز طاقت آ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قلب میں ایک عجیب قوت ہر چیز کو صاف دیکھ لینے اور خطروں سے قطعی بے خوف ہو جانے کی پیدا ہو گئی ہے اور ایسا معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ وہ ہمت کرے اور اسے نہ کر دکھائے۔ یہ ذہنی کیفیت حیرت خیز تھی۔

آخر کار تھوڑی دیر کے بعد سردار نے سوتے فدائیوں کو جگایا اور اشارہ کر کے ان کو بڑے کمرے میں لے گیا یہاں چند پاسبان موجود تھے۔ انہوں نے سردار اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں اور ان کو لے کر چلے (جن کو لے کر چلے۔ وہ سب پانچ آدمی تھے۔ ایک سردار، دو شامی فدائی، ایک قاسم اور ایک وہ فدائی جو قاسم کو قلعہ کے دروازے سے یہاں تک لایا تھا)۔ جب چلے تو قاسم سمجھا کہ پاسبان اُن سب کو پہاڑ والے تنگ راستے سے جو حسن کے گھر تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، لے جائیں گے۔ اس راستہ سے قاسم بخوبی واقف ہو چکا تھا لیکن اس پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ قلعہ کے دروازے پر جو شہر کی جانب تھا۔ بہت سی سیڑھیاں اُترنی پڑیں گی مگر سیڑھیاں نہیں اُترنی پڑیں۔ ہوا میں تازگی محسوس کرتے ہی قاسم سمجھ گیا کہ اب دروازے سے باہر نکل آئے ہیں۔ پاؤں کے نیچے بھی نرم نرم گھاس معلوم ہوئی اور یہ بھی ہوا کہ وہ ایک ڈھلوان زمین پر چل کر نیچے کو اُترتے جاتے ہیں قاسم نے دل میں کہا کہ یہ کوئی ایسا چور راستہ ہے جس کا علم فدائیوں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے اب نیچے کی طرف چلنا بند ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ ہلکی سی چڑھائی شروع ہوئی ہے۔ یہاں پاسبانوں نے سب کی آنکھوں سے پٹیاں کھول دیں اور ایک پاسبان نے سردار کے کان میں کچھ کہہ کر ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کیا۔

چنانچہ قاتلوں کا غول اسی سمت میں چلا۔ جدھر پاسبان نے اشارہ کیا تھا۔

مہینے کی اخیر تاریخیں تھیں۔ چاند ابھی نکلا نہ تھا لیکن ستاروں کی روشنی اتنی تھی کہ بڑی بڑی چیزوں کی کچھ دھندلی سی صورت معلوم ہو جائے۔ ایک طرف بہت گہری تاریکی کا ایک ٹکڑا ایسا نظر آیا۔ جیسے بہت سے درخت ایک ہی جگہ موجود ہوں۔ اس سے آگے قلعہ اَلَموت والا پہاڑ اور قلعہ کے برجوں اور مورچوں کا خاکہ سا دکھائی دیا۔ دوسری جانب ایک بلند پہاڑ تھا۔ قاسم اور اس کے چاروں ساتھی اس وقت ایسی زمین پر کھڑے تھے جو کسی قدر نشیب میں تھی۔ سردار نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ قاسم سمجھ گیا کہ اس وقت وہ قلعہ اَلَموت کی پشت پر جو پہاڑی درہ ہے اس کے سب سے نچلے مقام سے گزر کر کچھ اوپر آ گئے ہیں۔ ابھی تھوڑی سی چڑھائی اور باقی ہے۔ پھر بائیں ہاتھ کو مڑ کر حسن کے مکان تک پہنچ جائیں گے۔ اب قاسم کو اپنی کارگذاری دکھانے کا موقع آ گیا۔ چونکہ سب کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس لئے بغیر کسی کے دیکھے ایک ہاتھ کمر کے پٹکے کی طرف لایا۔ جہاں حسن کی دی ہوئی چیز پوشیدہ تھی۔ یہ جھلی میں لپٹا ہوا ایک نلوا سا تھا۔ جس کے سرے پر دو ڈورے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ وہ ڈورے چھوٹے اور بہت مضبوط تھے اور سروں پر سے چپٹے تھے۔ قاسم نے ان دونوں چپٹے سروں کو آپس میں رگڑا۔ یہاں تک کہ ان میں اتنی گرمی پیدا ہو گئی کہ قاسم کی انگلیاں جلنے لگیں۔ اتنی کیفیت پیدا ہوتے ہیں قاسم سمجھ گیا کہ یہ چیز اپنا کام کرنے لگی ہے۔ قاسم نے نلوے کو جلدی سے پیچھے کی طرف ہاتھ جھٹکا دے کر پھینک دیا مگر ایک انگلی پر باریک سیاہ دھاگا لپیٹ رکھا تھا۔ جس کا دوسرا سرا نلوے میں لگا تھا۔ اب یہ چیز پیچھے پیچھے کوئی بیس ہاتھ کے فاصلے سے قاسم کے چلنے کے ساتھ ساتھ گھسٹتی چلی۔

راستہ پرگرم ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ایک چٹان کی چوٹی سے اُلو بولا۔ اندھیرے میں ایک لرزہ سا پیدا ہوا۔ گویا جو سنگین جرائم اس وقت ہونے والے ہیں ان کی ہولناکی کا اثر فضا میں بھی پھیل چلا جس نے رات کو اور زیادہ سیاہ اور پُر آسیب کر دیا مگر یہ سب بیوقوفی کے خیالات تھے۔ فدائی آگے بڑھے چلے گئے مگر ذرا دیکھو تو یہ کیا ماجرا ہے! رات بالکل اندھیری تھی مگر یہ کیا بات ہے کہ لوگوں کی پرچھائیاں ان کے آگے آگے زمین پر پڑ رہی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہیں پرچھائیوں کے خطوط اب اور زیادہ واضح ہو گئے اور ان کے آس پاس کی زمین کسی تیز سبز روشنی سے کچھ کچھ روشن نظر آنے لگی۔ سردار نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا

ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ باقی جس قدر لوگ تھے انہوں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ جس راستہ پر چل رہے ہیں۔ اُسی پر پیچھے کی طرف سے آگ کا ایک زرد شعلہ زمین پر لوٹتا ہوا چلا آتا ہے۔ اس کی روشنی سے آس پاس کی خشک گھاس اور راستہ پر دو چار پرانے زیتون کے درختوں کے تنے روشن ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ سردار کی طرح چیخے تو نہیں لیکن جلدی جلدی قدم بڑھا کر چلنے لگے کہ کسی طرح اس بلا سے پیچھا چھوٹ جائے۔ کچھ دور اس طرح تیز چل کر پھر پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہ آگ کا حلقہ موجود تھا۔ اب وہ اور بھی تیز چلے۔ آگ کا حلقہ بھی پیچھے پیچھے تیز چلا۔ اب تو ان لوگوں کی خوف سے اور بھی بُری حالت ہوئی اور سب کے سب چیختے ہوئے بھاگے۔ آگ کا حلقہ بھی ان کے پیچھے اُچھلتا کودتا رفتار کی تیزی سے اور زیادہ روشن ہوتا ہوا بھاگا مگر پھر وہ دفعتاً غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ رات کے اندھیرے نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور اب جہاں وہ حلقہ تھا۔ وہ سفید سفید دھوئیں کا ایک بادل سا رہ گیا مگر اس نے فدائیوں کا پیچھا نہیں کیا۔

فدائی بھاگتے بھاگتے اب رُکے ڈر کے مارے سب کی بُری کیفیت ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا "جوانو ذرا بیٹھ کر دم لو"۔ کہیں زیادہ اور کہیں کم اندھیرا دیکھتے دیکھتے نظر کو چیزوں کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ وہ اب حسن کے مکان کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ مکان پر گھپ اندھیرا چھایا تھا اور کہیں پتے تک کا کھڑکا نہ تھا۔ اُلو پھر بولا اور تاریکی میں سروں کے اوپر کسی پرندے کے پروں کی آواز سن سن کرتی سنائی دی۔ سردار نے چپکے سے کہا۔ "کوئی بڑا پرندہ ہے مگر اس دنیا کا نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے یہ ان پرندوں میں سے ہو۔ جنہوں نے نجاشی کے لشکر کو کعبہ پر چڑھائی کے وقت غارت کیا تھا اور وہ آگ کا حلقہ جو ہمارے پیچھے پیچھے دوڑا تھا۔ ممکن ہے۔ خدا کے حکم سے وہ ایک سگِ پاسبان کی طرح اس مکان کی حفاظت پر مقرر ہو۔ ہماری مہم وعزیمت کے لیے یہ چیزیں نہایت بدشگونی کی ہیں۔ بہتر ہو کہ ہم یہاں سے پلٹ چلیں اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر کل ماجرا عرض کر دیں"۔

قاسم کو بھلا کب گوارا ہو سکتا تھا کہ ہاتھ آیا شکار یوں مفت میں کھو دے۔ اس کی جیت کا موقع تو ابھی آیا تھا۔ آگ کے حلقے کا حال اسے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ وہ اس سے کیوں ڈرتا۔ چنانچہ قاسم نے سردار سے کہا۔ "واپس جانے کا خیال آپ کا ہرگز درست نہیں ہے۔ بڑی غیرت اور شرم کی بات ہو گی کہ کتوں کے پلّوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ سے پٹ پٹا کر

دُم ہلاتے ہوئے آقا کے سامنے خوف اور ناکامی کا رونا رونے جائیں۔ اگر اپنی اپنی خدمت سب نے انجام نہ دی اور یہاں سے واپس چلے گئے۔ تو جن پرندوں کے اُڑنے کی آواز آپ نے ابھی سنی تھی۔ وہ سب گدھ ہو جائیں گے۔ جو ہم سب کی لاشوں کو کل صبح اسی غار میں اتر کر نوچ نوچ کر کھاتے ہوں گے"۔

سردار اور وہ فدائی جو قلعہ کے دروازے پر قاسم کے ساتھ یہاں تک آیا تھا۔ قاسم کی زبان سے یہ باتیں سُن کر ڈر کے مارے ہائے ہائے کرنے لگے۔ سردار نے کہا۔ "اگر خدا کی مرضی نہیں ہے کہ ہم اپنے کام میں پورے اُتریں۔ تو پھر خدا سے لڑنے کی مجال کس کو ہے۔ قاسم تم ہی بتاؤ کہ اب کیا صلاح دیتے ہو"۔

قاسم: "میری صلاح تو یہ ہے کہ اس مکان میں جا کر جو خدمت سپرد ہوئی ہے۔ اسے انجام دیا جائے۔ کام کس طریقہ سے ہوگا۔ اس کے متعلق آپ کو حکم احکام پہلے ہی مل چکے ہیں"۔

فدائی پھر ڈر کے مارے اُنھ اُنھ اور ہائے ہائے کرنے لگے۔

قاسم: "ہونا تو یہی چاہیئے۔ جو میں کہتا ہوں لیکن اگر تم لوگوں کے ہاتھ پاؤں میں کس بَل کچھ نہیں رہا ہے۔ تو میں حملہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر کسی آسمانی بلا نے مجھے ہی ختم کر دیا۔ تو اور بات ہے۔ ورنہ اپنا کام کر کے آؤں گا اور مدد کی ضرورت ہوئی۔ تو تم کو فوراً اندر بلا لوں گا"۔

سردار اتنا سُن کر اپنا منہ قاسم کے کان کے پاس لایا۔ تا کہ دوسرے اس کی بات نہ سُن سکیں اور چپکے سے کہا۔ "اس طرح حملہ کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ دیکھو میں فدائی ہوں اور حشیش بھی پی چکا ہوں۔ کسی معمولی خطرے یا انسان کا خوف مجھے مطلق نہیں ہے لیکن جو شخص اس گھر میں رہتا ہے۔ اس سے میں ڈرتا ہوں۔ کیونکہ وہ فانی انسان سے بڑھ کر قدرت رکھتا ہے۔ تم اگر اس مکان میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ تو داخل ہو لیکن یاد رہے کہ تمہاری موت ایسے شخص کی سی موت ہوگی۔ جو عالم غیب کی نشانیوں کی بے ادبی کرتا ہے"۔

قاسم کے لئے اتنی ہی اجازت کافی تھی۔ یہ سب قاتل سرو اور صنوبر کے درختوں کے نیچے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قاسم ان سب کو وہیں تنہا چھوڑ کر دبے پاؤں حسن کے مکان کی طرف چلا۔ رستہ میں دائیں ہاتھ کو افق کے کنارے زرد روشنی کی ایک تحریری نظر آئی۔ سمجھ گیا۔ کہ چاند کے نکلنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ کمر سے خنجر نکال لیا۔ جانتا تھا کہ اس وقت ایک بڑی مہم سر کرنی ہے۔ ایسے موقع پر انسان اپنی طبیعت کو آزمانے لگتا ہے اور دل سے پوچھتا ہے

کہ آیا تو اس کام کے لئے مضبوط ہے یا نہیں۔ قاسم نے اپنا امتحان کیا مگر طبیعت میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں پائی اور نہ نبض میں کوئی خاص سرعت پیدا ہوئی مگر ہاتھ پاؤں کی پھر وہی کیفیت ہوئی کہ اپنے نہ معلوم ہوتے تھے مگر دل کے ارادے کو عمل میں لانے کے لیے تیار تھا اور طبیعت نہایت سکون کے ساتھ مرنے اور جان لینے پر آمادہ تھی۔

قاسم برآمدے پر چڑھا اور اس دروازے کے سامنے آیا۔ جو حسن کے کمرے کا تھا۔ کواڑوں کو آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ اندر سے بند نہ تھے۔ جب دروازہ کھل گیا۔ تو کمرے میں سے اُسی بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ جو اس سے پہلے ایک موقع پر سُرنگ والے دروازے پر چیتوں کے قریب شیشی سے دوا چھڑکنے پر پیدا ہوئی تھی۔ قاسم نے جُھک کر کمرے میں غور سے دیکھا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ ایک ہلکی سی غرغر کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ جب اندھیرے میں کچھ دیر تک رہنے کے بعد نظر قائم ہوگئی۔ تو دروازے کے دونوں جانب اندر کو دو زندہ چیتوں کے سر نظر آئے۔ قاسم ان جانوروں کے سروں کے بیچ میں سے نکلتا ہوا کمرے میں آیا۔ سامنے ایک بوریا بچھا ہوا دیکھا۔ جس پر کوئی آدمی لیٹا تھا۔ دل میں کہا کہ ضرور یہ حسن ہے۔ اتنا خیال کرتے ہی غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ جلدی سے آگے بڑھا۔ خنجر اونچا کیا اور دانت پیس کر کہا۔ ''او بے ایمان دغا باز'' اور اتنا کہتے ہی اس سوتے ہوئے آدمی کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔

❀ ❀ ❀

بارھواں باب

بچو! کل قصہ یہاں تک ہوا تھا کہ قاسم نے درختوں کے جھنڈ والے۔ مکان میں گھس کر حسن کے سینہ میں خنجر بھونک دیا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ تم گھبرائے کہ اب قصہ آگے نہ کہوں گا۔ کیونکہ نماز اور افطار کا وقت ہوگیا ہے مگر آج دل میں خوش ہوتے ہو گے کہ انجام جو کچھ ہوا۔ وہ ابھی کہنا باقی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بے جا حرکت کی سزا میں قاسم کو کوئی ناگہانی موت نہیں آئی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ہاتھ میں بڑے زور کا جھٹکا آیا اور ایسا معلوم ہوا کہ خنجر آدمی پر نہیں بلکہ کسی لوہے کی چادر یا پتھر کی سل پر مارا ہے۔ خنجر لگتے ہیں حسن نے آنکھیں کھولیں اور بہت اطمینان سے نرم آواز میں کہا۔ ''قاسم بن سلیم! تم نے یہ وہ قصہ نہیں سنا کہ کسی بادشاہ نے ایک مجرم کی نسبت حکم دیا کہ اس کو ہمارے سامنے ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا جائے۔ مجرم نے یہ حکم سُن کر جلاد کو الگ لے جا کر کہا کہ اگر ڈنڈے زور زور سے نہ لگاؤ گے اور تھوڑی سی دیر میں مجھے مرا ظاہر کر کے بادشاہ کے سامنے سے گھسیٹ کر باہر لے آؤ گے۔ تو میں تم کو بہت سا روپیہ دوں گا۔ جلاد ان شرطوں پر راضی ہوگیا لیکن جب وقت آیا۔ تو بادشاہ کو اس دھوکے میں رکھنے کے لئے کہ معاملہ کسی قسم کی رشوت کا نہیں ہے۔ مجرم کو اس بیدردی سے پیٹنا شروع کیا کہ وہ غریب چیخ اُٹھا اور کہنے لگا۔ ''بس بس رحم کرو۔ میری تمہاری وہ شرطیں اب اُٹھ گئیں۔ خدا کے لئے ایک ہی ضرب میں کام تمام کردو۔ کیونکہ اس تکلیف سے تو موت بھلی''۔ میرا حال بھی تم نے اس وقت اسی مجرم کا سا کر دیا۔ اگر وہ فولاد کی مضبوط زرہ آپ نے نہ عنایت فرمائی ہوتی۔ تو اس ناچیز پر تو اب تک زمین و آسمان دونوں کے راز کھل گئے ہوتے!''

قاسم ابھی تک اپنی اسی مجنونانہ حالت میں تھا۔ خنجر اونچا کر کے نہایت وحشیانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''پہلے یہ بتاؤ۔ تھور فریدا کہاں ہے''۔ حسن نے ''بہت آہستگی سے جواب دیا۔ ''تھور

فریدا اور اس کی خادمہ اندر کمرے میں بالکل خیر و عافیت سے ہیں۔ہم میں تم میں اس موقع کے لئے جو کچھ۔طے ہوا تھا۔وہ یہ تھا کہ جو لوگ تمہارے ساتھ آئیں۔ پہلے تو ان کو اتنا ڈرایا جائیکہ وہ قتل سے باز رہیں اور راستہ ہی سے پلٹ جائیں۔ اگر اس پر بھی وہ کسی طرح یہاں تک پہنچ جائیں۔تو تم ان سے یہ کہنا کہ میں اکیلا اس مکان میں جا کر سب کا کام تمام کر سکتا ہوں اور اس پر وہ سب خوشی سے رضا مند ہو جائیں گے۔غرض پہلے جتنی باتیں طے ہوئی تھیں۔وہ یہی تھیں۔ یہ طے نہ ہوا تھا کہ مکان میں گھس کر سب سے پہلے آپ مجھی پر ہاتھ......"

قاسم ابھی تک اپنے آپے میں نہ تھا۔دانت پیس کر کہنے لگا۔"ارے کُتے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اس عورت کو تو نے اپنے لئے سرقہ کیا ہے"۔

حسن: "اگر میں کُتا ہوں۔تو ایسی نسل کا ہوں۔ جو بھیڑ کو بھیڑئے کے منہ سے چھڑا لیتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کسی باطل اور غلط خیال نے تمہارے دل میں رشک وحسد کی آگ بھڑکا دی ہے۔اب میں چشمہ حق کے آب سرد سے اس آگ کو بجھائے دیتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ملازم فضل دونوں عورتوں کو آپ کے دوست کے مکان پر بخیریت پہنچا کر شہر کے حالات دریافت کرنے کی فکر میں ہوا۔شدہ شدہ اُسے معلوم ہوا کہ شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں اور کسی کو باہر نکلنے کا حکم نہیں ہے۔اس خیال سے کہ عورتوں کی فراری کا حال کھل گیا ہے۔ اس نمک حلال ملازم نے یہ دانشمندی کی کہ ان کو آپ کے دوست کے مکان سے پھر یہیں واپس لے آیا"۔

اتنا سُن کر قاسم کو کچھ ہوش آیا۔کل رات کو شہر کی جو حالت دیکھی تھی کہ ہر طرف خاموشی اور وحشت برس رہی تھی اور کسی آنے والی مصیبت کے آثار ظاہر تھے۔یاد آنے لگی مگر حسن کی طرف سے شبہ پورا رفع نہیں ہوا۔چنانچہ اس کی باتوں کا جھوٹ سچ معلوم کرنے کے لئے کہنے لگا۔"تمہارے باپ کو اس کا علم ہو گیا ہے کہ تھور فریدا بھاگ گئی ہے۔ چنانچہ اس نے دو نوعمر فدائیوں کو یہاں بھیجا ہے۔ یہ فدائی شام کے ملک سے یہاں آئے ہیں اور کسی سے بات نہیں کرتے۔نہ بولنے کی انہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔تمہارے باپ نے انہیں حکم دیا ہیکہ دونوں عورتوں کو جاتے ہی گرفتار کر لیں۔تمہاری آگ کے حلقہ والی ترکیب سے جس قدر خوف اَدروں پر طاری ہوا۔ان دونوں فدائیوں پر نہیں ہوا"۔

حسن بولا: "میں خوب سمجھ گیا۔ یہ باہر کے فدائی ہیں۔کسی سے بات نہ کرتے ہوں گے۔حشیش

ان کو زیادہ پلائی گئی ہوگی۔ تاکہ اس وقت ان کی ہمت بڑھی رہے اور جو کچھ اس حال میں وہ کریں۔ بعد کو یاد نہ رہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم ان دونوں کو یہاں لے آؤ۔ ہم اُن سے بھگت لیں گے''۔

قاسم بولا: ''لیکن اس سے پہلے میں فضل کا معاملہ تو طے کرلوں ورنہ سردار کو دھوکے کا شبہ گزرے گا''۔

حسن نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا تم فضل کے کمرے میں جا کر اس کا کام تمام کردو۔ میں عورتوں کو شامی فدائیوں سے ملاقات کرنے کے لئے تیار کئے دیتا ہوں''۔

قاسم کو اب کسی قدر اطمینان ہوا۔ حسن کے کمرے سے نکل برآمدے میں سے چپکے چپکے گزرتا ہوا فضل والے کمرے کے دروازے پر آیا۔ دروازے کھولتے ہی دیکھا کہ ایک قد آور آدمی سامنے کھڑا ہے۔ اس خیال سے کہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ قاسم خنجر اونچا کئے اس کی طرف جھپٹا لیکن فوراً ہی کسی نے قاسم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کوئی دانوں ایسا چلا کہ قاسم دھم سے زمین پر گرا۔ گرتے ہی منہ سے زور کی چیخ نکلی اور پڑے پڑے کسی کو دبی آواز سے یہ کہتے سُنا۔ ''اندھیرے میں مجھ پر جھپٹنا دانائی کی بات نہ تھی۔ میری آنکھوں کو اندھیرے میں دیکھنے کی عادت ہوگئی ہے مگر اب آپ کو زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ لیجئے کہ لال ڈاڑھی والا مارا گیا۔ وہ چیخ جو آپ کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ اُسی کی مرتے وقت کی چیخ تھی۔ آقا نے یہ صحیح سمجھا تھا کہ ایک بڈھے اپاہج نوکر کو اس موقع پر ختم کرنے سے معاملہ کی صورت بہتر ہو جائے گی مگر مجھے یہ کمال حاصل ہے کہ جب ضرورت ہو۔ بڈھا فضل مر کر اپنی جگہ ایک جوان فضل پیدا کرسکتا ہے''۔ قاسم کو یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی کہ فضل کے منہ پر جو لال ڈاڑھی تھی۔ وہ اب منہ پر نہیں ہے۔ بلکہ الگ ہاتھ میں لٹک رہی ہے۔

اس موقع پر ایک دروازہ جس سے اندر کے کمرے میں جاتے تھے۔ کسی نے آہستہ سے کھولا اور حسن یہ کہتا سنائی دیا کہ ''اگر فضل مر چکا ہے۔ تو بہتر ہے۔ اب وہ اس کمرے میں چلا آئے اور قاسم باہر جا کر دونوں شامی فدائیوں کو اندر لے آئے''۔

قاسم اتنا سنتے ہی فوراً کمرے سے باہر آیا۔ دیکھا کہ قاتل بدستور درختوں کے نیچے بیٹھے ہیں۔ آتے ہی سردار سے کہا۔ ''میں نے حسن کے سینے میں خنجر بھونک دیا ہے اور اس کا پرانا خادم بھی اب زندہ نہیں ہے''۔

سردار نے آہستہ سے کہا اور اس کی آواز پر اب تک خوف کا لرزہ موجود تھا کہ ''یہ کام تم نے خوب کیا۔ میں نے تمہیں برآمدے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا اور اس بڈھے نوکر کی چیخ بھی سنی تھی لیکن عورتوں کا کیا حال ہے۔ شامی فدائیوں کو اپنے ساتھ مکان میں لے جاؤ۔ ان عورتوں کو تم نے دیکھا بھی؟''

قاسم نے جواب دیا۔ ''نہیں''۔

سردار: ''تو پھر وہ اندر والے کمرے میں ضرور ہوں گی۔ اگر جان کی خیر چاہتے ہو۔ تو اس کمرے میں قدم نہ رکھنا۔ یہ شامی فدائی خود ہی وہاں پہنچ کر انہیں گرفتار کر لیں گے۔ ہاں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ شیخ کا حکم ہے کہ حسن اور فضل کی لاشیں پہاڑ پر سے نیچے غار میں پھینک دی جائیں۔ تاکہ ان کو کوئی دیکھ نہ سکے اور ان کے مارے جانے کا نشان تک کسی کو معلوم نہ ہو۔ جب تک شامی اپنا کام کریں بہتر ہے کہ تم اور یہ فدائی جو شروع سے تمہارے ساتھ ہے، دونوں مل کر لاشیں باہر لے آؤ''۔

یہ نیا حکم سُن کر قاسم کے ہوش اُڑے اور سوچنے لگا کہ دیکھئے یہ معاملہ کیونکر انجام بخیر ہوتا ہے۔ اب یاد آیا کہ حسن نے کہا تھا۔ ''دونوں شامی فدائیوں کو اندر لے آؤ۔ ہم ان سے بھگت لیں گے''۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر لاشوں کی مشکل ہے کہ وہ کہاں سے پیدا کی جائیں گی۔ بہر کیف کام جو سامنے ہے۔ وہ کرو۔ باقی سب تقدیر پر چھوڑو۔ قاسم نے شامی فدائیوں کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ اس کے پیچھے اس طرح چلے۔ جیسے کوئی نیند میں ہوتا ہے۔ دونوں حسن کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے بوریئے پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں یہ بوریا اور لاش پر جو کپڑے تھے اور سب خون میں تر بالکل سیاہ معلوم ہوتے تھے۔ لاش کے پائنتیوں اندر والے کمرے کا دروازہ تھا۔ قاسم نے قدم بڑھا کر کواڑ آہستہ سے کھولے۔ دونوں شامی فدائی آگے بڑھے اور قاسم کے سامنے سے ہوتے ہوئے اندر والے کمرے میں داخل ہوئے۔ جونہی کمرے میں قدم رکھا۔ قاسم نے ایک گلے کی آواز جسے کسی نے پکڑ لیا ہو اور دو چیزوں کے زور سے گرنے کا دھماکا سنا۔ فوراً دروازہ کھول چوکھٹ پر کھڑا ہوا۔ اندر جانا چاہا مگر پاؤں کے پاس کسی چیز نے اندر جانے سے روکا۔ غرّانے کی آواز بھی سُنی۔ جو کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو جاتی تھی۔ نیچے دیکھا۔ تو لمبی لمبی چتکبری کھالیں۔ قدموں کے پاس پھیلی پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نیچے بھی کوئی چیز دبی ہوئی ہے۔ یہ نظر نہ آسکا کہ وہ کیا چیز ہے۔ ان

سے آگے کمرے میں سامنے دیوار کے قریب تین صورتیں دھندلی دکھائی دیں لیکن جو چیز بالکل صاف نظر آئی۔ وہ ایک چھری کی چمک تھی۔ جوان تینوں صورتوں میں سے ایک کے ہاتھ میں تھی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر قاسم کا یہ حال ہوا۔ جیسے سارے بدن کا خون خشک ہو جائے۔ اتنے میں کسی نے اس کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھا اور آواز آئی۔ ''دونوں مر چکے ہیں''۔ یہ حسن کی آواز تھی۔

قاسم نے حسن سے کہا۔ ''مجھ کو تمہاری اور فضل کی لاشیں باہر لے جانی ہیں''۔

حسن نے پوچھا۔ ''باہر کتنے آدمی ہیں؟''

قاسم نے کہا۔ ''ایک سردار ہے اور دوسرا ایک فدائی ہے۔ جو قلعہ کے دروازے سے برابر میرے ساتھ رہا ہے''۔

حسن نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اس فدائی کو اب اندر لے آؤ''۔

قاسم جلدی سے باہر آیا مگر اس تردد میں تھا کہ اگر سردار نے شامیوں کی نسبت کچھ پوچھا۔ تو کیا بتائے گا۔ اس وقت قاسم کو اپنے آپ کو کہنا یاد آیا کہ بدکار و دغا باز اسی لائق ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی دوسروں سے دغا پائیں۔ یہ لوگ بداعمال اور خونی ہیں۔ کسی ظلم سے انہیں باک نہیں۔ البتہ جب فوق العادت کرشمہ دیکھتے ہیں۔ تو ان کی ہمت اور جوانمردی سب کافور ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو کچھ ان پر گذر رہا ہے۔ انہی کے اعمال کی سزا ہے۔

سردار نے قاسم کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''دیر کس بات میں ہو رہی ہے''۔ معلوم ہوتا تھا کہ سردار کے ہوش و حواس پہلے سے اب کسی قدر درست ہو گئے ہیں۔

قاسم نے کہا۔ ''عورتیں مکان میں نہیں ہیں۔ شامی ان کو باہر ڈھونڈ رہے ہیں۔ خیال ہے کہ مکان کی پشت پر جھاڑیوں میں کہیں چھپ گئی ہیں۔ اگر یہ فدائی جو میرے ساتھ شروع سے رہا ہے۔ اس وقت میری تھوڑی سی مدد کرے۔ تو ہم دونوں مل کر لاشوں کو باہر لا سکتے ہیں''۔

سردار نے فوراً اس فدائی کو اندر جانے کا حکم دیا۔ وہ کچھ تامل کے بعد اُٹھا۔ قاسم اس کو حسن کے کمرے میں لے گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے حسن کی لاش بوریئے پر پڑی ہے۔ قاسم نے فدائی سے لاش کی طرف اشارہ کر کے چپکے سے کہا۔ ''یہ حسن ہے۔ فضل اندر ہے۔ اندر آؤ''۔

قاسم نے پھر وہی دروازہ جس سے اندر کے کمرے میں جاتے تھے۔ کھولا جونہی فدائی نے اس کمرے میں قدم رکھا۔ قاسم نے دیکھا کہ کسی کا ہاتھ اس فدائی کے سر کے پیچھے آیا ہے۔

اس کے بعد ایسی آواز آئی۔ جیسے گلا گھٹنے میں منہ سے نکلتی ہو۔ اس آواز کے ساتھ ہی فضل کو یہ کہتے سنا کہ ''چیتوں کا پیٹ تو پہلے ہی شکار سے بھر چکا تھا۔ اب یہ میرا شکار ہے''۔ اسی وقت کمرے میں سے ایک نازک آواز نہایت خوف اور نفرت کی آئی۔ قاسم نے آواز پہچان لی اور اب غور سے زمین کی طرف دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ فضل نے فدائی کی لاش زمین پر دراز کر دی ہے اور جلدی جلدی اس کی لال اور سفید وردی اُتار کر خود پہن رہا ہے۔ فضل تو یہ کیا کر رہا ہے اور حسن فضل کی عنابی عبا جس میں نیلی گوٹ لگی تھی۔ اس لاش کو پہنا رہا ہے اور وہ لال ڈاڑھی جو فضل نے اُتار پھینکی تھی۔ لاش کے چہرے پر لگاتا ہے۔ حسن نے فضل سے کہا۔ ''جلدی کرو۔ چاند نکلنے کو ہے''۔

اب فضل فدائی کے کپڑے پہنے اور قاسم دونوں کے کمرے میں آئے۔ دونوں نے مل کر بوریئے پر سے لاش اٹھائی۔ یہ لاش شامی فدائیوں میں سے اس کی تھی۔ جس کا قد ذرا بڑا تھا۔ اس کا اصلی لباس اُتر لیا گیا تھا اور لاش کو چند کپڑوں میں لپیٹ کر اس پر چادر اُڑھا دی گئی تھی۔ دونوں آدمی اس لاش کو باہر لا کر سردار کی طرف چلے۔ اس نے قاسم سے اشارہ میں پوچھا۔ لاش کس کی ہے۔ قاسم نے بہت خوف زدہ آواز بنا کر کہا۔ ''حسن کی''۔ سردار اتنا سنتے ہی پیچھے ہٹ گیا۔ قاسم نے اور فضل نے لاش کو پہاڑ کی گکر سے نیچے غار میں پھینک دیا۔

اس کے بعد یہ دونوں یعنی قاسم اور فضل اندر گئے اور اس فدائی کی لاش کو لائے۔ جو قاسم کے ساتھ شروع سے یہاں تک آیا تھا۔ اس مرتبہ سردار نے کچھ خوف ظاہر نہ کیا۔ لاش کے قریب آ کر اسے دیکھنے لگا۔ قاسم کا دم فنا ہوا۔ کیونکہ چاند اب خاصا نکل آیا تھا لیکن عنابی عبا۔ لال ڈاڑھی اور مُردے کے منہ سے زبان باہر کو نکلی ہوئی دیکھ کر سردار مطمئن ہو گیا اور یہ لاش بھی پہاڑ کے نیچے غار میں پھینک دی گئی۔

اب مکان میں سے دو جوان صورتیں فدائیوں کا لباس پہنے باہر آئیں۔ سردار نے ان سے پوچھا کہ ''عورتیں کہاں ہیں''۔ دونوں نے فقط گردن ہلا دی۔ منہ سے کچھ نہ کہا۔

سردار نے اب ایسے لہجے میں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ فکر کا ایک بار گراں اس کے سینے سے اُٹھ گیا ہے کہا ''اس سے مطلب یہ ہوا کہ عورتیں یہاں شروع ہی سے نہیں آئیں۔ بس ہمارا جو کام تھا وہ ختم ہوا اور اب ہم واپس جا سکتے ہیں۔ ان شامی فدائیوں کی نسبت حکم ہے کہ وہ فوراً ملک شام کے داعی الکبیر کے پاس واپس جائیں''۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے کچھ کاغذ

نکالے اور فضل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’تم ان شامیوں کو پہاڑ والے تنگ راستے شہر لے جاؤ پہلے سرائے میں جانا وہاں ان کے اونٹ موجود ہوں گے اور یہ خط داعی الکبیر کے نام کا اور یہ پروانہ جس میں دربانوں کے نام حکم ہے کہ ان کو شہر سے باہر جانے دیں۔ ان کے سپرد کر دینا کہ جہاں تک ممکن ہو۔ جلد واپس چلے جائیں‘‘۔

سردار یہ حکم دے رہا تھا اور قاسم اس سوچ میں تھا کہ ایک بار پھر مکان میں جا کر ایک بات جو حسن سے پوچھنے کی ہے، کیونکر پوچھے۔ فوراً ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ جلدی سے ایک پاؤں اُٹھا اس میں سے لال جوتی نکال جیب میں رکھ اور سردار سے اتنا کہا کہ لاش کو اٹھاتے وقت پاؤں سے جوتی اُتر گئی ہے۔ مکان کے اندر پہنچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ حسن اندر والے کمرے میں دوسرے شامی کی لاش کو کپڑوں میں لپیٹ رہا ہے۔ شامی کے گلے کو چیتے نے اس طرح چبایا ہے کہ رگیں اور نسیں کٹ کر باہر نکل آئی ہیں۔ دونوں چیتے چپ چاپ پاس بیٹھے ہیں۔ حسن نے نظر اٹھائی۔ تو قاسم نے کہا ’’فضل اور وہ دونوں شہر کو جا رہے ہیں اور وہاں سے فوراً شام کا سفر اختیار کریں گے۔ ان دونوں کے ساتھ کون جائے گا؟‘‘ حسن نے جواب دیا۔ کوئی نہیں۔ تھور فرید انہایت ہوشیار اور مضبوط ہے اور پھر ایک پیش قبض اس کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ فضل ان کو شہر کے دروازے تک پہنچا کر یہاں واپس آ جائے گا۔ تا کہ اس لاش کو اٹھانے میں میرا ہاتھ بٹائے‘‘۔

قاسم نے کہا۔ ’’مگر اب آپ یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ یہ مقام تو بہت غیر محفوظ ہو گیا ہے‘‘۔

حسن نے جواب دیا۔ ’’آپ اطمینان رکھیں۔ قبرستان میں جہاں مُردے دفن ہوتے ہیں۔ وہیں ان کی روحیں بھی رہنے لگتی ہیں اور دنیا کے لوگ ایسی جگہ جانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اچھا آپ جائیے۔ باوا جان منتظر ہوں گے کہ میں عالم اجسام سے عالم ارواح میں پہنچ گیا یا نہیں‘‘۔

قاسم نے جیب سے جوتی نکال کر پہنی اور باہر آ گیا۔ جب برآمدے سے اُترا۔ تو دیکھا کی تین صورتیں فدائیوں کا لباس پہنے پہاڑی رستے کا رخ کئے جا رہی ہیں اور اب درختوں کی آڑ میں آ کر نظر نہیں آتیں۔ قاسم اور سردار بھی چل پڑے اور وہاں پہنچے جہاں آنکھوں سے پٹیاں اُتار دی گئی تھیں۔ یہاں پاسبان موجود تھے۔ انہوں نے پھر آنکھوں پر پٹیاں باندھیں

اور دونوں کو ساتھ لئے آگے بڑھے۔

غرض انجام یہ ہوا کہ وہ فدائی جس کا کام حسن کو قتل کرنا تھا اور دونوں شامی جو عورتوں کی گرفتاری کے لئے آئے تھے۔ اب دنیا کی تمام خدمتوں اور حاضریوں سے بے نیاز ہو گئے۔ صرف قاسم اور سردار قلعہ اُلموت میں پہنچا دیئے گئے۔

یہ رات وہ تھی کہ پہاڑ والے شیخ کی پلک سے پلک نہ لگی تھی۔ قلعہ کے سب سے اونچے برج پر ایوان میں بیٹھا نیچے کبھی جنوب کی طرف شہر کو اور کبھی شمال کی سمت میں پہاڑی درۂ کوہ کو دیکھتا تھا اور معلوم ہوتا تھا۔ کسی بات کا سخت انتظار ہے۔ ہر طرف تاریکی اور خاموشی تھی لیکن جب پہاڑوں کی پشت سے چاند طلوع ہوا اور اس کی زرد روشنی آسمان پر پھیلتی دکھائی دی۔ تو نیچے شہر سے دفعتاً ایک سرخ شعلہ چمکا۔ اس کے بعد اور شعلے جابجا اُٹھتے اور مشعلیں اِدھر اُدھر دوڑتی نظر آئیں۔ شیخ الجبل کی نگاہیں ان متحرک شعلوں کی طرف جم گئیں۔ آنکھوں میں ظلم کی خونی سرخی پیدا ہو گئی۔ اتنے میں ایک شور پیدا ہوا۔ جیسے دُور کوئی سخت ہنگامہ برپا ہوا اور اس عام شور میں چیخیں جیسے اندھیرے میں چھریوں کی چمک بالکل علیحدہ سنائی دینے لگیں۔ شیخ کے لبوں پر تبسم کے آثار ظاہر ہوئے مگر یہ تبسم ایسا نہ تھا۔ جو کسی کو بھلا معلوم ہو۔

یہ شعلے بہت دیر تک نیچے شہر میں بھڑکتے اور چمکتے نظر آتے رہے اور مظلوموں کی آہیں بجلیوں کی طرح ظلمت کو چاک کرتی ہوئی اوپر تک سنائی دیتی تھیں مگر اس پہاڑ والے ظالم اور بے درد کی آنکھیں دیکھنے سے اور کان سننے سے نہ تھکے اور جو تبسم لبوں پر تھا۔ کسی طرح دُور نہ ہوا۔ اتنے میں چاند پہاڑوں سے اونچا ہوا۔ روشنی مٹیالی۔ صورت زرد۔ تاروں چھٹکے آسمان پر اس طرح سست چلا۔ جیسے سمندر میں کوئی ناکارہ کشتی جسے ناخدا نے اس کی تقدیر پر چھوڑ دیا ہو مگر اب مشعلوں کا چمکنا اور چیخوں کا آنا بند ہوا اور صبح قریب ہوتے ہی جب سرد روشنی پہاڑوں میں ڈورنے لگی۔ تو مشعلیں اپنی روشنیاں کم کرتے کرتے بالکل ٹھنڈی ہو گئیں۔ اتنے میں آفتاب کی شعاعیں پھیل کر تیز ہوئیں اور تمام کوہسار لالہ زار ہو گئے۔ پردوں میں سے روشنی چھن کر ایوان کے پُر تکلف دیوار پوشوں رنگین قالینوں اور نازک چینی کے ظروف پر چمکنے لگی لیکن قلعہ کے نیچے شہر کی یہ حالت تھی۔ جیسے کسی سخت لڑائی کے بعد دشمن نے اُسے لوٹا اور غارت کیا ہو، آسمان پر گدھ جمع ہونے شروع ہو گئے اور اب شیخ الجبل کا چہرہ جنوب سے ہٹ کر شمال کی سمت میں اس پہاڑی درہ کی طرف متوجہ ہوا۔ جس کے آگے بھورے پتھر کی ایک عمارت سرو وصنوبر

کے عالی شان درختوں اور چاروں طرف پھولوں کے ایک رنگین غبار میں واقع تھی۔ شیخ کے لبوں پر جو تبسم اب تک رہا تھا۔ وہ جاتا رہا اور فکر و تشویش کی تیرگی نے چہرہ کو سیاہ کر دیا''۔

چھوٹی سی گھنٹی جو پاس رکھی تھی۔ بجائی۔ فوراً ایک خادم حاضر ہوا۔

شیخ نے حکم دیا کہ جو پاسبان خبر لے کر آئے ہیں۔ وہ پیش ہوں۔ فوراً ایک پردہ ہٹا اور پاسبانوں کا افسر اندر آ کر زمین بوس ہوا۔

افسر نے عرض کیا۔ ''حضور کے جس قدر احکام تھے۔ وہ سب بجالائے گئے۔ حسن کے ہواخواہوں میں ایک متنفس بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا''۔

شیخ نے دریافت کیا۔ ''کیا کوئی شہر سے نکل کر بھاگا بھی ہے؟''

افسر: حضور کا حکم تھا کہ شہر کے دروازے ایک رات ایک دن اور پھر ایک رات تک بند رہیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ کوئی شخص سوائے دو فدائیوں کے جو ولایت شام کے داعی الکبیر کے پاس خریطہ لے کر بھیجے گئے ہیں۔ کوئی شہر سے باہر نہیں نکلا''۔

شیخ الجبل نے سر ہلایا اور افسر کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلا گیا۔ تو وہ فدائی جو حسن کے قاتلوں کا سردار مقرر ہوا تھا۔ حاضر ہوا۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ کانپتے تھے۔ شیخ نے نہایت بے صبری سے پوچھا۔ ''کہو کیا کیا؟''

سردار نے اپنا زرد چہرہ اونچا کر کے عرض کیا۔ ''اُس ناشاد و نامراد نے اللہ سے مدد چاہی اور......''

شیخ نے غصہ سے کہا۔ ''اللہ سے مدد چاہی یا شیطان سے۔ جلدی بتا۔ وہ مارا گیا۔ یا نہیں؟''

یہ سن کر وہ فدائی سردار شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر نہایت عاجزی سے کہنے لگا۔ ''یا امام ہمام مجھ پر رحم فرماؤ۔ میں نے امام کے لخت جگر کی جان نہیں لی۔ میں بے قصور ہوں''۔

شیخ نے دانت پیس کر کہا۔ ''ارے بدبخت تو کیا وہ ابھی زندہ ہے؟

سردار: نہیں۔ زندہ نہیں ہے۔ زندگی کا پیرہن اس کے گلے سے اُتار لیا گیا لیکن ان ہاتھوں کا یہ فعل نہیں ہے۔

سردار: ''اس نابکار کا جو اس وقت باہر حاضر ہے''۔

شیخ: ''اسے اندر بلاؤ''۔

قاسم اندر حاضر ہوا۔ سردار میں اب کسی قدر جان پڑی اور کہنے لگا۔ ''حضور یہی وہ نابکار ہے۔ جس نے آپ کے فرزند کو قتل کیا ہے''۔

شیخ: ''اور وہ عورتیں کہاں ہیں؟''

سردار: ''حضور وہ مکان میں نہ تھیں''۔

اتنا کہنا تھا کہ شیخ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور چلا کر بولا ''ارے خبیث تو نے میری نافرمانی کی۔ تو بزدل اور نامرد ثابت ہوا۔ اچھا، تیرا خنجر کہاں ہے؟''

سردار نے ایک آہ کھینچی اور کمر سے سرخ و سپید قبضے کا خنجر نکالا۔

شیخ کا غصہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹھنڈا ہو گیا۔ بہت آہستگی سے کہا۔ ''اچھا بس اب اس خنجر کا ایک ہی مصرف باقی ہے''۔

سردار نے اتنا سنتے ہی خنجر اونچا کیا۔ سر پیچھے کو ڈال کر سینہ آگے بڑھایا اور اس فولاد کے تیز پھل کو دل کی طرف بھونک لیا۔ جس وقت سینے میں خنجر بھونکا ہے۔ تو سردار کے چہرے پر ایک کیفیت تسلی اور اطمینان کی قاسم کو معلوم ہوئی۔ گویا وہ اس طرح جان دینے کو بہت آسان موت سمجھتا تھا۔

شیخ نے پھر گھنٹی بجائی۔ خادم حاضر ہوئے۔ شیخ نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ جو حاشیہ پر گلابوں اور سبز متن پر نرگس کے پھولوں والے قالین پر پڑی تھی اور قالین کے بیچ میں خون کا چقر بن گیا تھا۔ جب خادم لاش لے کر باہر جانے لگے۔ تو شیخ چینی کا ایک گلدان جس پر سوسن کے اُودے اُودے پھول بنے تھے۔ غور سے دیکھنے لگا۔ ایک دفعہ ہی مڑ کر خادموں سے کہا۔ ''ٹھہرو۔ وزیر موت کو فوراً حاضر کرو اور یہ بھی کہہ دو کہ بہت دُور کے سفر کی تیاری کرے''۔ خادم باہر چلے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت شیخ نہایت فکر مند ہے اور آپ سے آپ منہ ہی منہ میں کچھ باتیں کر کے کہہ رہا ہے کہ ''اس کو ضرور واپس لا سکتا ہے۔ ضرور واپس لانا چاہئے۔ وزیر موت یقیناً اس کو واپس لا سکتا ہے۔ بلاد کفار میں تلاش سے اس کا پتہ ضرور چل جائے گا............'' اتنا کہنے پایا تھا کہ دفعتاً علم ہوا کہ قاسم ایوان میں موجود ہے۔ فوراً خاموش ہوا اور قاسم سے مخاطب ہو کر کہا۔ '' شاباش نوجوان۔ تمہاری کارگذاری اچھی ثابت ہوئی''۔ زبان سے تو یہ کہتا تھا مگر اس کی نظریں قاسم کے سینے کو چھیدے ڈالتی تھیں۔

قاسم کو اپنی موت کا انتظار ہوا۔ کیونکہ ممکن تھا کہ شیخ ان سب ہی کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہے۔ جو اس کے بیٹے کے قتل میں شریک ہو رہے ہیں۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ رعایا کے اکثر لوگ اس شہزادے کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ تعریف کے جو جملے قاسم کی نسبت کہے تھے۔ وہ بہت آسانی سے اس حکم کی تمہید ہو سکتے تھے۔ جس کی تعمیل میں ابھی اس فدائی سردار نے جان دی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر میں قاسم کو معلوم ہوا کہ اس کے سب خیالات غلط تھے۔ شیخ نے کہا ''قاسم اس حسن کارگذاری کا صلہ تم کو بہت کچھ ملنے والا ہے۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ دوسرا آدمی جسے تمہیں قتل کرنا ہوگا۔ وہ ایک کافر ہے لیکن اُس وقت پوری بات میں نہیں کہہ سکا تھا۔ مغربی ساحل کے شہروں میں ایک بڑا گروہ ظالم وحشیوں کا کہیں باہر سے آ کر آباد ہو گیا ہے۔ اس نے ہمارے لوگوں پر بڑے بڑے ظلم کئے ہیں۔ اس قوم نے طرابلس کے شہر پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کا سردار اپنے تئیں شہر طرابلس کا حاکم سمجھتا ہے۔ اس کا نام خاص اس کی قوم میں ریمند ہے لیکن اس کے اعمال ایسے ہیں کہ شیطان کے نام سے اس کا مشہور ہونا زیادہ موزوں ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ ان بے ایمان ظالموں کے آشیانہ کو پھونک کر خاک کر دوں گا۔ ابھی ابھی میرے نقیب خاص شام کے داعی الکبیر نے اطلاع دی ہے کہ اس شیطان نے پھر نہایت شدت سے زیر دستوں پر ظلم کرنے شروع کئے ہیں۔ یہ نقیب اب مجھ سے مدد کا خواستگار ہے۔ چنانچہ میں اپنے بڑے بڑے آزمودہ کار لوگ عنقریب فلسطین میں بھیجنے والا ہوں۔ جو اس شیطان کے لئے ایسا جال پھیلائیں گے کہ اس کے پھندوں سے نکلنا محال ہو جائے گا لیکن عاقلوں کا قول ہے۔ افعی راکشتن و بچہ اش نگاہ واشتن کار خردمنداں نیست (سانپ کو مارنا اور سنپولئے کو پالنا عقلمندوں کا کام نہیں ہے) اس ریمند کا ایک بیٹا ہے۔ بالکل جوان۔ بڑا بہادر اور صاحب ہمت۔ ایک دن یہ بھی اپنے باپ کی طرح ظلم پر کمر باندھے گا۔ اس لئے اس کا کام تمام کرنا تمہارے ذمہ کیا جاتا ہے۔ افرنجی کفار کے لشکروں اور قلعوں میں اسے تلاش کرو اور جہاں ملے زندہ نہ چھوڑو۔ اس میں شک نہیں کہ اس کام میں خطرہ بہت ہے لیکن اس کا انعام بھی وہ باغ جنت ہے۔ جس کی جھلک دیکھ چکے ہو اور جنت تلواروں کے سایہ میں ملا کرتی ہے''۔

ایک خادم نے پردہ کھینچ کر عرض کیا کہ وزیر موت حاضر ہے۔ شیخ نے قاسم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ قاسم ایوان سے نکل کر جیسے ہی چبوترے پر آیا۔ تو دیکھا کہ بڑے پردے کے پاس ایک نہایت دُبلا سُوکھا۔ وحشت زدہ آنکھوں اور پریشان بالوں کا آدمی دبکا بیٹھا ہے۔ اس کے

دیکھتے ہی قاسم کا دل دھڑکنے لگا۔ یہی وہ آدمی تھا۔ جس کے ہاتھ میں رسّی دیکھی تھی۔ قاسم اس سے پہلے بھی کہیں اُسے دیکھ چکا تھا مگر یاد نہ آتا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔ دفعتاً خیال آیا کہ اس منحوس کو سب سے پہلے بغداد میں دیکھا تھا اور یہ وہ خبیث صورت ہے۔ جسے دیکھتے ہی گمان ہوتا ہے کہ اب کوئی آفت آنے والی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ غضب اور ہوا ہے کہ تھور فریدا کو گرفتار کرنے کے لیے اب شیخ اسے فلسطین روانہ کرنا چاہتا ہے۔

قاسم نہایت آرزو اور فکر مند ایوان سے اُتر کر نیچے قلعہ میں آیا۔ اگر کسی بات سے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ تو صرف اتنی تھی کہ اسے خود بھی فلسطین جانے کا حکم ملا ہے۔ ''ممکن ہے تھور فریدا تلاش کرنے سے مل جائے اور میں اس کو خطرے سے آگاہ کر دوں اور اگر ضرورت ہو۔ تو اس کی مدد بھی کروں''۔

قلعہ میں جب پہنچا۔ تو یہاں چند خاص ہدائتیں اس کو کی گئیں۔ حکم ہوا کہ اصفہان کے قالین فروش کا بھیس پھر اختیار کرے۔ پہلے اتابک نورالدین کے لشکر میں جائے۔ وہاں ریمند کے لڑکے کو بھی جس کے قاتل پر مامور ہوا ہے۔ تلاش کرے اور اتابک نورالدین محمود کی فوجی طاقت اور اس کے طور وطریقے کا بھی اندازہ کرے۔ کیونکہ دنیائے اسلام میں نورالدین اپنی فتوحات سے اس وقت بڑا نام پیدا کر رہا ہے۔ یہ تمام ہدائتیں سن کر قاسم قلعے سے باہر آیا اور شہر میں داخل ہو کر سرائے میں پہنچا اور یہاں سے اپنا سامان نوکر چاکر وغیرہ لے کر فلسطین کو روانہ ہوا۔ جس وقت شہر کے بازاروں میں سے گذرا۔ تو دیکھا زمین پر جابجا خون کے تھانولے بھرے ہیں۔ مکانوں کی دیواریں بھی اکثر خون سے رنگی ہوئی ہیں۔ دل میں کہنے لگا بے شک رات کا طوفان بہت سخت تھا۔ مینہ بھی اس میں خون ہی کا برستا تھا۔ حسن کے جس قدر ہوا خواہ تھے۔ ان کی لاشوں کے ڈھیر سڑکوں پر لگے ہوئے تھے۔ لوگ ان کو اُٹھا اُٹھا کر پہاڑ کے کنارے سے نیچے غاروں میں پھینک رہے تھے اور صبح کے صاف آسمان پر گِدھوں کے غول ہر سمت سے جمع ہو کر سروں پر بڑی شان سے منڈلا رہے تھے کہ غاروں میں اُتر کر لاشوں کو کھائیں۔

❁ ❁ ❁

تیرھواں باب

جس زمانہ کا یہ قصہ ہے۔اس سے کچھ اوپر پچاس برس پہلے سے مغرب کے نصرانیوں نے فلسطین میں مذہبی لڑائیاں شروع کر دی تھیں ۔ چنانچہ انطاکیہ کے علاقے پر افرنجی اور بیت المقدس کے علاقے پر اطالیہ کے نصرانی ۔ امراء بادشاہ بن بیٹھے تھے ۔ قاسم کو ان علاقوں تک پہنچنے یا وہاں کے شہروں میں سکونت رکھنے کے زمانے میں بڑے بڑے معرکے پیش آتے رہے۔ کئی مرتبہ اتابک نورالدین محمود کی فوجوں میں شامل ہو کر عیسائیوں سے لڑا۔ بہت سے نصرانی شہسواروں کو قتل کیا۔خود بھی زخمی ہوا۔ایک عیسائی سردار کو مار کر اس کی زرہ اُتار لی۔ یہ اُس زرہ سے بھی زیادہ مضبوط تھی ۔ جو اس کے باپ سلیم نے چلتے وقت پہننے کو دی تھی اور قاسم نے بعد کو اُسے حسن کی نذر کر دیا تھا۔ اُس نقصان کی تلافی اس وقت خوب ہو گئی ۔ ان معرکوں کے علاوہ اور طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں ۔ یہاں تک کہ قاسم نورالدین محمود کے خاص مقربوں میں شمار ہونے لگا۔ جب مسلمانوں نے عیسائیوں کو شکستیں دینی شروع کیں ۔ تو ان کی کمک پر افرنجہ کا بادشاہ اور المانیہ کا شہنشاہ بڑی بڑی فوجیں لے کر آیا لیکن جب اس لشکر کشی میں بہت سے آدمی قتل و غارت ہو گئے اور دمشق کے محاصرے میں بھی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی ۔ تو وہ ان مذہبی لڑائیوں سے پریشان اور بیزار ہو گئے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بیڑے تو ساحلوں پر پہلے ہی سے موجود تھے ۔ فوراً جہازوں میں بیٹھ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو گئے ۔ کچھ دُور تک ان کے جہازوں کے بادبان نظر آتے رہے۔ پھر وہ بھی سمندر کے غبار میں نظروں سے غائب ہو گئے ۔ ان دونوں بادشاہوں کے ساتھ مغرب کے بہت سے نصرانی امراء اور رؤساء اور ان کی بیگمات بھی رخصت ہوئیں اور اب ملک میں ایک امن سا ہو گیا۔ دریائے اورند کے چمن بستہ ساحلوں اور بستان دفنی کے عشق آفریں جھرمٹوں اور گوشوں سے بادہ نوشی اور عشق بازی کے چرچے اُٹھ گئے ۔ ملک سے اس نصرانی غنیم کے چلے جانے پر اتابک

نورالدین دائی موصل کو موقع ملا کہ اپنی قوت و سلطنت کو ترقی دے۔ چنانچہ اس نے افرنجی حاکم انطاکیہ سے جنگ شروع کی۔ اس کے علاقے کو ویران کر کے شہر پر حملہ کر دیا۔ قاسم، اتابک کی فوج میں شامل ہو کر عرصے تک ایسی زندگی بسر کرتا رہا۔ جس میں ہر قدم پر جان کو خطرہ تھا مگر اس کو اسی حالت میں ایک گونہ تسلی میسر رہتی تھی۔

بچو! اگر میں ان کُل حالات کی تفصیل کروں گا۔ تو قصہ بہت طویل ہو جائے گا۔ رمضان کے کئی روزوں کے بعد تو اُسے شروع کیا ہے۔ اب اگر کُل حالات کا پورا پورا حال کہوں گا۔ تو جتنے روزے باقی ہیں۔ ان میں قصہ ختم نہ ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ میری نیت شروع سے یہی تھی کہ تمہارے جد امجد کے صرف وہی حالات بیان کروں۔ جن میں انہیں حشیشیوں سے خاص طور پر واسطہ رہا۔ خیر۔ قصہ مختصر۔ تو اس زمانہ میں قاسم کو نہ اُس نصرانی شہزادہ کا جس کے قتل کا حکم ملا تھا اور نہ تھور فریدا کا کچھ حال کُھلا۔ تلاش بہتیری کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ حشیشیوں کے بارے میں جو کچھ معلوم کر سکا۔ وہ صرف یہ تھا کہ وہ کثرت سے ہر جگہ موجود ہیں اور طرح طرح کی سازشیں اور فتنے مخفی طریقوں سے برپا کرتے رہتے ہیں۔ بعض فدائیوں نے قاسم سے شناخت کے جملے بول کر اس کا فدائی ہونا معلوم کر لیا۔ بعض سے خود قاسم نے سوال کر کے ان کے فدائی ہونے کا پتا چلا لیا۔ انہی فدائیوں میں سے ایک شخص تھا۔ جس کی وجہ سے قاسم کی زندگی میں جس کا حال اب بند پانی کا سا ہو گیا تھا۔ پھر تموج پیدا ہوا اور یہ اس طرح پیش آیا۔

نورالدین کی فوج شہر انطاکیہ کی شرق رویہ فصیل پر حملہ کرنے کو بڑھی، لیکن فوج اتنی نہ تھی کہ شہر کا پورا محاصرہ کر کے اُس میں ہر طرف سے آمد و رفت بند کر دیتی۔ اسی وجہ سے شہر کے مغربی جانب دریا پر اور اس زمین پر جو سمندر تک چلی گئی تھی۔ عیسائی اپنی نقل و حرکت میں بالکل آزاد رہے اور اسی سمت سے شہر میں رسد رسانی کا انتظام بھی بخوبی کرتے رہے۔ شہر کی جنوبی سمت میں ایک پہاڑ تھا۔ جس کو عیسائی مُنت سلبیوس کہتے تھے اور مسلمانوں میں اس کا نام حبیب النجار تھا۔ شہر کے شمال میں دریائے اورند تھا۔ جو شہر کے باہر باہر اس کے شمال سے مغرب کی سمت میں بہتا ہوا گیا تھا۔ شمالاً جنوباً جو فصیل شہر کی تھی۔ وہ اتنی مضبوط تھی کہ اتابک کی فوج باوجود سخت کوشش کے اس کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہی موقع تھا کہ قاسم نے قلعہ گیری کی وہ مضبوط کلیں دیکھیں۔ جن سے متحصن مقامات کو فتح کرنے میں کام لیا جاتا تھا۔ یہ آلات حرب بڑے بڑے زبردست فلاخن اور منجنیق تھے۔ جن سے بھاری بھاری پتھر شہر کے اندر

پھینکے جاتے تھے۔ یا لوہے کے نہایت وزنی نوکدار سُمبے اور شہتیر تھے۔ جن کے ہُولوں سے سنگین دیواروں میں سوراخ کر دیئے جاتے تھے۔ لمبی لمبی کڑیوں اور بلّیوں سے بہت اونچے کٹ گھر مناروں کی قطع کے بنا کر ان پر موٹی موٹی کھالیں منڈھ دی تھیں۔ نیچے پہیے لگے تھے۔ ان کو شہر کی فصیل سے ملا کر کھڑا کر دیتے تھے اور ان کے اوپر تیر انداز اور برق انداز بیٹھ کر شہر میں تیر اور آگ برسایا کرتے تھے۔ ان بلند چوبی مناروں کو عیسائی اپنی زبان میں ''گھنٹہ گھر'' کہا کرتے تھے۔ یہ تمام آلے کافروں کی ایجاد تھے لیکن لڑائی میں بکار آمد ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی ان کا بنانا اپنے دشمنوں سے سیکھ لیا تھا۔ کچھ آلے چھوٹی قسم کے بھی تھے۔ ان کو قِط کہتے تھے۔ یہ دیوار کے پاس لا کر جب کھڑے کئے جاتے تھے۔ تو دیوار کو جونک کی طرح چمٹ جاتے تھے۔ ان کے اندر سپاہی بیٹھ کر کدالوں اور بیلچوں سے دیوار میں نقب لگاتے تھے مگر عیسائی فصیل کے اوپر سے بڑے بڑے پتھر، برچھیاں اور جلتا ہوا نفط گرا کر انہیں غارت کر دیتے تھے اور مسلمانوں کا قبضہ شہر پر کسی تدبیر سے نہ ہونے پاتا تھا۔

قاسم ایسے حملوں اور معرکوں میں ضرور شریک ہوتا تھا۔ کیونکہ ان میں شرکت سے طبیعت پر ایک جوش غالب ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے اس کو اپنی اصلی پریشانیوں سے نجات مل جاتی تھی۔ فرصت کے اوقات میں ایک افرنجی سے جو مسلمانوں کی قید میں تھا۔ افرنجی زبان پڑھنی شروع کر دی تھی۔ گو کافروں کی زبان سیکھنی مذہباً اسے مکروہ معلوم ہوئی مگر اس خیال سے کہ اس سے آئندہ بہت سے کام نکلتے رہیں گے۔ کچھ زیادہ خیال نہیں کیا جس زمانہ میں کہیں کسی لڑائی میں شریک ہوتا۔ یا گھر پر بیٹھ کر سبق یاد کرتا نہ ہوتا۔ تو تھوڑ فریدا کے خیال میں محو رہا کرتا۔ سوچتا تھا کہ خدا جانے اس کی قسمت کا لکھا کیونکر پورا ہوا کہیں اس موذی وزیر موت نے اسے گرفتار تو نہیں کر لیا کہیں وہ قلعہ اَلموت میں پہنچ کر شیخ الجبل کے پنجہ غضب میں تو پھر نہیں آ گئی۔ خبر نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شاید اس چُھری سے جو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتی تھی۔ اپنا کام تمام کر لیا ہو۔ اس طرح کے خیالات تھے۔ جن میں غرق رہتا تھا۔ اکثر یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں تن تنہا رہ گیا ہے۔ شفیق و مہربان باپ اور پیاری بہن خجستہ سے ملنے اور بغداد والا گھر کا باغ دیکھنے کو جی ترسا کرتا تھا اور یہ مقتضائے فطرت بھی تھا۔ کیونکہ ابھی قاسم کی عمر ہی کیا تھی۔

ایک دن خیمہ میں بیٹھا اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ باہر سے کسی نے چپکے سے آواز

دی۔ سمجھ گیا کہ کوئی فدائی ہے۔ فوراً اسے اندر بلایا۔ فدائی نے آتے ہی اپنا قصہ کہنا شروع کیا کہ میں جاسوس بن کر شہر میں گیا تھا۔ قومس ریمند یعنی طرابلس کا مسیحی امیراوزاس کا جوان بیٹا اس وقت شہر کے اندر موجود ہیں اور شہر کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں مدد دے رہے ہیں۔ یہ دونوں باپ بیٹے محلہ اسقانیہ کے ایک مکان میں فروکش ہیں۔ ریمند کا خیال ہیکہ عیسائیوں میں مسلمانوں کے مقابلے کی زیادہ جان باقی نہیں ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ مسلمان شہر پر قبضہ کرلیں گے۔ اس لئے وہ خود اور اس کا لڑکا دونوں شہر سے جلد اپنے علاقے کو واپس جانے کا قصد رکھتے ہیں۔ تاکہ وہاں پہنچ کرایسا بندوبست کریں کہ اگر نورالدین طرابلس پر حملہ کرنا چاہے۔ تو اس کا جواب ہو سکے۔ قاسم نے فدائی سے پوچھا کہ قوس ریمند اور اس کے لڑکے کو پہچاننے کی کیا ترکیب ہے۔ فدائی نے جواب دیا کہ ان کا پہچاننا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ یہ جتنے افرنجی سردار ہیں۔ مسلمانوں کے خوف سے فولاد کا لباس زرہ بکتر خُود وغیرہ پہن کر سر سے پاؤں تک اپنے تئیں ایسا چھپائے رکھتے ہیں کہ کوئی بھی ان کو شناخت نہیں کر سکتا لیکن ان کے سپر یا چار آئینہ پر کچھ نقش ہوتے ہیں[1]۔ جن کو دیکھتے ہی ان کے ساتھی انہیں پہچان لیتے ہیں اور لڑائی کے گھمسان میں اگر ان پر کوئی آفت آتے دیکھ لیتے ہیں۔ تو فوراً ان کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اس نصرانی امیر ریمند نے اپنی سپر پر جو ناپاک نقش بنایا ہے۔ وہ ایک تصویر ہے۔ جس میں ایک مسلمان کے کٹے ہوئے سر پر ایک خنزیر کا سر بنا ہے۔

مسلمانوں کی اس توہین پر قاسم غصہ سے بیتاب ہوگیا اور چاہا کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ ایسے دشمن دین کی اولاد کا کام تمام کر دینا اچھا ہے۔ فدائی سے چند باتیں کر کے اسے رخصت کیا اور سوچنے لگا کہ آیا اسی وقت شہر میں خفیہ طور پر جا کر ریمند کے لڑکے کو تلاش کر کے لڑوں۔ یا مسلمانوں کے ہاتھ شہر کے فتح ہو جانے کا انتظار کروں۔ یہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ شہر میں جو عیسائی محصور ہیں۔ وہ ہمت ہار چکے ہیں لیکن مسلمان شہر پر کب قبضہ کرلیں گے۔ اس کا ابھی کچھ پتا نہ تھا۔

---

(۱) عیسائیوں کے امراء نے اپنی ڈھالوں پر نقش بنانے جن کا بعد کو ایک پورا دفتر مرتب ہوگیا۔ 1149ء میں شروع کر دیئے تھے لیکن ان نقوش میں آدمیوں اور جانوروں کی تصویریں بنانے کا رواج اس وقت نہیں ہوا تھا۔ امیر طرابلس ریمند کے لباس پر کوئی معمولی علامت ہوگی۔ ایسی تصویر نہ ہوگی۔ جس سے مسلمانوں کو غائت درجہ کا اشتعال ہو۔ جو تصویر یہاں بیان ہوئی ہے۔ وہ قصہ میں زور پیدا کرنے کے لئے داستان گو نے اپنی طرف سے لکھ دی ہے۔ (مصنف)

(نوٹ۔ یہاں مصنف نے بڑی خوبصورتی اور لطافت سے اپنا الزام عبدالرحمٰن کے سر تھوپا ہے۔ مترجمہ)

ممکن ہے کہ جب تک شہر فتح ہو۔ ریمند اور اُس کا لڑکا دونوں طرابلس چلے جائیں اور طرابلس پہنچ گئے۔ تو وہاں امن وامان ہے اور اُنہی کے لوگ ہیں۔ دونوں یہاں سے زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ قاسم کو اب اپنے والد کا قول جاسوسی کی نسبت یاد آیا۔ پھر تو دل نے کسی طرح گوارانہ کیا کہ جاسوس بن کر شہر میں جائے اور وہاں اس نوجوان امیر زادے کو ایک خونی مجرم و خاطی بن کر قتل کرے۔ اتنے میں ایک اور بڑا کام کرنے کا خیال آیا اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے کئی دن ہوئے تھے کہ ایک چوبی مینار کھالوں اور ڈھالوں سے منڈھ کر ایک جگہ شہر پناہ سے ملا کر قائم کیا تھا اور اس کے سب سے نیچے درجے میں بیٹھ کر دیوار کی بنیاد میں ایک سرنگ قریب قریب دیوار کے پورے آثار کے نیچے کھود لی تھی مگر اسی عرصہ میں افرنجیوں نے فصیل کے اوپر سے آگ برسا کر اس مینار کو جلا دیا۔ بہت سے آدمی جو نیچے کام کر رہے تھے۔ جل کر مر گئے۔ باقی اس کام کو ناتمام چھوڑ کر بھاگے۔ اب قاسم نے اسی سرنگ کے متعلق ایک تدبیر سوچی۔ اور فوراً نورالدین اتابک کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے بیان کیا۔ اتابک نے سن کر کہا۔ ”یہ کہو کہ اس تدبیر میں تم نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی موت کا سامان کیا ہے مگر بخت واتفاق ہے۔ ممکن ہے۔ کامیابی ہو۔ گو بظاہر وہ ممکن نہیں بہر کیف اگر ناکام رہ کر شہید ہوئے تو جنت تو کسی طرح ہاتھ سے گئی نہیں“۔

اسی دن رات کو قاسم اور چند اور لوگ جو اس کام پر اپنی مرضی سے آمادہ ہوئے تھے۔ گھروں سے نکل چپکے چپکے اس چوبی مینار کے قریب پہنچے۔ سیاہ جلی ہوئی کڑیاں اور بلّیاں اونچی اُٹھی ہوئی رات کے وقت بڑی بھیانک معلوم ہوتی تھیں اور کھالیں جو اس پر منڈھی ہوئی تھیں۔ وہ جل بھلس کر اوپر سے علیحدہ ہو کر نیچے زمین تک لٹک آئی تھیں اور جس مقام پر دیوار میں سرنگ کھودی جا رہی تھی۔ اس پر پردہ سا بن گئی تھیں۔ چنانچہ اس پردے کی اوٹ میں قاسم اور اس کے ساتھی سرنگ کے منہ پر پہنچ گئے۔ سرنگ ابھی آر پار نہیں ہوئی تھی۔ ادھر اس کا منہ چوڑا تھا مگر آگے جا کر اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ ایک آدمی وہ بھی سیدھا اس میں لیٹ سکتا تھا۔ سب سے پہلے قاسم اندر پہنچا اور ایک راج کی کرنی سے جس کا پھل بہت چوڑا اور تیز تھا۔ آگے کو کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ کرنی پتھروں کی چنائی پر نہیں۔ بلکہ پولی مٹی اور کنکروں پر پڑ رہی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ دیوار کے پورے آثار سے بھی کچھ آگے یہ سرنگ پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ اب قاسم نے بجائے سامنے کھودنے کے اوپر کو کرنی چلانی شروع کی۔ جب قاسم تھک گیا۔ تو دوسرے نے اس کی جگہ لی۔ اس طرح تقریباً رات بھر یہ مشقت جاری رہی۔ صبح ہونے

سے کچھ پہلے کرنی زمین کے پار ہو گئی۔ قاسم نے سرنگ میں جا کر کرنی اپنے ہاتھ میں لی اور جہاں کرنی زمین کے پار ہوئی تھی۔ وہاں کان لگا کر سنا۔ تو کوئی آواز اوپر نہیں معلوم ہوئی۔ اب اس نے سوراخ بڑھانا شروع کیا۔ جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ سر اور شانے دب دبا کر باہر نکل سکیں۔ تو سر اوپر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی آدمی قریب نظر نہ آیا۔ فصیل کے اوپر البتہ پہرے والے کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ فوراً سر اندر کو کر لیا اور جب وہ آواز آنی بند ہوئی۔ تو ساتھیوں سے چپکے سے کہا کہ سرنگ سے نکل کر اوپر آ جاؤ۔ یہ سب ایک ایک کر کے اوپر آئے اور جہاں اندھیرا سب سے زیادہ تھا۔ وہاں دیوار سے ملے ہوئے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ شہر پناہ میں دروازے کئی ہیں۔ حملہ جس دروازے پر کرنا ہے۔ وہ سرنگ سے شمال کی سمت میں ہے۔ اب قاسم اور اس کے ساتھ اس دروازے کی طرف اندھیرے میں دبے پاؤں چلے۔ ان میں سے تین آدمی درختوں اور مکانوں کی آڑ لیتے ہوئے آبادی کی طرف چلے۔ تاکہ وہاں جو مسلمان نورالدین کے ہوا خواہ ہیں۔ ان سے اس موقع پر عیسائیوں کے مقابلے میں مدد لیں۔ اس عرصہ میں صبح کی روشنی شہر کی دیواروں پر کچھ کچھ جھلکنے لگی۔ یہ وقت ایسا تھا کہ سپاہی پہرے سے غافل ہو گئے تھے۔ قاسم مع ساتھیوں کے اس دروازے کی طرف چلا جس پر حملہ کرنا مقصود تھا۔ اس دروازے سے مراد ایک پٹی ہوئی چوپہل عمارت تھی۔ جس کی پشت فصیل سے ملی ہوئی تھی۔ دروازہ اس عمارت میں ادھر ہی کے رُخ عمارت کے بیچ میں تھا۔ دروازے میں گھستے ہی دائیں بائیں ایک ایک چوڑا چبوترہ تھا۔ جس پر سپاہی پہرہ دے کر سویا بیٹھا کرتے تھے۔ چبوتروں سے آگے دونوں پہلوؤں پر ایک ایک پتھر کا زینہ فصیل کے اوپر جانے کا تھا اور سب سے اخیر میں ایک محراب دار دروازہ فصیل میں پھوٹا ہوا تھا۔ اس میں پھاٹک تھا اور وہ اس وقت بند تھا۔ اس محراب دار دروازے سے نکلنے کے بعد آدمی شہر کے باہر پہنچ جاتا تھا۔ عمارت کا دروازہ جو شہر کے اندر کے رُخ تھا اور جس کی طرف قاسم اور اس کے ساتھی بڑھے تھے۔ وہاں ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا مگر کچھ اونگھ سا رہا تھا۔ اسے مطلق معلوم نہ ہوا کہ دیوار کے نیچے نیچے کوئی اس طرف آ رہا ہے۔

اب قاسم کے ساتھیوں میں سے ایک آدمی نے چپکے چپکے سے سپاہی کے پیچھے پہنچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے نے پیٹھ میں خنجر بھونک کر اس غریب کو وہیں ختم کر دیا۔ اس کے بعد قاسم اور اس کے ساتھی سب دروازے میں گھس پڑے۔ دونوں طرف کے چبوتروں پر

آٹھ سپاہی سو رہے تھے۔ان سب کو جان سے مار کو وہیں ڈھیر کیا۔آگے بڑھے۔تو قاسم نے کچھ آدمیوں کو زینوں کے رستہ فصیل کے اوپر بھیج دیا۔تاکہ وہاں کا کوئی پہرے والا ان کے کام میں مخل نہ ہو اور قاسم خود بڑھ کر محراب والے دروازے پر پہنچا۔اس کی کنڈیاں اور زنجیریں اپنے ہاتھ سے کھولیں لیکن جب پھاٹک کھولنا چاہا۔ تو معلوم ہوا کہ دونوں پٹوں کو ملا کر ان پر لوہے کے ضامن جڑ دیئے گئے ہیں اور حقیقت میں محاصرے کے زمانے میں اس دروازے کے کھولنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔قاسم کے پاس کوئی اوزار ایسا مضبوط نہ تھا کہ ان کو اڑوں کو توڑ دیتا۔اب وہ زینے پر چڑھ کر فصیل کے اوپر گیا اور جو فوج کا دستہ رات کے اندھیرے میں شہر کے باہر کے رُخ اس دروازے کے قریب پڑاؤ ڈالے تھا۔اس سے چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ کسی بڑے سے درخت کے تنے کو کاٹ کر لوہے کے بھاری سُمبے لا کر اس کے ہُولوں سے پھاٹک کو فوراً توڑ ڈالو لیکن اس عرصہ میں افرنجی سپاہی چونکے اور دوسروں کو ہوشیار کرنے کے لئے گھنٹے بجائے اور فوراً دروازے کی عمارت کے گرد شہر کے اندر کے رُخ سب جمع ہو گئے۔ قاسم کے ساتھ آدمی بہت کم تھے اور ان میں سے چند فصیل کے اوپر دونوں طرف دیکھ بھال کے لئے بھیج دیئے گئے تھے۔افرنجیوں نے پہلے تو ان کی یونہی نرغہ کر کے عمارت کے اندر پیچھے کو ہٹا دینا چاہا مگر دروازے کو دہن تنگ تھا۔صرف چار آدمی باہر کے دشمن کو روکنے کے لیے کافی تھے۔بہر کیف افرنجیوں نے ایسا سخت حملہ کیا کہ ان چاروں میں دو تو مارے گئے اور دو زخمی ہو کر بیکار ہو گئے۔قاسم اور اس کے بچے ہوئے آدمیوں نے ان چاروں کو اندر گھسیٹ لیا اور پھر چار آدمی جن میں ایک قاسم بھی تھا۔دروازے میں کھڑے دشمن کا مقابلہ کرنے لگے۔افرنجیوں نے دوسرے حملے میں ان میں سے بھی دو آدمیوں کو مار ڈال۔اب قاسم یہ دیکھ کر کہ صرف چھ آدمی اس کے پاس رہ گئے ہیں اور جنہیں فصیل کے اوپر بھیج رکھا ہے۔انہیں بلانا درست نہیں۔ اپنی حالت سے قطعی مایوس ہو گیا لیکن افرنجیوں میں سے بھی کچھ کم آدمی قتل اور زخمی نہیں ہوئے تھے۔جو باقی بچے تھے۔وہ اب دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ کس طرح ان مسلمانوں کو زیر کیا جائے۔چنانچہ انہوں نے اپنے تیر اندازوں کو قریب بلایا اور دروازے کے باہر ہی سے قاسم کے آدمیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔قاسم کے آدمی جو فصیل پر تھے۔یہ ماجرا دیکھتے ہی دروازہ کی چھت پر آ کر اوپر سے ان افرنجی تیر اندازوں پر تیر برسانے لگے۔چونکہ تیر اوپر سے چلاتے تھے۔اس لئے افرنجیوں کا بہت نقصان ہونے لگا مگر

باوجود اس کے دشمن کے مقابلے میں قاسم کے پاس آدمی بہت کم تھے۔ اس عرصہ میں بہت سے افرنجی فصیل کے اوپر پہنچ گئے اور اب کچھ دیر نہ تھی کہ یہ لوگ مسلمان تیراندازوں کا قلع قمع کر دیتے لیکن قاسم نے یکا یک دروازے کے پھاٹک پر زور زور کے دھکوں کی آواز سُنی۔ سمجھا کہ کمک آن پہنچی ہے لیکن قاسم کے آدمی جو ادھر کے دروازے کو دشمن سے بچا رہے تھے۔ وہ افرنجیوں نے ایک بار پھر قاسم کے آدمیوں پر زور شور سے چڑھائی کی۔ اب ان کے مارے جانے میں کسی طرح کا شبہ نہیں رہا مگر اتنے میں افرنجیوں میں ایک شور پیدا ہو کر کھلبلی پڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ شہر میں جو مسلمان نورالدین کے ہوا خواہ تھے۔ وہ افرنجیوں پر جو دروازے کے سامنے تھے۔ عقب سے اور دونوں پہلوؤں سے حملہ کرنے لگے اور شہر کے باہر جو فوج مسلمانوں کی دروازے پر پڑاؤ ڈالے تھی۔ اس کے آدمی سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی پھاٹک کے ٹوٹ کر گرنے کی سخت آواز آئی۔ پھاٹ کے گرتے ہی نورالدین محمود کی فوج انطاکیہ کے شہر میں داخل ہو گئی۔

مسلمانوں کی اس فتح یا شہر کو لوٹنے سے قاسم کو کچھ بحث نہ تھی۔ اب جو کچھ اس نے دیکھا۔ وہ یہ تھا کہ شہر والوں میں بھاگڑ پڑی ہے اور جتنی خلقت ہے۔ وہ شہر کے مغربی دروازے۔ کی طرف بھاگی جاتی ہے۔ اس بھیڑ میں بڈھے۔ بچے، عورتیں سب ہی شامل ہیں۔ کوئی سوار ہے۔ کوئی پیدل ہے۔ کوئی اپنا اندوختہ سنبھالے ہے۔ کسی کے ہاتھ میں موتیوں کا ہار۔ کسی کی بغل میں اشرفیوں کی تھیلی ہے۔ کوئی پھٹا پُرانا بوریا ہی کندھے پر رکھے ہے۔ کوئی بچے کو گود میں لئے ہے۔ غرض سب کے سب اس ناگہانی بلائے قتل و غارت سے بچنے کے لئے شہر سے نکل کی سمندر کی طرف بھاگ رہے ہیں کہ وہاں وینس والوں کے جہاز موجود ہوں گے۔ ان پر سوار ہو کر کہیں دوسرے ملکوں کو نکل جائیں گے۔ بہت سے لوگ ایسے میں بھی ہیں۔ جن کو امید ہے کہ اگر جنوب کی طرف بھاگے۔ تو نصرانی بادشاہ بیت المقدس اور اس کے امیروں اور سرداروں کی پناہ میں آ جائیں گے۔ قاسم بھی اس بھیڑ میں پہنچ کر آدمیوں کے ریلے میں خدا جانے کہاں کا کہاں پہنچا۔ اس بات کا ڈر بالکل نہ تھا کہ کوئی اسے پہچان لے گا۔ اولاً تو سرنگ میں کام کرنے سے منہ پر مٹی اور خاک کی تہ اب تک چڑھی ہوئی تھی۔ دوسرے اگر یہ نہ بھی ہوئی۔ تو نصرانیوں کی زرہ پہن رکھی تھی اور پھر رنگ بھی اتنا گورا تھا کہ جو دیکھتا۔ اسے ایک افرنجی سپاہی کے سوا اور کچھ نہ سمجھتا۔ بھاگنے والی خلقت میں صرف نصرانی ہی نہ تھے۔ بلکہ بہت

سے مسلمان بھی تھے۔ جو عیسائیوں کی عملداری میں رہتے رہتے نورالدین کے اس حملے کو ایک بلائے آسمانی سمجھ رہے تھے۔

اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ محلہ اسقانیہ کا پتا پوچھا جاتا۔ اگر کسی سے پوچھتا بھی تو کون سنتا تھا یا اگر کوئی بتا بھی دیتا۔ تو آدمیوں کے اس ریلے سے جو ایک ہی رخ کو تھا۔ نکل کر دوسری طرف جانا ممکن نہ تھا۔ قاسم اس وقت شہر کی سب سے بڑی سڑک پر تھا۔ جو مشرق سے مغرب کی طرف گئی تھی۔ اس سڑک پر آدمیوں کا ہجوم اس کثرت سے تھا کہ جب تک یہ ہجوم مغربی دروازے تک پہنچ لے۔ اس سے کسی آدمی کا نکلنا غیر ممکن تھا دوازے کے قریب اور بھی قیامت برپا تھی۔ یہاں شہر کی بہت سی سڑکیں آ کر ملی تھیں۔ جگہ اتنی نہ تھی کہ ان تمام سڑکوں سے جو خلقت اُمڈی چلی آتی تھی۔ وہاں سما سکتی، اب کیفیت یہ تھی۔ ایک ریلے میں خلقت پیچھے ہٹتی تھی۔ ایک ریلے میں آگے بڑھنے کو دوسرے کو دھکا دیتا تھا اور کوئی کسی کے ہٹانے کو کہنیاں چلاتا تھا اور اب دور سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ دورازے کی محراب میں کسی نے ایک تصویر جڑ دی ہے۔ جس میں پریشان نظر اونٹوں کی گردنیں۔ بدکتے گھوڑوں کے مُنہ۔ سپاہیوں کر برچھیاں اور بھالے۔ جھنڈیاں اور بیرق سروں سے اونچے ہیں اور ان کا ایک دریا ہیکہ موجیں مارتا دروازے سے باہر نکل رہا ہیاور محراب کے اوپر کے حصہ میں سے نظر آ رہا ہے کہ باہر وادی اورندی کی سرسبز پہاڑیاں اور ہرے بھرے جنگل دھوپ میں پڑے ہنس رہے ہیں۔

اور اب ایک دوسری کیفیت پیدا ہوئی۔ افرنجی سرداروں کا ایک غول گھوڑوں پر سوار مختلف سڑکوں پر بھیڑ کو روکتا سنبھالتا اس کے پیچھے پیچھے نظر آیا۔ یہ شہسوار پیچھے اس لئے تھے کہ دشمن بھاگتی خلقت پر عقب سے حملہ نہ کرے۔ یہ سب لوگ بھیڑ کو اِدھر اُدھر سے روک کر دروازے کی طرف بڑھاتے تھے۔ جب سواروں کا یہ دستہ دوروازے کے قریب پہنچا۔ تو گھوڑوں سے اُتر پڑا اور ہر شخص ہتھیار سنبھال کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ جب تک کل آدمی دروازے سے نکل کر دشمن کی زد سے باہر نہ ہو جائیں۔ دروازے کی حفاظت کرتا رہے۔ شہر سے سب بھاگنے والوں کی جانوں کو بچا لینے کی انہیں امید نہ تھی۔ کیونکہ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب تک سڑکوں پر ان کا تانتا بندھا تھا۔ ان میں بعض لوگ بہت بھاری بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ عیسائی سمجھ رہے تھے کہ مسلمان ان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ قاسم کو یہ نصرانی شہسوار بہت ہی شاندار معلوم ہوئے۔ یہ سب لڑائیوں کے

بڑے آزمودہ کار نہایت دلاور اور وجیہہ بالکل خاموش لوگ تھے۔ سب کی قبائیں سپید تھیں اور ان پر فولاد کی باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے تھے۔ سرخ رنگ کی صلیبیں قباؤں پر بنی تھیں۔ ڈھالوں پر طرح طرح کے نقش تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ڈھال پر وہی ناپاک تصویر تھی۔ جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔

قاسم کسی طرح دب دبا کر اس سڑک کے کنارے آ گیا۔ جہاں لوگوں کے انبوہ نصرانی شہسواروں کے پیچھے سے نکل کر دروازے کے سامنے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بھیڑ میں سے نکل قاسم کسی طرح اُس نصرانی امیر کے پیچھے آ گیا۔ جس کی ڈھال پر وہ ناپاک تصویر بنی ہوئی تھی لیکن اس سردار کا چہرہ قاسم کی طرف نہ تھا۔ اس وجہ سے قاسم اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔ اتنے میں قاسم کو ایک آدمی نظر آیا۔ جو چکر کاٹ کر اس عیسائی امیر کے پہلو کی طرف بڑھا چلا آتا تھا۔ صورت سے یہ آدمی کوئی فقیر معلوم ہوتا تھا۔ نہایت لاغر اور حقیر سوکھا ہوا منہ۔ ایک پھٹی سی عبا پہنے تھا۔ امیر کے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنی کمر ٹٹولی اور فوراً ایک سرخ و سپید قبضے کا خنجر اس کے ہاتھ میں نظر آیا اور خنجر اس طرح اونچا ہوا کہ اب امیر کی گردن پر آیا چاہتا ہے۔ فولاد کا گلو بند امیر کی گردن پر اس وقت نہ تھا اور اب قاسم کے دل میں خیالات پے در پے اس تیزی سے آنے شروع ہوئے۔ جیسے کسی کمرے کے تمام دروازے ایک دم کھلتے ہی ہوا کے جھونکے سب طرف سے آنے لگیں۔ فوراً اس کے دل نے کہا کہ اس طرح کا قتل بڑی بزدلی کا کام ہوگا۔ اس نصرانی پر خنجر چلانے کا اگر کسی کو حق ہے۔ تو وہ میں ہوں۔ اور میں چھپ کر ایک خونی مجرم کی طرح نہیں۔ بلکہ علی الاعلان ایسا کروں گا مگر یہ فقیر ضرور کوئی فدائی ہیا ور میرا ایک فرض یہ بھی ہے کہ فدائی کی جان اگر خطرے میں ہو۔ تو اسے بچاؤں۔ قاسم لپک کر اس فقیر کے پیچھے آیا اور جونہی وہ خنجر کو گردن کی طرف لے جانے کو ہوا۔ قاسم نے فوراً اس کی کلائی پکڑی اور فقیر کو کمر پر تول زور سے بھیڑ کی طرف پھینک دیا۔ نصرانی امیر نے فوراً گردن پھیری۔ خنجر کی چمک اور قاسم کا کسی کی کلائی کو پکڑنا اس نے خوب دیکھ لیا تھا۔ گردن اِدھر مُڑتے ہی قاسم نے اس کی صورت دیکھی۔ رنگ بالکل تاریک۔ نیچے کا جبڑا بہت بھاری اور بدنما بھویں اور مونچھیں بالکل سیاہ۔ آنکھوں میں غضب بھرا ہوا۔ دہن پر ظالم ہونے کے آثار۔ چہرے پر پُرانے زخموں کے داغ اور ناک کا بانسا ٹوٹا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ قاسم نے اس صورت کو دیکھتے ہی خیال کیا کہ یہ وہ جوان نہیں ہے۔ جسے تلاش کر کے قتل کرنے کا حکم ملا ہے۔ یقیناً یہ اس کا باپ ریمنڈ

شیطان ہے۔ جو امیر طرابلس کے لقب سے مشہور ہے۔

گردن پھیرتے ہی ریمند کے منہ سے ایک نہایت مکروہ جملہ نکلا۔ جس کے سینہ پر نقش صلیب اور منہ پر ایسے ناپاک الفاظ ہوں۔ وہ مذہبی اعتبار سے نہایت ہی بُرا خیال کیا جا سکتا تھا۔ اس سخت جملے کے کہنے کے بعد قاسم سے متوجہ ہو کر بولا۔ ''قسم ہے تربت مسیح کی اے نوجوان تو نے اس وقت میری جان بال بال بچائی ہے۔ وہ دغاباز کُتا جس نے خنجر چلایا تھا۔ کدھر ہے؟''

یہ کہہ کر پیچھے دیکھا مگر وہاں بھیڑ میں خنجر چلانے والے کا کیا پتا چلتا تھا۔ اس کل واقعہ سے قاسم اس بات کو خوب سمجھ گیا کہ اس اژدحام میں حشیشیوں کے گماشتے اپنے کام میں خوب دل وجان سے مصروف ہیں اور اس کو یقین ہو گیا کہ فدائی ایک بار پھر حملہ کرینگے گلے کی زرہ اور منہ کی مٹی کا احسان مند تھا کہ اس کی بدولت کوئی فدائی اسے نہ پہچان سکے گا اور اس کی جان اس خونی فرقے کے انتقام سے بچی رہے گی۔

ریمند نے پھر قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بہادر جوان میں تم سے واقف نہیں ہوں۔ اس وقت سخت ہنگامہ ہو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ہمارے ساتھ ساتھ آؤ اور جب ہم کو اس کام سے مہلت ہو جائے۔ تو جو انعام تم طلب کرنا چاہتے ہو۔ طلب کرو''۔

قاسم نے چلا کر کہا۔ ''میرا انعام مجھے اسی وقت ملنا چاہئے''۔

ریمند نے بدگمان ہو کر کہا۔ ''کیا انعام چاہتے ہو؟''

قاسم نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تمہارا لڑکا کہاں ہے۔ میں اس سے کچھ بات کرنی چاہتا ہوں''۔

ریمند نے غور کیا کہ قاسم یونانی زبان بالکل غیر لہجے میں اٹک اٹک کر بولتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے سوال کیا۔ ''اگر تم مسیحی نہیں ہو۔ تو پھر کون ہو؟''

ریمند نے اتنا کہا ہی تھا کہ ایک بڑا شکیل جوان گھوڑے پر سوار اس کے پہلو میں آ کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ''اس نوجوان سوار کا انعام آپ اس کو ضرور دے دیں۔ میں موجود ہوں۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے کہے۔ اے صلیبی شہسوار آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے''۔

قاسم نے جواب دیا۔ ''مجھے یہی کہنا ہے کہ میں نصرانی سوار نہیں ہوں۔ تم نے اسلام کی بے ادبی کی ہے۔ اس لئے میں تم سے اکیلا لڑنا چاہتا ہوں اور اس وقت اور اسی جگہ لڑنا چاہتا ہوں''۔

ریمند نے یہ سن کر زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ''یہاں اور اسی وقت لڑنا چاہتے ہو۔ ہم تو

مصیبت زدہ گھر بار چھوڑ کر بھاگتی ہوئی رعایا کی جان بچانے میں مصروف ہیں اور تم اس وقت لڑنا چاہتے ہو۔ اس کے بعد ریمنڈ کہنے لگا" ۔ یہ آدمی حشیشیوں کا کوئی جاسوس ہے ۔ جو چاہتا ہے کہ ادھر ہم کو تو باتوں میں لگائے رکھے اور اُدھر اس کے ساتھی حملے کی غرض سے ہمیں نرغے میں لے لیں ۔ اس جاسوس مردود کی ابھی گردن اُڑا دو" ۔

ریمنڈ کے شکیل فرزند نے کہا۔" آپ اس کو قتل نہیں کر سکتے ۔ ابھی ابھی اس نے آپ کی جان بچائی ہے ۔ اگر وہ مجھ سے لڑنا چاہتا ہے ۔ تو اس میں کیا قباحت ہے ۔ البتہ اسے تھوڑی دیر صبر کرنا چاہئے ۔ ذرا یہ بھیڑ چھٹ جائے ۔ تو پھر میں بھی لڑنے کو تیار ہوں" ۔

قاسم نے اس اندیشے سے کہ کہیں شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے کہا" نہیں ۔ ابھی لڑو اور یہیں لڑو" ۔ اس وقت اتابک کی فوج اُسی سڑک کی طرف جہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں ۔ بڑھی چلی آتی تھی اور خوف یہ تھا کہ بھیڑ کے پیچھے جو دستے مسیحی سواروں کے ہیں ۔ ان پر حملہ کر دے گی مگر اسی کے ساتھ قاسم نے دیکھا کہ جن لوگوں نے رات کو سرنگ کھودنے میں اس کے ساتھ کام کیا تھا ۔ وہ اس فوج کے آگے آگے ہیں ۔ قاسم نے فوراً ان کو آواز دی اور کہا کہ" فوج کو ادھر حملہ کرنے سے روک دو" ۔ اتنا کہہ کر قاسم پھر ریمنڈ سے مخاطب ہو کر بولا ۔" اتابک کی فوج والے جو عیسائیوں کا تعاقب کر رہے ہیں ۔ اپنا حملہ ملتوی کر دیں گے اور جب تک آپ کی مستورات محفوظ مقام پر نہ پہنچ جائیں گی ۔ ایک قدم آگے نہ بڑھیں گے" ۔

ریمنڈ نے کچھ ایسی آواز میں کوئی جملہ کہا ۔ جیسے کتا دانت نکال کر غراتا ہو مگر اس بات کو خوب سمجھ گیا کہ اگر مسلمانوں نے اپنا حملہ روک دیا ۔ تو اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ بہت سے بھاگنے والے ان کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے سے بچ جائیں گے ۔ ریمنڈ کر لڑکے نے باپ سے کہا ۔" اگر یہ کافر مجھ سے لڑنا ہی چاہتا ہے ۔ تو پھر میں کیوں اس سے نہ لڑوں" ۔

ریمنڈ نے چلا کر کہا" اگر یہی بات ہے ۔ تو بجانِ مسیح تو اس سے ضرور لڑ" ۔ یہ کہہ کر اس نے پھر زور سے قہقہہ لگایا اور یہ بھی کہا ۔" مگر اس شیطان کا فوراً ہی کام تمام کر دینا ۔ تم دونوں ایک ہی سے قد اور حبثہ کے ہو ۔ اگر اس وقت رب الملائکہ نے تیری مدد نہ کی ۔ تو پھر......"

بچو ۔ ریمنڈ کے اس کلام سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے آگے نعوذ باللہ خدا کو کوئی دھمکی دینی چاہتا تھا ۔ بہر کیف ریمنڈ کا لڑکا جہاں کھڑا تھا ۔ وہاں سے نکل کر کھلی ہوئی جگہ میں آیا ۔ یہ جگہ مسیحی سواروں اور اتابک کی فوج والوں کے بیچ میں تھی ۔ قاسم بھی آگے بڑھا ۔ جگہ

ابھی تک صاف نہ تھی ۔ لوگ برابر اس پر سے گذر رہے تھے لیکن نصرانی سواروں نے اپنے گھوڑے بڑھا کر وہاں ایک حلقہ سا باندھ کر جگہ بالکل خالی کر لی ۔ جو لوگ بھاگنا چاہتے تھے مگر رُکے کھڑے تھے ۔ وہ سواروں کی پشت کی طرف سے رستہ نکال کر شہر کے باہر ہو گئے ۔

اب یہ دونوں جوان یعنی قاسم اور ابن ریمند اس خالی جگہ میں آمنے سامنے آئے ۔ اتابک کی فوج والوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ۔ دونوں جوان لڑکے ایک ہی سی عمر اور ایک ہی سے ہاتھ پاؤں کے معلوم ہوتے تھے لیکن جب انہوں نے لڑنا شروع کیا ۔ تو ابن ریمند کی لمبی تلوار دور تک کام کرتی نظر آئی اور وزنی ہونے کی وجہ سے اس کی ضربیں بھی بہت بھاری پڑتی تھیں ۔ ابن ریمند نے بڑی تیزی سے قاسم پر حملہ کیا ۔ قاسم کا کام اس وقت دشمن کی ضربوں سے بچنا تھا ۔ تلوار کے ہر ہاتھ کو سپر پر روکتا تھا ۔ ایک بار دو بار تین بار دشمن کی تلوار قاسم کی سپر پر بہت زور سے پڑی ۔ اخیر ضرب ایسی شدید تھی کہ قاسم کے قدم لڑکھڑا گئے ۔ عیسائیوں کے غول سے تعریف کا شور مچا ۔ امیر ریمند نے اس طرح چیخ کر جیسے کوئی درندہ دہاڑتا ہو کہا ۔ "اس پاگل کافر کا کام کیوں نہیں تمام کر دیتا ۔" اتنا سن کر ابن ریمند نے اور بھی تیزی اور پھرتی سے حملہ شروع کیا اور اس کی تلوار کی چمکتی باڑھ نے کبھی قاسم کے سر کی طرف اور کبھی قدموں کی طرف تڑپ تڑپ کر روشنی کا ایک چکر سا باندھ دیا ۔ چاہتا تھا کہ قاسم کے گھٹنے کاٹ دے مگر قاسم سپر سے تلوار کے ہاتھ روکتا ہوا اپنی جگہ پر قائم رہا گو ۔ بھاری تلوار کی ضرب جس وقت سپر پر پڑتی تھی ۔ تو کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر جھک جاتا تھا ۔ سب لوگ چپ تھے ۔ قوی ہیکل افرنجی بالکل بے حس و حرکت اس طرح کھڑے تھے ۔ جیسے جنات کی سنگین مورتیں زمین میں نصب کر دی گئی ہوں ۔ ایک طرف پشت پر شہر کی سیاہ دیواریں اور برج تھے اور ان کے مقابلے میں افرنجی سواروں کی سپید قبائیں اور قباؤں پر سرخ رنگ کی صلیبیں گویا اس سرے سے اُس سرے تک سیاہ زمین پر سرخ سپید رنگ کی پٹیاں عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں ۔ دوسری طرف افرنجی سپاہی قہر و غضب کی صورت بنے کھڑے تھے ۔ ہاتھوں میں نیزے اور بتر سروں سے اوپر چمک رہے تھے ۔ غرض ان سواروں اور پیادوں کے بیچ میں جو جگہ خالی تھی ۔ وہاں قاسم اور ابن ریمند میں سخت معرکہ آرائی ہو رہی تھی ۔ دیکھنے والوں کی زبان سے کبھی تعریف اور کبھی خوف کے نعرے بے اختیار بلند ہوتے تھے ۔ جس وقت موقع نازک آتا تھا ۔ سب کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں ۔ فولاد پر فولاد کی ضربوں کے سوا اور کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی ۔ یکایک کسی نے چلا کر کہا ۔ "دشمن کی سپر کو کاٹ کر ٹکڑے کیوں نہیں کر دیتا ۔ اس کے سوا دوسری

ترکیب نہیں ہے۔اس سگ ناپاک کا کسی طرح کام بھی تمام کرے گا"۔یہ امیر ریمند کی آواز تھی۔اب اسے مطلق صبر نہ رہا تھا۔ابن ریمند کی ہمت سب بڑھا رہے تھے۔یہ دیکھ کر قاسم کوئی وار نہیں کرتا۔ابن ریمند نے اپنی بھاری سپر اونچی کر کے اس طرح پھرائی کہ اس کے کنارے سے قاسم کی سپر ایک طرف کو اتنی ہٹ جائے کہ اس کے سر کو پناہ نہ رہے اور پھر تلوار کے ایک ترچھے ہاتھ میں اس کا سرتن سے جدا کر دیا جائے مگر قاسم اپنا موقع دیکھ رہا تھا اور منتظر تھا کہ دشمن بھاری تلوار اور بار بار کے حملوں سے ذرا تھکے۔تو اپنا وار کرے۔جونہی ابن ریمند نے اپنی سپر اونچی کی۔قاسم نے اُچھل کر اس کے سینہ میں اپنی سپر اس زور سے رسید کی کہ اس کی گل میخ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور ابن ریمند کا وار تلوار اور سپر دونوں خالی گیا اور اب قاسم نے ایک ہاتھ تلوار کا ایسا لگایا کہ اگر دشمن کے ہاتھ پر فولاد کا دستانہ نہ ہوتا۔تو کلائی کٹ کر الگ جا پڑتی۔سپر کے صدمہ سے بدحواس تو پہلے ہی سے ہو گیا تھا۔اب شمشیر کی ضرب نے دایاں ہاتھ بیکار کر دیا۔کھڑا نہ رہا گیا۔گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے۔گھٹنوں کا ٹکنا تھا کہ قاسم کی شمشیر دشمن کے گلے پر تھی۔

بھیڑ اب چھٹ گئی۔کچھ کچھ لوگ سڑکوں کے کنارے جاتے نظر آتے تھے۔ان میں بہت سے وہ تھے۔جو گھروں سے دیر میں نکلے تھے اور کچھ ایسے تھے۔جو لڑائی کا تماشہ دیکھنے ٹھہر گئے تھے۔ان ہی میں چند لوگ گھوڑوں پر سوار ایک پالکی کی وجہ سے جو ان کے ساتھ تھی دیر میں یہاں تک پہنچے تھے۔ان لوگوں میں چند عورتیں بھی گھوڑوں پر سوار تھیں مگر سب کہ منہ پر نقاب پڑے ہوئے تھے۔جس وقت قاسم کی شمشیر ابن ریمند کے گلے پر چمکی۔تو قاسم کو اپنے چہرہ پر ٹھنڈی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اور اس کے ساتھ ہی کسی کا دوڑ کر اس کی طرف آنا محسوس ہوا۔فوراً کوئی چیز اس میں اور اس کے مغلوب دشمن میں حائل ہوگئی۔قاسم نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ دو آسمان گوں آنکھیں فریاد و فغاں کرتی اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔قاسم نے تلوار فوراً ہٹا لی اور ابن ریمند کو ہاتھ کا سہارا دے کر زمین سے اٹھایا۔قاسم سمجھ گیا کہ مضمون کیا سے کیا ہو گیا۔

میرے بچو! ان واقعات سے تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمہارے جدامجد قاسم گو اس وقت ایک نوعمر جوان تھے مگر لڑائی میں وہ کیسے اجیر اور طبیعت کے وہ کیسے فیاض تھے۔

چودھواں باب

اس واقعہ کے بعد انطاکیہ کی رعایا اور وہاں کا حاکم اپنی فوج سمیت شہر سے نکل کر جنوب کی طرف بھاگا۔ امیر طرابلس ریمند اور اس کا لڑکا اور قاسم جسے ریمند نے حراست میں لے رکھا تھا۔ انہی بھاگنے والوں میں شامل تھے۔ اتا بک کی فوج نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ اس لئے ان لوگوں نے تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک گاؤں کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ شام کا وقت تھا۔ قاسم اسی گاؤں کی ایک جھونپڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابن ریمند نے اپنے باپ سے کہہ سن کر اس کی جان بخشی کا حکم اور گھر سے باہر نکل کر چلنے پھرنے کی اجازت تو لے لی تھی مگر ریمند نے قاسم کا انطاکیہ کو واپس جانا منظور نہیں کیا تھا کہنے لگا کہ ”جو شخص لڑنے میں ایسا کمال رکھتا ہو۔ اسے دشمن کے پاس بھیج دینا عقل کی بات نہیں ہے“۔

یہ گاؤں ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ پہاڑی کے نیچے ایک ندی بہتی تھی۔ اس کے کناروں پر کھجوروں کے درخت اور جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ گاؤں سے مغرب کی جانب سمندر آفتاب کی آخری شعاعوں میں چمکتا نظر آ رہا تھا۔ قاسم نے اس سے پہلے سمندر نہیں دیکھا تھا۔ جنوب کی طرف لبنان کا سلسلہ تھا۔ جس میں حشیشیوں کے قلعے اور حصار جابجا موجود تھے۔ قاسم جھونپڑی سے باہر نکلا اور ایک جگہ زمین پر بیٹھ کر سمندر اور دور کے پہاڑوں کی کیفیت دیکھنے لگا۔

اتنے میں ایک عورت اس کی طرف آتی نظر آئی۔ منہ پر نقاب ڈالے تھی اور کندھے پر پانی بھرنے کے لئے مٹی کی ایک ابریق تھی، سامنے آتے ہی چلتے چلتے رُکی اور جلدی سے قاسم کے پاس آن بیٹھی۔ قاسم کو بہت تعجب ہوا۔ بیٹھتے ہی اس نے منہ پر سے نقاب ہٹا دی۔ قاسم کو اور بھی حیرت ہوئی۔ اب جو دیکھا۔ تو یہ پری تھی کہنے لگی۔ ”یہاں کوئی غیر تو ہے نہیں پھر نقاب کی کیا ضرورت ہے“۔

قاسم نے اس کے پھول سے چہرے اور جوانی کے ڈیل ڈول کو دیکھا۔ جو کپڑوں میں

چھپائے کب چھپتا تھا مگر جیسی نازک اندام وہ پہلے معلوم ہوئی تھی۔ وہ بات اب نظر نہ آئی۔ عزم وہ استقلال صورت پر البتہ وہی تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو حرم سرا کی اونچی کھڑکی سے چٹان پر اُترنا کب ممکن تھا مگر آنکھوں میں جو اثر پہلے تھے۔ اب وہ قاسم کو محسوس نہ ہوا۔ پہلے وہ شرمیلی تھیں اور اب ان میں دیدہ دلیری تھی۔ شکل وصورت میں کوئی تبدیلی ہرگز ایسی نہ تھی کہ اس کی دلفریبی میں کمی ہو جاتی مگر بہشت میں رات کے وقت اُسے دیکھتے ہی جو لہر عشق ومحبت کی یک بیک اٹھی تھی۔ اب دل میں اس کا پتا بھی نہ تھا۔ غرض جو کچھ بدلا تھا۔ قاسم میں بدلا تھا۔ پری کا حسن وہی تھا۔ جو پہلے تھا مگر قاسم پر اب اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آگ کا ایک شعلہ کبھی بھڑکا ضرور تھا مگر جلدی سے بجھ گیا۔ سر میں ایک سودا اُٹھا ضرور تھا مگر کسی نے اُسے دُور کر کے خود دل میں ایسا گھر کرلیا کہ مرتے دم تک نکلتا نظر نہ آتا تھا۔

پری کہنے لگی۔ ''میری بیگم نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ آپ کا بہت ہی بہت شکریہ ادا کرتی ہیں''۔

قاسم سمندر کی طرف دیکھنے لگا اور آہستہ سے بولا۔ ''کیا ان دونوں کا بیاہ ہونے والا ہے''۔

پری: ''کبھی نہ کبھی تو ہونا ضرور ہے۔ مجھے تو یہ تعجب ہے کہ تم نے اس کے باپ کو کیوں نہ مار ڈالا''۔

قاسم: ''میرا کام بیٹے کو قتل کرنا تھا۔ باپ سے کچھ مطلب نہ تھا''۔

اتنا کہہ کر قاسم اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پری کی آنکھوں میں غصہ اُتر آیا اور کہنے لگی۔ ''مگر بیٹے کو تم قتل نہیں کر سکتے''۔

قاسم کے دل سے یہ خیال بالکل نکل چکا تھا کہ اِس نوجوان کو کسی طرح کا ضرر پہنچائے۔ کیونکہ وہ اس سے تیغ آزمائی کر چکا تھا اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بڑا جوانمرد اور شریف ہے۔ یہ خیال بھی تھا کہ اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا۔ تو تھور فریدا کو صدمہ ہوگا۔ قاسم کی رگوں میں جو خون دوڑتا تھا۔ اس میں رشک رقیب کی آمیزش مطلق نہ تھی۔ تلخیاں ضرور شامل تھیں لیکن اور تمام کدورتوں سے وہ پاک تھا مگر اس مصیبت کو کیا کرتا کہ اُس کمبخت پہاڑ والے شیخ کی اطاعت کی قسم کھا چکا تھا اور اُس کا حکم تھا کہ اس نوجوان کو قتل کیا جائے، پری کا یہ جملہ کہ تم اس کو قتل نہیں کر سکتے۔ قاسم کو ناگوار گذرا۔ کیونکہ اس جملے سے جس بات کو وہ ناممکن سمجھتی تھی۔ اس کو ممکن ثابت کرنے کے لئے قتل کے ارادے کو پھر تحریک ہوتی تھی۔ قاسم نے کسی قدر تیز ہو کر پوچھا۔''

کیوں۔ میں اسے قتل کیوں نہیں کرسکتا؟'' مگر اندر سے دل یہی کہتا تھا کہ ''بھلا اس نوجوان کی جان لینی تم سے کب ممکن ہے''۔

اب پری نے اس طرح جیسے کوئی کسی غصیل بچے کو میٹھی میٹھی باتوں سے مناتا ہو۔ آہستہ سے کہا۔ ''نہیں تمہارا جی کب گوارا کرسکتا ہے کہ اس کی جان لو۔ ہاں تھور فریدا نے ایک بات اور بھی کہی ہے''۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ تھور فریدا کا نام اور یہ چپ اس تحریک میں زور پیدا کرنے کے لیے تھی کہ قاسم ریمند کے بیٹے کو قتل نہ کرے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''ہاں وہ بات یہ کہلا بھجوائی ہے۔ کہ امیر ریمند اس بات پر بڑا خار کھائے بیٹھا ہے کہ تم نے اس کے لڑکے کو لڑائی میں ہرا دیا۔ اس لئے آج رات کو تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ یہ قتل خفیہ طور سے ہوگا۔ کیونکہ نصرانی شہسوار جس قدر یہاں موجود ہیں۔ وہ تمہاری اس بات کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ اس نوجوان کو لڑائی میں ہرا دینے پر بھی تم نے اُسے جیتا چھوڑ دیا۔ جب تم نے اس کی جان نہیں لی۔ تو پھر تمہاری بھی جان کوئی دوسرا نہ لے مگر تم جانتے ہو کہ اس ریمند کا نام شیطان ہے اور حقیقت میں پورا شیطان ہے۔ اب تھور فریدا نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ تم سے ملوں اور مل کر جس طرح بن پڑے تمہاری جان بچاؤں، دیکھو! یہ ابریق لے کر نکلی ہوں۔ گویا ندی سے پانی لینے جا رہی ہوں۔ بس اب تمہاری جان بچنے کی صورت یہی ہے کہ اُٹھو اور میرے ساتھ ندی کی طرف چلو۔ میں ساتھ ساتھ ہوں گی۔ تو کوئی یہ نہ جانے گا کہ تم یہاں سے بھاگ رہے ہو۔ آؤ۔ جدھر ندی بہتی گئی ہے۔ ادھر چلیں اور وہاں سے جھاڑیوں کی اوٹ اوٹ تھوڑی دیر میں اس گاؤں سے دُور نکل جائیں گے۔ جب تک رات بھی ہو جائے گی اور پھر میں انطا کیہ کا رستہ بتاتی ہوئی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ انطا کیہ پہنچ کر پھر تمہیں کس بات کا ڈر رہے گا۔ وہ جگہ تو تمہارے لئے بالکل محفوظ ہے''۔

قاسم پری کی اس گفتگو کو حیرت سے سنتا رہا۔ بدگمانی اس کی طبیعت میں تھی نہیں۔ دل کا بالکل صاف تھا۔ پری نے جو کچھ کہا۔ اسے سچ جانا۔ رہا اپنی جان کا خطرہ۔ تو سوچنے لگا کہ اگر وہ خطرے میں ہے۔ تو ہونے دو۔ طبیعت اب تھک گئی ہے۔ آگے کی ٹوہ کون کرے۔ جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا۔ اپنے مرنے کا غم! اگر کچھ ہوگا۔ تو صرف اتنا کہ بغداد میں ماں باپ کا گھر ماتم کدہ ہو جائے گا۔

پری قاسم کی صورت غور سے دیکھے جاتی تھی۔ نظر میں وہ پہلی سی سختی نہ تھی۔ بلکہ نگاہیں قاسم

سے اس طرح فریاد کر رہی تھیں۔ جس طرح پہلے ایک مرتبہ بہشت میں فریاد کر چکی تھیں۔
قاسم نے جواب دیا۔ ''جس طرح تم کہتی ہو۔ اس طرح میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ عیسائی سب میرا اعتبار کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے اس طرح جانے میں تمہاری بدنامی ہو گی۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ جس کی تم خادم ہو۔ اس کی خدمت میں برابر حاضر رہو۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ تمہاری آقا کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے اور تم اس کے ساتھ رہو۔ اس کام کے لئے بھی کوئی تدبیر سوچی ہے کہ وہ کہاں جائے گی''۔
پری: ''وہ تو ریمند کے لڑکے سے اپنا بیاہ کرے گی''۔
قاسم کو تھور فریدا کا کہنا یاد آیا اور پری سے کہنے لگا۔ ''امیر ریمند یہ بیاہ ہرگز نہ ہونے دے گا''۔
پری: ''بیشک جب تک وہ جیتا ہے۔ اس وقت تک ایسا نہیں ہو سکتا لیکن......'' آگے کچھ کہنے کو تھی مگر رک گئی۔ قاسم مطلب سمجھ گیا۔ اتنے میں پری نے اپنا ہاتھ قاسم کی طرف بڑھایا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ چپکے سے کہنے لگی۔ ''قاسم! کیا بہشت کو بھول ہی گئے۔ وہاں تو تم ایسے سنگ دل نہ تھے۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم کو......مگر اس وقت تو کچھ اور ہی باتیں سامنے ہیں۔ وہ تو اب ہر طرح سے پناہ میں ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ امیر کے لڑکے سے اپنا بیاہ رچائے گی۔ اس کی طرف سے اب کاہے کا فکر ہے''۔
پری کا ہاتھ قاسم تک پہنچا۔ اپنا سر اُس کے بازو پر رکھ دیا۔ آنکھیں منتیں کرنے لگیں۔ سینہ کبھی اُبھرا کبھی پست ہوا اور اب اس کے نازک جسم کی لطیف گرمی قاسم تک پہنچنے لگی۔ تا کہ حلاوت حد سے گذر جائے۔ قاسم کو پری پر بے انتہا رحم آیا۔ تسلی و تشفی کی باتیں کہنی شروع کیں۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں کو غور سے دیکھتے دیکھتے کہا۔ ''للہ مجھے بھول جاؤ، دل سے بالکل مٹا دو، اپنے خوش رہنے کا سامان کہیں اور ڈھونڈو۔ جویندہ یابندہ لیکن مجھے معاف رکھو۔ میرا بیاہ تو بُرے بھاگوں سے ہو چکا ہے۔ اپنی تقدیر میں تو سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں اُترا''۔ قاسم نے جس وقت یہ جملے کہے، تو خیال ہوا کہ دل جن باتوں کو مدت سے چپکے چپکے کہا کرتا تھا مگر وہ صاف نہ سنائی دیتی تھیں۔ آج زبان کس بے تکلفی سے انہیں ادا کر رہی ہے۔
پری: ''ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ اگر ہم دونوں بھاگ چلیں۔ تو پھر کوئی خطرہ نہیں رہتا لیکن اگر انکار کرتے ہو............نہیں خدا کے لئے انکار نہ کرو۔ بس اب اُٹھو چلو''۔ یہ کہہ کر نازک نازک ہاتھوں سے قاسم کا بازو پکڑ کر کھینچا اور کہا ''پیارے بس چلو۔ یہاں سے

بھاگ چلیں''۔

قاسم: ''تقدیر سے کون بھاگ سکتا ہے''۔

پری: ''دل مضبوط ہو۔تو تقدیر بھی اپنے بس کی ہو جاتی ہے''۔

قاسم: ''نہیں تقدیر سے بھاگنا کمزوروں کا کام ہے''۔

پری رو کر کہنے لگی۔'' قاسم، قاسم، کیوں اپنی جان گنواتے ہو۔بہشت کو کیوں بھول گئے''۔یہ جملہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔اس وقت یاس وحرمان سے پھر کہا اور اب یکا یک اس کی آواز نرم اور عالم بے خودی کی سی ہو گئی۔

قاسم کا دل رحم سے موم ہو گیا تھا مگر پھر بھی جی کڑا کر کے کہنے لگا۔''بہشت تو نہیں دوزخ البتہ یاد ہے''۔

پری نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔''نہیں وہ دوزخ نہ تھی۔آؤ چلو۔میں بہشت میں تمہیں لے جاؤں گی۔پھر ساری زندگی بہشت ہی بہشت نظر آئے گی''۔

قاسم ہنسا اور کہنے لگا۔'' میری زندگی میں بہشت کہاں کسی شاعر نے کہا ہے۔اگر مصیبتوں نے کسی کا روشن چہرہ تاریک کر دیا ہے۔تو اپنی زندگی بھی دوزخ ہو گئی ہے اور اگر وہی چہرہ خوش وبشاش ہے تو اپنی زندگی گو دوزخ نہ رہے مگر وہ جنت بھی نہیں ہو سکتی''۔

پری نے قاسم پر سے ہاتھ ہٹا کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا۔آنکھوں میں غصہ بھر آیا۔ابریق سنبھال کر اٹھی۔دو قدم چل کر مُڑی اور غصہ ٹھنڈا کر کے کہنے لگی۔''تو تم انطا کیہ نہیں چلو گے؟''

قاسم نے سر ہلا دیا۔

پری منہ پر نقاب ڈال آگے بڑھی۔پہاڑی سے آہستہ آہستہ نیچے اُتر کر جدھر سورج ڈوب رہا تھا۔ادھر چلنے لگی۔یہاں تک کہ ندی کے کنارے جہاں کھجور کے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔پہنچی پھر جدھر سے ندی بہہ کر آتی تھی۔اُدھر قدم بڑھائے۔ندی کے کنارے مینہ برسنے پر مویشیوں کے چلنے سے جو گڑھے پڑ کر اب سخت ہو گئے تھے۔ان میں پاؤں پڑ کر زخمی ہوئے۔جھاڑیوں کے کانٹوں میں اُلجھ کر کپڑے کہیں کہیں سے پھٹ گئے۔آخر کار اسی حال میں چلتے چلتے ایک جگہ جہاں جھاڑیاں بہت گھنی تھیں پہنچی۔جہاں تک لوگ ندی سے پانی بھرنے آیا کرتے تھے۔وہاں سے یہ جگہ بہت دور تھی۔کندھے سے ابریق نیچے رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔نقاب چہرے سے ہٹا دی اور اب رونا شروع کیا۔اتنا روئی اتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔

بڑی دیر تک یہی حال رہا۔ رونا کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا اور آسمان پر شفق پھولی۔ تب یکبارگی ڈر کر اُٹھی۔ کسی کی آواز یہ کہتی سنائی دی۔ ''مائی کچھ خیرات کرتی جا''۔ مڑ کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ جھاڑیوں میں سے کوئی اُسے جھانک رہا ہے اور اب سے نہیں بڑی دیر سے جھانک رہا تھا اور اس لئے اس کا رونا بھی خوب سنتا رہا ہوگا۔ گھانس پر کسی قسم کی آہٹ تک نہیں سنائی دی تھی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دیر سے یہاں چھپا بیٹھا تھا اور اب یہ آدمی جھاڑی میں سے نکل کر ندی کے کنارے آیا۔ پری کی رہی سہی جان اور جاتی رہی۔ یہ ایک دبلا سوکھا فقیر نے ہاتھ سے اشارہ کر کے روکا اور بہت آہستگی میں کہا۔ ''مائی ڈر نہیں میرا تیرا دین ایک ہے۔ تو کیوں اس طرح رو رہی تھی۔ مجھ سے کہہ۔ ہم اللہ والے لوگ ہیں۔ بیسیوں کرامتیں جانتے ہیں''۔

پری پیت کی ماتی تو ہو ہی رہی تھی۔ قاسم کی باتوں نے اور بھی دل کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ تھوڑ فریدا سے اس کو بہت محبت تھی لیکن قاسم سے دل اٹکنے کا حال اس سے بھی نہ کہہ سکتی تھی مگر چاہتی یہی تھی کہ اس حالت بیقراری میں کسی طرح تسکین نصیب ہو۔ فقیر کے کہنے سے ٹھہر گئی اور منہ پر نقاب ڈال کر بولی۔

''ہم عورتوں کے آزار کا باعث تو ایک ہی چیز ہوا کرتی ہے''۔

فقیر نے کہا۔ ''سچ ہے۔ تم لوگوں کا باعث آزار سوائے کسی مرد کے اور کون ہو سکتا ہے۔ بے وفائی۔ کسی کا دل لے کر خود کسی اور کو دل دے دینا یہی شکایتیں ہیں۔ جو بالعموم عورتوں کو مردوں سے ہوا کرتی ہیں''۔

اتنا سن کر پری نے پھر رونا شروع کیا۔

فقیر نے پھر دلاسا دے کر کہا۔ ''مائی۔ جو کچھ تجھ پر بیتی ہے۔ مجھ سے کہہ تو۔ شاید میں تیرے درد کی دوا کر سکوں''۔

پری نے روتے روتے کہا۔ ''وہ مسلمان ہے۔ پھر بھی ایک عیسائی پر جان دینے لگا ہے۔ اس کا کیا تصور ہے۔ سارا قصور اس گوری صورت اور سنہری بالوں کا ہے''۔

اتنا سنتے ہی فقیر کا ماتھا ٹھنکا اور وہ ایک عجیب نگاہ سے پری کو دیکھ کر بولا۔ ''یہ بڑی ناروا بات ہے۔ وہ گوری صورت کوئی ساحرہ ہوگی۔ اس کے سحر سے اس مرد کو ضرور بچانا چاہئے۔ گھبرا نہیں۔ تیرا عشق پھر اس کے دل میں پیدا ہو جائے گا۔ چند باتیں مجھے اور بتا دے۔ انہیں جانے

بغیر میں تیرا دکھ دُور نہیں کر سکتا۔ کیا وہ گوری صورت کہیں آس پاس یہیں موجود ہے؟''

پری: ''ہاں ہاں اسی گاؤں میں تو ٹھہری ہے۔ نصرانیوں کے ساتھ ہے۔ جو انطا کیہ سے بھاگ کر آئے ہیں''۔

فقیر: ''اگر یہاں سے اس عورت کو غائب کر دیا جائے۔ تو پھر تو تیری بات بن جائے گی؟

پری: ''ہاں پھر تو وہ میرا ہو جائے گا''۔

فقیر: ''بات یہ ہے کہ وہ گوری عورت جادوگرنی ہے اور تُو جس پر جان دیتی ہے۔ اُس پر اس عورت نے جادو کر دیا ہے۔ ہمیں جادو اُتارنا خوب آتا ہے لیکن پہلے اس کا نام معلوم ہونا چاہئے اور ایک مرتبہ اس کی صورت بھی دیکھنی ضروری ہے''۔

پری نے جواب دیا۔ ''اس کا نام تھورفریدا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اب جنوب کی طرف بیت المقدس جانے والی ہے۔ شاید کل جائے یا پرسوں۔ ٹھیک نہیں کہہ سکتی۔ وہاں کا جو بادشاہ ہے۔ اس کی ماں ملکہ ملیسندی کے پاس وہ حاضر ہوگی اور اتنا اور بتائے دیتی ہوں کہ اس کا رنگ ایسا گورا ہے کہ کیا کسی کا ہوگا اور اس کے بال ایسے ہیں۔ جیسے سونا بکھر گیا ہو اور اس کی آنکھوں کا رنگ ایسا سمجھو۔ جیسے صبح کے وقت آسمان کی آبی رنگت ہوتی ہے مگر مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ وہ ہمیشہ میرے حال پر مہربان رہی ہے۔ تم اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا''۔

فقیر ہنسا اور اس کی ہنسی بڑی منحوس تھی۔ پھر کہنے لگا ''نہیں خاطر جمع رکھو۔ اُسے کسی طرح کا ضرر نہیں پہنچے گا۔ اگر میں اُسے ایک دفعہ دیکھ لوں اور جان لوں کہ یہی ہے۔ تو پھر اس کے جادو کا جواب کر دوں گا مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ اس انطاکیہ کے حاکم کے ساتھ بہت سے نصرانی امیر اور رئیس اور بڑی بڑی بیگمات ہیں۔ اتنے مجمع میں خاص اس عورت کو پہچان لینا بڑا دشوار ہوگا''۔

پری: ''اس میں کیا مشکل ہے۔ سنو۔ تمہیں ایک بھید بتائے دیتی ہوں۔ تھورفریدا امیر طرابلس کے ساتھ ہے اور اس شیطان امیر کو اس سے سخت نفرت ہے۔ نفرت یوں ہے کہ وہ بن باپ کی ہے۔ نہ روپیہ ہے نہ جہیز ہے۔ اس کا باپ ارفہ کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ امیر کو تو اس سے نفرت ہے مگر بیٹے نے قسم کھا رکھی ہے کہ بیاہ کروں گا۔ تو اسی سے کروں گا۔ باپ چاہتا ہے کہ کسی بڑی امیر زادی سے ہو۔ جو بہت سا مال متاع ساتھ لائے۔ اچھا۔ تو آج رات کو انطاکیہ کا حاکم چپکے سے انطاکیہ کو پھر روانہ ہونے والا ہے۔ تاکہ شہر کے دروازوں پر اپنی فوج بٹھا کر صبح ہوتے ہی ہلّہ کر کے شہر میں گھس پڑے اور اتابک کی فوج کو غارت کر کے پھر شہر پر قبضہ کر لے۔ اب اس

شیطان امیر طرابلس نے یہ ترکیب کی ہے کہ اپنے لڑکے کو اس حاکم کے ساتھ انطا کیہ کی مہم پر بھیج رہا ہے اور لڑکے سے یہ کہا ہے کہ یہ مہم سر کر لی۔ تو بڑا نام ہوگا لیکن اصلی مطلب یہ ہے کہ تھور فریدا اور یہ لڑکا پاس پاس نہ رہیں اور یہ شیطان امیر اب خود طرابلس جانے کو ہے اور تھور فریدا کو اپنے ساتھ لئے جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اس کو ملکہ ملیسندی کے پاس بھیج دے گا۔ انطا کیہ پر حملہ کرنے کی خبر میں نے تھور فریدا کے منہ سے سنی ہے۔ اس سے اور سب باتیں نکال کر سمجھنی کیا مشکل ہیں''۔

فقیر تھوڑی دیر تک فکر میں رہا۔ پھر کہنے لگا۔''میں نے ایک بات سوچی ہے۔ یہ نصرانی مجھ فقیر کو تو کیا ستائیں گے۔ جب تم طرابلس پہنچو گی۔ تو میں کہیں سڑک کے کنارے بیٹھا یا گلی کوچوں میں بھیک مانگتا ہوں گا مگر جب کبھی وہ عورت باہر نکلے تو تم ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا اور ایک چھوٹا سا رومال اپنے سر پر ہرے رنگ کا باندھ لیا کرنا''۔

پری نے کہا''یہ تو میں سب کرلوں گی۔ وہ میری مالک ٹھہری۔ میں اس سے کب جدا ہوتی ہوں لیکن اس بات کی قسم کھاؤ کہ تم اس کو کسی طرح کا نقصان تو نہ پہنچاؤ گے''۔

فقیر:''میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کو کسی طرح کا نقصان یا ضرر نہ پہنچاؤں گا۔ صرف جادو جو اس نے کر دیا ہے۔ اسے اُتار دونگا اور پھر جس سے تم کو عشق ہے۔ وہ اس عورت کا عاشق نہ رہے گا۔ بلکہ تم پر جان دینے لگے گا اور اس نصرانی عورت کا نکاح امیر طرابلس کے لڑکے سے ہو جائے گا۔

اتنا کہہ فقیر جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ پری ندی کے کنارے کنارے اُلٹے قدم گاؤں کو چلی۔ جھاڑیوں میں وہ فقیر پھر کہیں نظر نہ آیا۔ نظر کہاں سے آتا۔ وہ تو شمال کی طرف اب تک کہیں کا کہیں پہنچا تھا اور ہنس ہنس کر دل میں کہتا جاتا تھا''۔ اس ریمنڈ شیطان کا لڑکا کل صبح ہی جہنم واصل کر دیا جائے گا اور پھر اس فرنگن کو اڑا کر آشیانہ عقاب میں پہنچا دوں گا اور اس دو گونہ کارگذاری سے شیخ الجبل کو نہایت اطمینان ہوگا''۔

فقیر نے رستہ میں کہیں دم نہ لیا۔ شمال کی سمت میں انطا کیہ پہنچنے کے قصد سے برابر چلتا رہا۔

پندرھواں باب

آفتاب غروب ہوا۔ تو قاسم جھونپڑی میں زمین پر سونے کو لیٹ گیا۔ یہ تو سُن ہی چکا تھا۔ کہ امیر طرابلس آج رات کو اُسے مروا ڈالیگا دل میں کہنے لگا۔ کہ "اپنا مطلع بخت و اقبال تاریک ہو چکا ہے۔ فکر و تردد کی ظلمت نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اب کسی بات کا کیا ڈر کروں۔ تھور فریدا اپنے عزیزوں میں پہنچ چکی ہے اور میں تقدیر کے بس میں ہوں"۔ رات بھر کی محنت و مشقت اور دن بھر کے خطروں سے تھک کر چُور رہو رہا تھا۔ یہی باتیں سوچتے سوچتے غافل سو گیا۔

کوئی تین گھنٹے کی نیند کے بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سے آنکھ کھلی۔ فوراً خیال ہوا۔ کہ پری کا کہنا سچ نکلا۔ یہ کوئی آدمی ہے۔ جسے امیر نے میرے قتل کے لئے بھیجا ہے۔ جس طرح پڑا تھا۔ اسی طرح چپکا پڑا رہا۔ مگر آہستہ سے خنجر کمر سے نکال لیا۔ انسان کو زندگی کتنی ہی دوبھر ہو جائے۔ لیکن جب دیکھتا ہے۔ کہ جان چلی۔ تو پھر اُسے ایسا چمٹتا ہے۔ کہ جدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں جو صورت جھونپڑی میں گھسی تھی۔ دھندلی۔ دھندلی دکھائی دیتی تھی۔ قاسم تیار تھا۔ کہ پاس آتے ہیں اس پر جست کرے۔ لیکن ایک آواز چپکے سے یہ کہتی سنائی دی۔ "قاسم تم جاگتے ہو؟" اتنا سُن کر قاسم نے سر اونچا کیا۔ سمجھ نہ آتا تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگا" ۔تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟"

اندھیرے میں اس صورت نے جواب دیا۔ "قتل کرنے نہیں تمہاری جان بچانے آیا ہوں۔ میں وہی ہوں۔ جس کا گلا تم کاٹنا چاہتے۔ تو کاٹ دیتے۔ مگر تم نے چھوڑ دیا۔ میں امیر ریمند کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے تم کو یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ مجھے اس نے لشکر کے ساتھ انطاکیہ جانے کی اجازت دے دی ہے۔ جہاں ہم کو ایک بڑی مہم سر کرنے کی امید ہے۔ تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ جب شہر پناہ کے قریب پہنچیں گے۔ تو تم شہر میں اپنے دوستوں کے پاس چلے جانا"۔

قاسم نے یہ باتیں سُن کر سوچا۔ کہ خلیفہ بغداد کے ارشاد کی تعمیل ابھی باقی ہے۔ اگر زندہ رہا۔ تو ممکن ہے۔ تھور فریدا کو بھی ضرورت کے وقت مدد پہنچا سکوں۔ یہ سوچ کر جلدی سے اٹھا اور ابن ریمند کے ساتھ اندھیرے میں نکل گیا۔ کچھ دور جا کر دیکھا۔ کہ حاکم انطا کیہ کی فوج ایک جگہ جمع ہے۔ آدمی گو کم ہیں۔ لیکن جتنے ان میں بعض بڑے قوی ہیکل لڑائیوں کے آزمودہ کار لوگ ہیں۔ ایک گھوڑا کسا کسایا قاسم کے واسطے موجود تھا۔ دونوں گھوڑوں پر بیٹھ تاروں کی چھاؤں چھاؤں کوچ کرنے لگے۔

ابن ریمند نے قاسم کا گھوڑا اپنے برابر رکھا اور نہایت اخلاق اور محبت سے اس کی ساتھ پیش آیا۔ بہت سی باتیں کرتا رہا۔ ان میں ایک یہ تھی۔ کہ حاکم انطا کیہ نے بلادِ جنوب سے کمک آنے کا مطلق انتظار نہیں کیا۔ اس کو کامل یقین ہے۔ کہ اگر علے الصباح شہر پر حملہ کر دیا۔ تو اس وقت اتا بک کی فوج دن بھر کی لوٹ مار سے تھکی ہاری بے خبر سوتی ہوگی۔ مقابلے کے لئے تیار نہ ہو سکے گی اور ہمارا قبضہ شہر پر بہت آسانی سے ہو جائے گا۔ کچھ اشارہ اس طرف بھی کیا۔ کہ ایک خاص معاملے میں اُس میں اور اس کے باپ میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ مگر اس مضمون پر اس کی گفتگو کچھ ایسی رُکی رُکی تھی۔ کہ مفہوم صاف سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اس طرح سفر کٹتا رہا۔ جب رات ختم ہونے کو ہوئی۔ تو ایک میدان میں پہنچے۔ جو انطا کیہ سے جنوب مغرب میں واقع تھا۔ اب بہت چپ چاپ اور بڑی احتیاط سے وہ شہر پناہ کی طرف بڑھے۔ گھوڑوں کو کچھ دُور ادھر ہی چھوڑتے گئے۔ تا کہ ان کے ساز میں جو گھنٹیاں لگی تھیں۔ ان کی آواز سے دشمن کے پہرے والے ہوشیار نہ ہو جائیں۔ جب شہر کے نیچے پہنچ گئے۔ تو سب نے صبح کے انتظار میں کچھ دیر آرام کیا۔

لیکن جب آفتاب قلمرو ظلمت کو طے کر چکا اور تنویر صبح نے اپنے زریں خیمے میدان میں نصب کئے۔ تو انطا کیہ کا حاکم اور اس کے شہسوار شہر کی دیواروں کے نیچے آئے۔ سوار اور پیدل سب کے ساتھ قلعہ گیری کے آلات اور فصیلوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں موجود تھیں۔ فصیلوں پر پہرے والے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ عیسائی جوانوں نے اوپر چڑھنے کے لیے دیواروں کے نیچے سیڑھیاں لگائیں۔ جونہی ان پر قدم رکھا۔ دفعتاً ایک شور ہوا اور فصیلوں پر مسلمان سپاہی بکثرت نظر آنے لگے۔ یہ سب آہٹ پاتے ہی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور اب اوپر سے بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر آگ اور تیروں کا مینہ دشمن پر برسانے لگے۔ جس

میدان میں عیسائیوں کی فوج اتری تھی' وہاں بھی اردگرد کے جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل کر مسلمانوں نے حاکم انطاکیہ کی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اب دشمن کو قتل کرنا شروع کیا۔ انطاکیہ کا حاکم اور اس کے ساتھ بڑے بڑے نامی مسیحی سردار اس ہنگامے میں قتل ہو گئے۔ مسلمانوں نے اس طرح ان کو نرغے میں لیا کہ وہ سب ایک ہی جگہ مر کر ڈھیر ہو گیا اور ان کی لاشوں کا ایک اونچا پشتہ بندھ گیا۔

قاسم کی کیفیت یہ تھی کہ اتابک کے لشکر میں جو لوگ اپنے ہی ساتھ کے تھے۔ ان کے ہاتھ سے قتل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ قاسم جوزرہ پہنے تھا وہ عیسائیوں کی وضع کی تھی اور کسی مسلمان کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ وہ عیسائی نہیں ہے۔ ہنگامہ نہایت سخت تھا۔ نصرانیوں پر مسلمانوں کی تلواریں اور نیزے اپنا کام کر رہے تھے اور تیروں کی بارش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ اس وقت قاسم کو یک لخت یہ خیال پیدا ہوا کہ ''ابن ریمند میری سپردگی میں ہے کہ اس کو بچاؤں تو کیونکر بچاؤں'' حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یہ دونوں اجل رسیدہ ہو رہے تھے۔ گو موت نے جو اس وقت طرح طرح سے لوگوں کی جان لے رہی تھی۔ ابھی تک ان پر ہاتھ نہ ڈالا تھا۔ قاسم نے ادھر اُدھر دیکھا۔ بھاگنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ہر طرف لڑنے والے کٹ کٹ کر اس طرح گر رہے تھے جیسے کسان کی درانتی سے کھیت کاٹا جاتا ہو۔ اب کوئی دم میں ان دونوں کی باری بھی آنے کو تھی۔ یہاں تک کہ ایک غول مسلمانوں کا لاشوں اور زخمیوں میں سے راستہ نکالتا ہوا ان کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ قاسم نہایت پریشان ہو کر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ لوگ اور تمام لڑنے والوں سے زیادہ دلیر۔ پھرتیلے اور خون کے پیاسے معلوم ہوتے تھے۔ ان کا افسر ایک دبلا سوکھا ہڈیوں کا پنجر آدمی تھا۔ جوزرہ پہنے تھا اور سر پر عربوں کا کسوہ بندھا تھا۔ جس کا کپڑا نیچے تک آتا تھا اور اس نقاب کے اندر وہ لاغر اور حقیر چہرہ تھا جس کے ہر شکن سے ظلم اور جفا کاری ظاہر تھی اور کسی خاص آدمی کی تلاش میں تیز آنکھیں گہرے حلقوں میں ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ جب وہ قریب آیا تو قاسم نے اس کے ہاتھ میں حشیشیوں کا سرخ و سپید دستے والا خنجر دیکھا۔ اس کے اور ہمراہیوں کے پاس بھی اُسی طرح کے خنجر تھے۔ اتنا دیکھتے ہی قاسم ابن ریمند کے سامنے آ گیا تاکہ یہ قاتل اسے نہ دیکھنے پائیں اور اس سے چپکے سے کہا کہ سپر جس پر خنزیر کا سر بنا ہے۔ اپنے ہاتھ سے فوراً نکال کر علیحدہ کر لو۔ اتنا کہہ کر قاسم نے اپنی کمر سے دو خنجر جو فدائیوں کے خنجر تھے' نکالے۔ ان میں سے ایک ابن ریمند کو دیا اور فوراً اس کا بازو پکڑ گھسیٹتا ہوا لاشوں کے ڈھیر کے

قریب گیا اور اس ڈھیر میں تلاش کرتا ہوا ایک عیسائی شہسوار کی لاش پر پہنچا اور ابن ریمند نے جو خنزیر کے نقش والی سپر اپنے ہاتھ سے علیحدہ کر لی تھی۔ اس کا تسمہ اس مُردے کے ہاتھ پر باندھ دیا اور ابن ریمند سے چپکے سے کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور بالکل گونگے بن جاؤ۔ خبردار جو منہ سے کچھ بولے۔ اتنا سمجھا کہ یہ دونوں لاشوں کے اس تودے کی آڑ میں چکر سا کاٹ کر پہلو کی طرف سے حشیشیوں کے غول میں شامل ہو گئے اور قاسم خنجر اونچا کئے اللہ اکبر کے نعرے لگا تا ان حشیشیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ ابن ریمند اس کے پہلو میں ساتھ تھا۔ دونوں کے چہرے پسینے میں ڈوبے ہوئے اور آس پاس کے زخمیوں سے جو خون کے فوارے چلے تھے۔ ان سے رنگے ہوئے تھے لیکن اس غول کے افسر نے جو عرب معلوم ہوتا تھا اور جس کی حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں بے قراری کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ قاسم کو فوراً تاڑ لیا اور پوچھا۔ ''تم ہمارے گروہ کے آدمی نہیں ہو۔ تم کہاں سے آئے ہو؟''

قاسم نے جواب دیا ''میں نصرانیوں میں مل گیا تھا اور انکی صفوں میں پہنچ کر میں نے بہت سے کافروں کو قتل کیا ہے''۔ یہ کہہ کر قاسم نے خنجر اس طرح پکڑا کہ وہ افسر خنجر کا دستہ دیکھ لے۔

افسر نے ابن ریمند کی طرف دیکھ کر پوچھا ''اور یہ کون ہے؟''

قاسم نے جواب دیا ''یہ ولایت شام کا ایک فدائی ہے۔ اس کو بطور رہنما کے میں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یہ فدائی چپ ہے۔ بات نہ کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہے''۔

اس جواب پر بھی افسر کے دل سے شبہ رفع نہیں ہوا اور پوچھنے لگا کہ ''تم نصرانیوں کی فوج میں کیوں گئے تھے اور کس کے حکم سے گئے تھے؟''۔

قاسم نے خوب دلیر ہو کر جواب دیا ''خود شیخ الجبل کے حکم سے شیخ کا حکم تھا کہ امیر طرابلس کے لڑکے کو قتل کروں۔ چنانچہ اسی قصد سے جس وقت کفار کی فوج شہر سے نکل کر بھاگی۔ تو میں اس کے پیچھے ہولیا۔ آگے چل کر جاسوسوں سے خبر ملی کہ یہی فوج پھر پلٹ کر شہر پر حملہ کرنے کو ہے اور امیر کا لڑکا بھی اس فوج کے ساتھ ہوگا۔ اتنا سن کر میں رستے ہی میں ٹھہر گیا اور جب فوج شہر کی طرف جاتی ہوئی ملی تو رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھ ہولیا''۔

افسر نے بہت ہی پیچ و تاب کھا کر پوچھا ''اور اس شیطان امیر کا لڑکا اب کہاں ہے؟''

قاسم نے لاشوں کے تودے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''میں اس کا انصاف پہلے ہی کر چکا ہوں''۔

اتنا سنتے ہی وہ اور اس کے ساتھی لاشوں کے تودے کی طرف دوڑ پڑے۔ لاشوں کو الٹ پلٹ کر کسی خاص لاش کو ڈھونڈنے لگے۔ قاسم کو موقع ملا۔ ابن ریمند کا ہاتھ پکڑ کر جہاں ہنگامہ زور کا تھا' اس کے پیچھے کی طرف آیا اور اب دفعتاً اس نے حشیشیوں کے غول سے ایک نعرہ بلند ہوتے سنا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔

جس مقام پر قتل عام ہو رہا تھا۔ اس کے گرد میدان میں جا بجا مسلمانوں کے گروہ کھڑے تھے۔ یہ لوگ فتح کی خبر سن کر تماشا دیکھنے یا لوٹنے کی غرض سے شہر سے نکل کر باہر آئے تھے۔ زخمی مرہم پٹی کے لئے شہر کی طرف جانے لگے۔ عیسائی سواروں کے گھوڑے چھوٹ کر میدان میں ادھر اُدھر سرپٹ بھاگے۔ قاسم اور ابن ریمند نے ان میں سے دو گھوڑے پکڑ لئے اور ان پر سوار ہو' رات کو جدھر سے آئے تھے ادھر ہی کو بھاگے۔ تھوڑی دیر میں ایک اونچی پہاڑی رستے میں آئی۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر راسیں ہاتھ میں لئے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ یہاں ایک اونچے مقام سے انہوں نے لڑائی کے میدان کی طرف دیکھا۔ قتل اب بند ہو گیا تھا۔ نصرانیوں کی فوج کا نام ونشان سوائے مُردوں کے تودوں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے فتح کے نعرے کبھی کبھی کچھ اڑتے سے سنائی دیتے تھے۔ یہ کیفیت دیکھنے کے بعد پھر وہ دونوں اپنے رستے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ یکا یک پیچھے سے ایک شتر سوار اونٹ کو تیز دوڑاتا ہوا آیا۔ اونٹ کے پاؤں کی آواز مطلق نہ ہوتی تھی اور اب وہ قاسم اور ابن ریمند کے قریب سے اسی طرح دوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی پشت پر دبلا سوکھا درویشوں کی صورت کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں اس کی وحشت خیز تھیں اور بدرنگ پرانی عبا کے پھٹے ہوئے دامن ہوا میں پھٹ پھٹ کرتے ہوئے پیچھے کو اڑتے جاتے تھے۔ اس درویش کی صورت دیکھتے ہی قاسم کو سناٹا آ گیا۔

قاسم کو اب یہ تردد ہوا کہ ابن ریمند کے ساتھ برابر چلا جانا چاہیئے فقط رستہ بتا کر اور تھوڑی دور ساتھ چل کر اتابک کی فوج میں واپس چلا آنا مناسب ہوگا۔ اونٹ پر جو آدمی تیز جا رہا تھا۔ اسے قاسم نے خوب پہچان لیا تھا اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ خبیث شکار کی بو پا کر ادھر چلا ہے۔ تھور فریدا کی خیر نظر نہیں آتی۔ قاسم کو اس درویش سے نہایت ہی خوف اور کراہت معلوم ہوئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ ابن ریمند کے ساتھ جہاں سے وہ آیا تھا وہاں تک جانا چاہیے۔ گو اس میں امیر طرابلس کے ہاتھوں اپنی جان خطرے میں پڑتی تھی۔ اب چلتے چلتے

یہ دونوں اسی گاؤں میں پہنچے۔ جہاں انطاکیہ سے بھاگے ہوئے عیسائیوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی امیر طرابلس اور اس کے ہمراہی اور انطاکیہ کے بہت سے فراری جنوب کی طرف طرابلس کو روانہ ہو چکے تھے۔ ان دونوں نے بھی وہیں جانے کا قصد کیا اور تین دن اور تین رات برابر سفر کرتے رہے۔ راستہ سمندر کے کنارے کنارے تھا۔ قاسم سمندر کے آبی رنگ اور کناروں پر موج کے ٹکرانے سے سپید سپید جھاگوں کے پیدا ہونے کی کیفیت دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اسے بہت خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان سے تھورفریدا کے گورے گورے بازو اور آسمانی رنگ آنکھیں یاد آ جایا کرتی تھیں۔

غرض اب وہ طرابلس سے اتنے قریب پہنچ گئے۔ کہ شہر وہاں سے نظر آنے لگا۔ قاسم نے ابن ریمند سے یکا یک پوچھا ''کیا یہ سچ ہے کہ آپ تھورفریدا سے عقد کرنے والے ہیں؟''

ابن ریمند نے قاسم کی طرف بہت تعجب سے دیکھ کر کہا۔ ''آپ کو یہ کیونکر معلوم ہوا؟''

اب قاسم نے قصہ کہنا شروع کیا اور کہیں کہیں اپنی رائے بھی ظاہر کرتا گیا۔ کہنے لگا کہ ''یہ خبر میں نے یہاں سے ایک بہت دور کے شہر میں سنی تھی اور میں آپ کو چند اور باتیں بھی سناؤں گا۔ جس کی مجھے خاص طور پر اطلاع ملی ہے۔ بعض لوگ اس وقت ایسے موجود ہیں۔ جو آپ کی جان کے خواہاں ہیں اور تھورفریدا کو پھر چھین کر لے بھاگنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ان باتوں سے بہت خبردار رہنا چاہیے''۔

ابن ریمند بولا ''مگر تھورفریدا کو تو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں اس وقت ہے جو خطرہ اس کو تھا اب وہ دور ہو چکا ہے۔ یہ غریب تو ایک بڑے ہی ظالم فرقے کے ہاتھوں میں جنہیں حشیشی کہتے ہیں۔ گرفتار ہو گئی تھی۔ اس قید سے اس کا صحیح سلامت نکل آنا عجائبات سے ہے۔ مجھے ٹھیک حال نہیں معلوم کہ کس طرح وہ اس مصیبت سے آزاد ہوئی کیونکہ میرا باپ اس کا دشمن ہے۔ اتنا موقع نہیں دیتا کہ ہم بات کر سکیں لیکن مجھے اس کی خادمہ سے جو مسلمان عورت ہے۔ بات کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کوئی بڑا جوانمرد مسلمان شریف زادہ تھا۔ جس نے اسے قید سے نکالا اور قید سے نکلنے کے بعد وہ کس طرح اس مردود شہر سے جس کا نام آشیانہ عقاب مشہور ہے۔ یہاں آئی۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن بہت جی چاہتا ہے کہ اس مسلمان شریف زادے سے کہیں ملنا ہو اور مل کر اس کا شکریہ ادا کروں۔ گو وہ ہمارے مذہب کا آدمی نہیں ہے۔ کافر ہے۔ لیکن اس کا یہ کام ایسا ہی

ہے جیسے عیسائیوں کے کام نیکی اور بہادری کے ہوا کرتے ہیں''۔

قاسم نے کہا۔'' کچھ شبہ نہیں۔ کہ اس نوجوان کی پرورش کسی شریف گھر میں ہوئی ہے اور ایک شریف باپ نے اس کو اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت دلائی ہے۔ آپ فرنگی لوگ ہم مسلمانوں پر بہت منہ آیا کرتے ہیں۔ کہ ہم عورتوں کی عزت نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ مکروفریب اور ہوائے نفسانی کی پیروی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ خیر مگر آپ کو پورا قصہ نہیں معلوم۔ وہی لوگ جن کے پنجۂ غضب سے تھور فریدا چھوٹی ہے۔ اب پھر اس کو اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جب انطاکیہ سے کچھ دُور نکلنے کے بعد ہم ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ تو ایک شتر سوار نہایت تیزی سے ہمارے قریب ہی سے نکل کر اُدھر کو آتا نظر آیا تھا۔ یہی وہ آدمی ہے۔ جو تھور فریدا کو پھر گرفتار کر کے قید میں ڈالنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے اور یہی وہ شخص ہے۔ جو آپ کو اور اَور تمام مسیحی شہسواروں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے مطلق شبہ نہیں ہے۔ کہ اس وقت وہ طرابلس میں پہنچ چکا ہے''۔

ابن ریمند نے ہنس کر کہا۔'' کچھ اندیشے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تھور فریدا کے بچانے والے بہت ہیں۔ مگر اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ میرا باپ تو اب بھی اگر آپ کو دیکھ پائے گا۔ تو قتل کر ڈالے گا۔

قاسم نے کہا'' میں شہر میں رہوں گا اور جہاں تک ممکن ہوگا۔ آپ کے والد اور اُن عیسائیوں سے اپنے تئیں بچائے رکھوں گا اور اس موذی درویش کا پتا چلانے کی کوشش کروں گا اور اگر کہیں مل گیا۔ تو پھر............'' قاسم آگے کہنے کو تھا۔ کہ اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ لیکن فوراً یاد آیا۔ کہ حشیشیوں کی مدد کرنے کی قسم بھی تو مجھ سے لے لی گئی ہے۔ اس قسم کا پابند ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے۔ اس کا حال معلوم نہیں۔ بہرکیف پہلے ہی سے قسم توڑنے کی نیت کرنی درست نہیں۔

قصہ مختصر یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے شہر طرابلس کے دروازے میں داخل ہو کر جدا ہو گئے۔ ابن ریمند اپنے باپ کے قصر میں چلا گیا اور قاسم پوچھتا ہوا ایک ذلیل سی سرائے میں جا ٹھہرا۔ یہاں وہ کئی دن تک رہا۔ مگر اس درویش کا کچھ پتا نہ چلا۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں باہر کے لوگ اس کثرت سے شہر میں آئے ہوئے تھے۔ کہ تمام بازار لوگوں سے پٹے رہتے تھے۔ کبھی کسی امیر رئیس کی سواری نکلتی تھی۔ تو آدمیوں کو ہٹا کر مشکل سے راستہ نکالنا پڑتا تھا۔ جب

ہر وقت بھیڑ کی یہ کیفیت ہو۔ تو پھر اس میں کسی کو پہچاننا بہت دشوار تھا۔ بیت المقدس کا بادشاہ بھی یہ سن کر کہ انطاکیہ کی حالت خطرناک ہے۔ آج کل طرابلس میں آیا ہوا تھا۔ ایک دن قاسم نے اس کی سواری بازار میں نکلتے دیکھی۔ بالکل نو عمر لڑکا تھا۔ زرہ اور جوشن پہنے تھا۔ قبا پر ایک زربفت کی عبا تھی۔ صورت پر بادشاہوں کی شان برستی تھی۔ جلوس میں بڑے بڑے نامی شہسوار تھے اور ایک طرف اس کی ماں ملکہ ملیسندی گھوڑے پر سوار تھی، مشہور تھا۔ کہ سلطنت میں یہی عورت کل سپید و سیاہ کی مالک ہے اور سازشیں کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ ایک اور افواہ بھی قاسم کے کانوں تک پہنچی۔ وہ یہ تھی کہ امیر ریمند اور اس کی بیوی میں کچھ عرصہ سے سخت رنجش ہو گئی ہے۔ امیر کی بیوی ملکہ ملیسندی کی سگی بہن تھی۔ اس قسم کی خبریں تو قاسم کو ملتی رہیں۔ لیکن اس درویش کی کوئی خبر سننے میں نہ آتی تھی۔ اشارے بازیاں سرگوشیاں اور چپکے چپکے اِدھر اُدھر کی نقل و حرکت سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ حشیشیوں کے گماشتے اپنی کارگذاریوں میں خوب سرگرم ہیں۔

قاسم اسی حال میں کچھ زمانہ تک طرابلس میں رہا۔ عیسائیوں کی شان و شوکت اور شہر میں جو اچھا انتظام انہوں نے کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرت کیا کرتا تھا۔ گو خلیفہ بغداد کا سا جاہ و حشم نصیب نہ تھا اور نہ شہر میں بغداد جیسے سرسبز و شاداب میدان تھے اور نہ وہاں کے مقابلے میں یہاں کے برجوں اور میناروں میں وہ حُسنِ تعمیر تھا اور نہ طرح طرح کے شوخ رنگ جو آنکھوں کو بھلے معلوم ہوں۔ نظر آتے تھے۔ پھر بھی ایک مضبوطی اور ٹھوس پن ہر چیز میں موجود تھا۔ گو بدنمائی ضرور شامل تھی۔

اور اب اس دن کی صبح آتی ہے۔ جس میں خطروں کی انتہا نہ رہی اور جس نے قاسم کی زندگی کا رنگ ہی دوسرا کر دیا۔ آج قاسم لوگوں کے ہجوم میں اِدھر اُدھر پڑا پھرتا تھا۔ جو زرہ معمولاً پہنے رہتا تھا۔ آج بھی وہی پہنے تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی اس کو مسلمان خیال نہ کر سکتا تھا۔ رنگ بھی اس کا اتنا گورا تھا۔ کہ بہت سے افرنجی شہسواروں کا رنگ اس کے سامنے میلا معلوم ہوتا تھا۔ راستے میں جتنے لوگ گذرتے۔ ان پر ایک نظر اس امید سے ڈالتا۔ کہ شاید ان میں وہ درویش مل جائے۔ یا اس کا کچھ پتا چل سکے۔ افرنجی سرداروں کو دیکھتا۔ کہ تنگ سڑکوں پر گھوڑے دوڑائے لئے جاتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی بڑی بات عنقریب پیش آنے والی ہے۔ یہ بڑے قوی ہیکل چست و چالاک لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے لباسوں اور ہتھیاروں پر ایک سادگی اور ان کے بیرقوں پر جو نقش تھے ان میں ایک صفائی اور متانت پائی جاتی

تھی اسی اثنا میں ایک کنیسہ یعنی نصرانیوں کی عبادت گاہ کے پاس سے بھی قاسم کا گذر ہوا۔ یہ ایک لمبی بڑے بڑے پتھروں کی مضبوط عمارت تھی اور ایک چوپہل مینار بھی اس میں تھا۔ بڑا دروازہ اس عبادت گاہ کا کھلا ہوا تھا۔ مگر اندر ایک عجیب پُر آسیب تاریکی تھی۔ امیر ریمند کا قصر بڑا بلند اور مضبوط تھا۔ اس کے برجوں سے قہر و غضب ظاہر ہوتا تھا اور اس کی دیواروں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ سب کو مردود و ملعون قرار دے کر اپنے سامنے کسی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتیں۔ بہر کیف قلعہ کے مستحکم اور زبردست ہونے میں کلام نہ تھا۔ قاسم نے جس وقت اس قلعہ کی طرف دیکھا۔ تو سڑک پر جو بھیڑ لگی تھی۔ وہ یکا یک خاموش ہوگئی اور قصر کے بلند دروازے سے اب ایک جلوس نکلنا شروع ہوا۔ جلوس میں سب سے آگے امیر طرابلس تھا۔ اس کے دائیں طرف ملکہ ملیسندی جو "ملکہ زریں قدم" کے لقب سے مشہور تھی۔ گھوڑے پر سوار تھی۔ یہ نہایت حسین عورت تھی اور اس وقت کسی معاملے میں امیر سے گفتگو میں مصروف تھی۔ امیر کے بائیں طرف اس کی بیوی بھی گھوڑے پر سوار تھی۔ لیکن بالکل خاموش تھی۔ صورت زرد اور آنکھوں میں غصہ اور غرور بھرا تھا۔ ان سے پیچھے بڑے بڑے نصرانی سردار اور رئیس اور عالی خاندان بیگمات تھیں۔ ان ہی میں قاسم نے ابن ریمند کو دیکھا۔ صورت پژمردہ و پریشان تھی۔ نظریں نیچی کئے تھا۔ جلوس کے سب سے اخیر میں ایک پالکی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تھور فریدا گھوڑے پر سوار تھی۔ اس کے پیچھے بہت سی عورتیں تھیں۔ جن میں بعض منہ پر نقاب ڈالے تھیں۔

بھیڑ میں لوگ چپکے چپکے آپس میں کہتے تھے۔ کہ امیر طرابلس اپنی بیگم سے سخت ناراض ہو گیا ہے اور علانیہ کہہ دیا ہے۔ کہ اس بیگم نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہے اور دوسرے سے ناجائز تعلق پیدا کر لیا ہے۔ ملکہ زریں قدم نے درمیان ہو کہ بہن اور بہنوئی میں صفائی کرانی چاہی۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی اور اب یہ ملکہ اپنی بہن کو بیت المقدس لئے جاتی ہے۔ یہ جلوس جس وقت بڑی شان سے گذر رہا تھا۔ تو قاسم کے دل میں یکا یک تھور فریدا کی سلامتی کی طرف سے ایک خوف سا پیدا ہوا۔ چنانچہ جب جلوس پورا گذر گیا۔ تو وہ بھیڑ بھاڑ میں سے رستہ نکالتا ہوا جلوس کے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دور آگے ایک ایسا میدان آیا۔ جس میں میل سوا میل تک کوئی درخت نہ تھا۔ اس کے بعد البتہ کئی گھنے جھنڈ درختوں کے آتے تھے۔ تماشائی جو جلوس دیکھنے کو نکلے تھے۔ وہ ان درختوں تک آ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے اور بھیڑ اتنی چھٹی۔ کہ جلوس کے پیچھے قاسم تنہا رہ گیا۔ فوراً خیال ہوا۔ کہ سڑک کے کنارے جہاں بہت سے درخت

ہیں۔ وہاں ضرور کوئی خدشہ ہے۔ قدم بڑھا کر جلوس کے عقب میں جہاں تھور فریدا اور دوسری عورتیں تھیں۔ ان کے بالکل قریب آ گیا۔ مگر پیچھے ہی رہا۔ جلوس دفعتاً چلتے چلتے رُکا۔ قاسم جلدی سے عورتوں کی صفوں کے برابر آ گیا۔ یہاں یہ دیکھا کہ ایک عورت نے اپنے برقعے کی ٹوپی پر ایک سبز کپڑا باندھ رکھا ہے۔ اتنا دیکھا تھا۔ کہ جلوس کی صفوں میں کچھ بے ترتیبی سی ہوئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ امیر طرابلس ملکہ زریں قدم اور اپنی بیوی کو یہاں تک پہنچا کر مع اپنے سرداروں کے قصر کی طرف واپس جانے لگا۔ امیر کو واپس آتا دیکھ کر قاسم نے اپنے تئیں چھپانا چاہا۔ مگر عورتوں سے زیادہ دور ہو جانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ملکہ زریں قدم اور امیر کی بیوی کی حفاظت کے لئے تو بڑے بڑے فوجی سردار دونوں جانب موجود تھے۔ لیکن عقب میں جو عورتیں تھیں۔ ان کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ قاسم کا ارادہ تھا۔ کہ درختوں کے جھنڈوں تک تو ضرور ساتھ جائے۔ اس کے بعد ممکن ہے۔ کہ پھر بھی ساتھ ہی چلتا رہے۔ کیونکہ اسے تھور فریدا کی طرف سے بہت فکر تھا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کہ کیا کرے۔ اب امیر طرابلس اور اس کے ہمراہی قاسم کے بالکل قریب آ گئے۔ قاسم امیر کی نظر بچانے کو ایک طرف کو ہٹا۔ مگر امیر نے دیکھ لیا اور کڑک کر کہا "یہ اجنبی سوار کون ہے۔ جو ہماری عورتوں سے اتنا ملا ہوا چل رہا ہے؟" یہ کہہ کر امیر گھوڑا ڈپٹا کر قریب آیا اور قاسم کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ "آہا! یہ عیسائی نہیں ہے۔ یہ ہمارا بھاگا ہوا قیدی ہے۔ ہم نے اس کا اعتبار کر کے سختی سے کسی بات کا پابند نہیں کیا تھا۔ مگر اس نے ہماری رعایت کی قدر نہیں کی۔ اب معلوم ہوگا۔ کہ پابندی کسے کہتے ہیں۔ جب رسّی کا پھندا گلے میں ڈال کر فصیل پر سے لٹکنا پڑے گا۔ تو حقیقت کھل جائے گی۔ اس کو فوراً پکڑ لو اور ہمارے ساتھ ساتھ لاؤ"۔

قاسم گرفتار ہو گیا۔ ایک سوار نے دائیں اور ایک نے بائیں آ کر اُسے حراست میں لے لیا اور شہر کی طرف لے چلے۔ قاسم نے دیکھا کہ ریمند کالڑ کا باپ سے بہت ہی منت وسماجت کر رہا ہے۔ مگر باپ اس طرح سر ہلا دیتا ہے۔ کہ گویا اس کی بات منظور نہیں۔ قاسم کو اب اپنے مرنے میں کچھ شبہ نہیں رہا اور رنج اس کا ہوا کہ افسوس نہایت بے عزتی کی موت مرنا پڑے گا۔

لیکن بچو! تم یہ نہ سمجھنا۔ کہ تمہارے دادا قاسم کو اس شیطان امیر نے قلعہ کی فصیل سے پھانسی دے دی۔ جب قاسم قلعہ کی باہر والی فصیل کے اندر داخل ہو کر چوک میں آیا۔ تو سامنے قلعہ کا بڑا دروازہ دیکھا۔ اس کے دونوں جانب بڑے بڑے سنگین اور مستحکم برج تھے۔ ان کا

رنگ سیاہ تھا اور صورت سے ظلم وستم ٹپک رہا تھا۔ یہ برج باہر والی فصیل اور اس کے دمدموں سے کہیں زیادہ بلند اور مرتفع تھے۔ پیشانی کے کنگروں سے نیچے دروازے کا دہن موت کا منہ معلوم ہوتا تھا۔ سر کے اوپر صاف آسمان تھا اور دھوپ شہر پناہ کی اونچی دیواروں اور سواروں کی سپید قباؤں۔ سرخ صلیبوں اور سیاہ زرہوں پر تیز پڑ رہی تھی۔ قاسم نے جب اس دروازے کے اندر کی تاریکی کو جو قبر کا اندھیرا معلوم ہوتی تھی۔ دیکھا، تو باہر کی روشنی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔ باہر والی فصیل کے چوک میں آدمیوں کا بڑا اژدحام تھا۔ اس اژدحام کے آگے ایک آدمی تھا۔ جو بہت دُبلا سوکھا فقیر معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں اس کی خونخوار اور بال پریشان تھے۔ قاسم نے پہچان لیا۔ کہ یہ وہی بدذات ہے۔ جو بغداد میں اس کے باپ کے گھر میں گھسا تھا۔ جسے پہاڑ پر چڑھنے کی وہ رسّی ملی تھی اور جو اونٹ پر سوار اس کے اور ابن ریمند کے قریب سے تیزی کے ساتھ نکلا ہوا جا رہا تھا اور یہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ کہ یہ وہی آدمی ہے۔ جو ایک زرہ پوش فوجی افسر کی شکل میں انطاکیہ کے سامنے اپنے غول کو لا کر عیسائیوں کے قتل میں مصروف ہوا تھا اور ابن ریمند کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ قاسم اسے دیکھتے ہی چیخ اُٹھا اور چاہا۔ کہ اپنے تئیں چھڑا کر سب لوگوں کو اس سے خبردار کر دے۔ لیکن سواروں نے جن کی حراست میں تھا۔ اس کے بازو پکڑ لئے۔ اتنے میں وہ غول آدمیوں کا جو علیحدہ کھڑا تھا۔ کسی پر یک لخت دوڑا۔ خنجروں کی باڑھیں چمکیں اور یہ خنجر سرخ وسپید دستوں کے تھے۔ کسی نے امیر ریمند کی ٹانگ پکڑی اور اُسے گھوڑے کی پیٹھ سے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا۔ گرتے ہیں خنجروں کے وار اس پر ہونے لگے۔ اب لوگوں میں ابتری پڑ کر بے حد خوف پیدا ہوا۔ گھوڑے بدک بدک کر آدمیوں کو کچلنے لگے اور قیامت کا سا شور برپا ہو گیا۔

❀ ❀ ❀

سولھواں باب

شیطان ریمند یعنی امیر طرابلس کا اس طرح خاتمہ ہو گیا۔ مسیحی شہسواروں نے حشیشیوں کے غول پر جس نے اُن کے آقا کو ہلاک کیا تھا۔ حملہ کیا۔ اسے حملے میں دو نصرانی سوار اور کئی حشیشی مارے گئے۔ لیکن وہ فقیر یا درویش جو اس غول کا سرغنہ تھا اور جس نے امیر پر سب سے پہلے خنجر چلایا تھا۔ کسی طرح اس ہڑ بم میں ایسا غائب ہوا۔ کہ پھر کسی نے اُسے نہ دیکھا۔ اب عیسائیوں نے شہر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔ وجہ یہ تھی کہ حشیشیوں کے جرائم سے لوگوں پر بے حد خوف طاری رہتا تھا اور خوف سے بڑھ کر کوئی چیز ظلم کی تلوار پر باڑھ رکھ کر بے گناہوں کا خون بہانے والی نہیں ہوتی۔ قاسم بھی مارا جاتا۔ لیکن ابن ریمند نے اپنے ملازموں کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ اس کی حفاظت کرتے رہیں۔

اب نصرانی شہسوار شہر میں داخل ہوئے۔ کچھ لوگ جو پیدل تھے۔ ان کے کندھوں پر امیر کی لاش تھی۔ شہر کے بڑے گرجا پر آ کر یہ لوگ لاش کو گرجا میں لے گئے اور قربان گاہ کے سامنے اسے رکھ دیا۔ قربان گاہ کے اوپر صلیب نصب تھی۔ جس کی یہ نصرانی پرستش کرتے تھے۔ اب پادری آئے۔ انہوں نے امیر مقتول کے خود پر جو سونے کا حلقہ بطور تاج کے لگا تھا۔ اتار کر ابن ریمند کے سر پر رکھا اور پھر کچھ دعائیں پڑھ کر قربان گاہ کے پاس باپ کی لاش کے سامنے اونچی کرسی پر اُسے بٹھا دیا۔ قاسم بھی گرجا میں کھڑا یہ کل کیفیت دیکھ رہا تھا۔ ابن ریمند نے اپنے سرداروں کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ قاسم کو ہرگز اکیلا نہ چھوڑیں۔ جہاں کہیں جائیں۔ یہاں تک کہ گرجا میں بھی اُسے ساتھ رکھیں۔ کیونکہ باہر چھوڑنے میں اندیشہ تھا۔ کہ عیسائی اُسے مار ڈالیں گے۔ قاسم کے دل پر اس عبرتناک منظر کا جس میں ظلمت و نور دونوں کا اجتماع تھا۔ بہت اثر ہوا۔ گرجا کے دریچے چھوٹے تھے اور روشنی جس قدر اندر آتی تھی۔ وہ بہت کم تھی۔ دیواریں رنگیں تصویروں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور تصویریں اتنی بدرنگ ہو گئی تھیں۔ کہ وہ بھی دیوار ہی

معلوم ہوتی تھیں۔ بخور روشن تھے اور اُن کا ایک بادل چھت کے نیچے چھایا ہوا تھا اور اس بادل سے شمع دانوں کے شعلے نظر آتے تھے۔ دھندلی تصویروں پر کہیں کہیں سونا اور پادریوں کی مرصع صلیبوں اور لباس پر جواہرات چمکتے تھے۔ اب ایک ایک نصرانی سردار آگے بڑھتا اور نوجوان امیر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اطاعت کی قسم کھاتا تھا اور وہاں سے اُٹھ کر اسی طرح امیر مقتول کی لاش کو تعظیم دے کر لاش پر ہاتھ رکھتا اور قسم کھاتا۔ کہ حشیشیوں اور ایسے لوگوں سے جو صلیب پر ایمان نہیں رکھتے۔ سخت انتقام لیا جائے گا۔ یہ رسم بڑی شان سے ادا ہوتی رہی۔ ہر ایک سردار لاش پر حلف انتقام لیتا تھا اور پادری خدا کی تعریف میں گاتے تھے۔ لیکن خدا کے گھر سے باہر قتل عام بند نہیں کیا گیا تھا۔ زخمی اور جاں بلب مسلمانوں کی دردناک آہیں گرجا کے کھلے دروازے سے برابر آ رہی تھیں۔

جب یہ رسم ختم ہوئی۔ تو ابن ریمند سر پر سونے کا تاج رکھے ہوئے کرسی سے اُٹھا اور گرجا کے لمبے کمرے میں سے بڑی شان سے گذر کر دروازے کے باہر روشنی میں سیڑھیوں پر کھڑا ہوا۔ نیچے ہزارہا نصرانی جمع تھے اور جا بجا مسلمانوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ابن ریمند کے پیچھے نصرانی سرداروں کی صف تھی۔ جس وقت اس نوجوان امیر نے سیڑھیوں کے چبوترے پر قدم رکھا۔ فوراً تمام خلقت نے یک زبان ہو کر اس کو امیر مقتول کا جانشین تسلیم کیا۔ مبارکباد کے نعرے ابھی بند نہ ہوئے تھے۔ کہ دفعتاً لوگوں میں کچھ ہل چل سی پڑی اور ایک نصرانی بھیڑ میں سے بہ مشکل رستہ کرتا ہوا سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر خوف تھا۔ آتے ہی امیر کے قدموں میں گر پڑا اور رو کر کہا۔ کہ "اے امیر! اس وقت ایک سخت سانحہ گذرا ہے۔ جس وقت ملکہ زریں قدیم اور امیر کی بیوی قومس ریمند سے رخصت ہو کر درختوں کے جھنڈ سے جو سڑک کے کنارے تھا۔ آگے بڑھیں۔ تو چند خونخوار وحشی جو درختوں کی آڑ میں پہلے سے بیٹھے تھے۔ دفعتاً باہر نکلے اور جو مستورات ملکہ کے جلوس میں پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ ان پر حملہ کیا اور تھور فریدا کو اُٹھا کر لے بھاگے۔" مسلح نصرانی نے یہ قصہ ختم ہی کیا تھا۔ کہ یکایک زور زور سے رونے کی آواز آئی اور وہی پالکی جس کے ساتھ ساتھ شروع میں تھور فریدا گھوڑے پر سوار تھی۔ سامنے لا کر رکھ دی گئی اس میں سے ایک سپید سر پیرانہ سال ضعیفہ نکلی۔ جو سینہ پیٹ پیٹ کر برابر یہی کہے جاتی تھی۔ "ہائے میری بچی۔ ہائے میری بچی۔ وہ ظالم اُسے لے گئے۔ اب وہ کاہے کو چھوٹے گی۔ ہائے میری بچی۔ ہائے میری بچی"۔

ابن ریمند جواب تک شاہانہ پندار اور دبدبے سے گرجا کے دروازے پر کھڑا رعایا کی مبارک باد قبول کر رہا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی زرد پڑ گیا اور سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ فوراً سوار ہو کر اُس ضعیفہ کو ساتھ لئے قصر میں آیا۔ قاسم اور مسلح نصرانی جو خبر لایا تھا۔ ساتھ آئے یہاں جلدی سے سب نے مشورہ کیا۔ کہ کیا کرنا چاہئے۔ قاسم نے کہا۔ کہ اس میں تو کسی طرح شک ہی نہیں۔ کہ یہ کام حشیشیوں کا ہے۔ جس ہاتھ نے امیر ریمند پر خنجر چلایا تھا۔ اُسی نے یہ جرم بھی کیا ہے۔ کہ اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے تھور فریدا کو غائب کرا دیا۔ قاسم نے ابن ریمند سے کہا۔ کہ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔ کہ قلعہ اَلموت کی سمت صحرا کے رستے ان لوگوں کا تعاقب کیا جائے اور جو لوگ تعاقب کے لئے نکلیں۔ ان کے لئے ضروری ہے۔ کہ تعداد میں کم ہوں۔ کیونکہ رستے میں صحرا ایسا آئے گا۔ جہاں پانی بہت کم ملے گا اور جتنا ملے گا۔ صرف چند آدمیوں اور جانوروں کے لئے کافی ہو سکے گا۔

اس مشورے کے بعد ابن ریمند اور قاسم صرف تین ملازموں کو ساتھ لے کر فوراً روانہ ہو گئے۔ پانچوں آدمیوں کے لئے ایک ایک تیز رفتار اونٹ تھا۔ اس خیال سے کوئی پہچانے نہیں۔ قاسم اور ابن ریمند نے عربی لباس پہن لیا تھا۔ اس بات کا پورا یقین کر کے کہ حشیشیوں سے واسطہ پڑا ہے اور وہ اپنے قیدی کو لے کر قلعہ اَلموت کی بالکل سیدھ باندھے ہوئے جاتے ہوں گے۔ ان لوگوں نے بھی کم سے کم فاصلے کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ طرابلس سے نکل کر ولایت شام و جزیرہ کو طے کرتے ہوئے صوبہ جبال میں موصل کو بائیں ہاتھ اور بغداد کو دائیں ہاتھ چھوڑ کر صحرا صحرا سیدھے طبرستان کی سرحد کی طرف چلے۔ جہاں اَلموت کا قلعہ واقع تھا اور یہ امید کی کہ حشیشی الموت تک پہنچنے نہیں پائیں گے۔ کہ ان کو رستہ ہی میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ پانچوں آدمی تین دن تک برابر چلتے رہے، رستے میں کبھی ریگستان آئے۔ کبھی مرزوعہ زمینیں آئیں۔ مگر حشیشیوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تیسرے دن شام کو ایک گاؤں میں اُترے۔ جو ایک شاداب رقبے کے بالکل کنارے واقع تھا۔ اس سے آگے مشرق کی طرف میلوں تک ریگستان ہی ریگستان تھا۔ گاؤں والوں نے ان مسافروں سے کہا۔ کہ اس رستے میں چند روز تک تم کو سخت صعوبتیں اُٹھانی پڑیں گی۔ کیونکہ کنوئیں بہت کم ملیں گے اور جو ملیں گے۔ ان میں پانی کافی نہ ہو گا۔ اس راہ سے شاذ و نادر ہی کوئی مسافر جاتا ہے۔ بعض جگہ زمین کی یہ کیفیت ہے۔ کہ اس پر رستہ کا نشان تک نظر نہیں آتا۔

قاسم اور ابن ریمند اونٹوں سے اُتر کر گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں جا بیٹھے۔ یہ لوگ گاؤں کے کنوئیں کے پاس درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ درخت پھلوں کے تھے اور ان میں پانی دینے کے لئے کنوئیں پر لا دچل رہی تھی۔ جس وقت یہ بڑے بوڑھے راستے کے خطرے بیان کر رہے تھے۔ تو سب کی نگاہیں ریگستان پر تھیں۔ جو سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور ختم بھی وہاں ہوتا تھا۔ جہاں آسمان کے کنارے زمین سے مل گئے تھے اور ایک ہلکی سی تحریر شام کی سرخ روشنی کی ان کناروں کے گرد دوڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ مغرب میں کرۂ آفتاب اُفق کے نیچے غائب ہونے کو تھا۔ باتوں باتوں میں بہت بے اعتنائی کے ساتھ قاسم نے پوچھا، کہ ''آج کل میں بھی کوئی مسافر مشرق کی طرف اس رستہ گیا ہے؟''

گاؤں کے ایک بڑے بوڑھے نے کہا۔ ''ایک مدت سے تو کسی کو اس رستے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر کل رات کا ذکر ہے۔ کہ چار اونٹ یہاں آئے۔ بالکل تھکے ہارے۔ پیاس سے بُرا حال۔ چار آدمی ان پر سوار تھے۔ مگر جو شخص قافلہ سالار تھا۔ وہ عجیب چیز تھا۔ صورت فقیروں کی اور مزاج بادشاہوں کا رکھتا تھا۔ آتے ہی حکم دیا۔ کہ کھانا تیار کیا جائے اور سفر کے لئے توبروں میں جانوروں کے واسطے دانہ بھر دیا جائے۔ اس کی خونخوار نظر اور سخت آواز سے ہم ایسے ڈرے کہ جو کچھ اس نے مانگا حاضر کر دیا اس پر کہنے لگا۔ کہ اچھا ہم ان چیزوں کے دام کل دے دیں گے۔ لیکن ابھی رات بہت باقی تھی۔ کہ ہم نے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز پہلے تیز سنی اور پھر وہ ہلکی ہوتے ہوتے بالکل نہ سنائی دی۔ ہم سمجھ گئے۔ کہ رات والے مسافر چلتے بنے۔ داموں کا غم ہمیں بالکل نہ ہوا۔ ان کے جانے کو غنیمت جانا۔ کیونکہ اس درویش کی صورت اور آنکھوں سے ہمیں خوف معلوم ہوتا تھا''۔

قاسم یہ قصہ سُن کر ایسا بیتاب ہوا۔ کہ اپنی حالت کو چھپا نہ سکا اور گھبرا کہ پوچھا۔ کہ ''درویش کے ساتھ اور کون تھا؟''

گاؤں کے اسی بڈھے نے کہا۔ ''ایک تو نوکر معلوم ہوتا تھا اور دو عورتیں تھیں۔ جو منہ پر نقاب ڈالے تھیں۔ ہم سمجھے کہ اس درویش کی بیویاں ہوں گی۔ مگر پھر خیال ہوا۔ کہ اگر حقیقت میں وہ درویش ہے۔ تو درویش کو بیویوں سے کیا کام۔ کسی نہ کہا۔ کہ حسینوں کی زلفیں ہوشمندوں کے حق میں زنجیر پا اور عاقلوں کے حق میں دام بلا ہوا کرتی ہیں۔ جو لوگ درویشی اختیار کرتے ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ کر رضا الٰہی اور توکل کا جامہ پہن لیتے ہیں''۔

اس پر گاؤں کا ایک اور پڑھا بولا۔ ''ہاں، کسی نے یہ بھی تو کہا ہے۔ کہ ہوشیار آدمی غریب کو تو روپیہ یونہی اُدھار دے دیتا ہے۔ لیکن جب خود ضرورت ہوتی ہے۔ تو کسی دولت مند سے روپیہ قرض لیتا ہے۔ مگر اس کا اطمینان پہلے سے کر لیتا ہے۔ کہ اُس دولت مند سے پھر کبھی ملنا نہ ہوگا۔ مگر اس درویش نے معاملہ برعکس کر دیا۔ یعنی ہم غریب تھے۔ چاہئے تھا۔ کہ ہمیں کچھ قرض دے جاتا۔ مگر وہ اس بات کا اطمینان کر کے کہ پھر ہم سے ملنا نہ ہوگا۔ اُلٹا ہم سے قرض لے کر بھاگا''۔

قاسم جلدی سے اُٹھا اور جو چیزیں ان گاؤں والوں سے مول لی تھیں۔ ان کے دام فوراً ادا کر دیئے۔ نوکروں نے مشکیزوں میں پانی بھر لیا اور اب یہ پانچوں مسافر رات شروع ہوتے ہی اونٹوں پر سوار ہو ریگستان میں سفر کرنے لگے۔ یہ سفر شبانہ روز جاری رہا۔ دوپہر کو کچھ آرام کرنے اور شام کو کھانا کھانے کے لئے قیام کرتے تھے۔ اس کے سوا کہیں دم نہ لیتے تھے۔ مگر نظر زمین کی طرف رکھتے تھے۔ کہ شاید جو چار اونٹ آگے گئے ہیں۔ ان کے پاؤں کے نقش دکھائی دے جائیں۔ لیکن دن بھر کی گرم ہوا ریت کو اُڑا کر صحرا کے دامن پر اس طرح پھیلاتی تھی۔ جیسے کسی میدان میں غازیوں کی لہراتی صفیں ہوں۔ نام کو تو یہ غازی ریت کے ذرّے تھے۔ نہایت حقیر و نحیف مگر ہمت کے ایسے پکے تھے۔ کہ کسی کے رُو کے رُکنا نہ جانتے تھے۔ قرنوں کے مرے ہوئے اونٹوں اور مسافروں کی لاشوں پر اپنی ڈھیریاں چُن کر ان غریبوں کا کوئی نشان سوائے چند چھوٹے چھوٹے تودوں کے باقی نہ چھوڑا تھا۔

آخر کار قاسم اور اس کے ہمراہی اس لق و دق صحرا کو طے کر کے ایک بار پھر ایسے ملک میں آگئے۔ جہاں پانی اور انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں نظر آتی تھیں۔ لیکن تین اونٹ بالکل بیکار ہو چکے تھے اور نوکروں کا یہ حال تھا۔ کہ سفر کی تکلیفوں سے روئے دیتے تھے۔ قاسم اور ابن ریمند نے اس خوف سے کہ آئندہ یہ لوگ تاخیر کا موجب ہوں گے۔ ان کو ایسے گاؤں میں چھوڑ دیا۔ جہاں پانی بکثرت تھا اور آدمی بھی مہربان اور متواضع تھے۔ یہاں آ کر سنا۔ کہ چار اونٹ جن میں ایک پر ایک درویش اور ایک پر اس کا ملازم اور دو پر دو عورتیں سوار تھیں۔ بارہ گھنٹے پہلے اس گاؤں سے روانہ ہو چکے ہیں، قاسم کو اس خبر سے یہ امید بندھی۔ کہ اب بڑھ کر ان کو رستے ہی میں پکڑ لیا جائے گا۔ لیکن راہ میں اب ریگستان نہ تھا۔ آباد زمینیں اور کھیتیاں تھیں اور یہ بھی دریافت ہوا تھا۔ کہ درویش نے چار تازہ دم اونٹ لے کر سفر شروع کیا ہے۔ اس وجہ سے

اس میں اور قاسم میں فاصلہ اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اب ان دونوں جوان مسافروں کو فرات اور دجلے کے مشہور دریا عبور کرنے پڑے۔ قاسم جس وقت دجلہ کے کنارے پہنچا۔ تو باپ اور بہن کے حق میں دعا کی اور دریا کو بھی دعائیں دے کر کہا۔ کہ "جدھر تُو بہ کر جاتا ہے۔ اُدھر ہی بغداد میں تیرے کنارے ایک محل اور باغ آئے گا۔ جب وہاں پہنچے۔ تو پہلے میرے باپ کو اور پھر میری بہن کو میرا اسلام کہنا اور پھر میری دعائیں اور بہن خجستہ کو چوگان میں ترقی کی مبارک باد پہنچا دینا"۔ مگر دل یہی کہتا تھا کہ خدا جانے ان پیاروں کی صورت پھر دیکھنی نصیب بھی ہوگی یا نہیں۔

جب اس شاداب ملک کو طے کر چکے۔ تو نیچی نیچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ملا۔ اس پر چڑھ کر صحرا کی طرف دیکھا۔ جس میں سے اب گذرنا تھا۔ منزل ایسی سخت طے کر چکے تھے۔ کہ وہ خود اور ان کے اونٹ تھک کر بے دم ہو گئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اونٹوں سے اُترے۔ کھانا جو کچھ ساتھ تھا۔ وہ کھایا اور پھر پہاڑی سے اُتر کر ایسے صحرا میں چلنے لگے۔ جس میں رستے کی لیکھ بھی بہ مشکل نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاند نکلا۔ آدھی رات کو چاندنی میں سپید ریت پر کوئی سیاہ چیز نظر آئی اور بلبلانے کی آواز سنی۔ قریب گئے۔ تو معلوم ہوا کہ ایک اونٹ حالت نزع میں ریت پر پڑا ہے۔ تھکن اور پیاس سے مرنے میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ اس کے پاس ہی ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔ جس کے سینہ میں ایک بڑا زخم ہے۔ قاسم نے اس مُردے کی پیٹی ٹٹولی۔ تو اس میں ایک خنجر تھا۔ قبضہ سپید اور سرخ تھا۔ جو فدائیوں کا مخصوص رنگ ہے۔ یہ تو آپ کو یاد ہوگا۔ کہ قاسم کے پاس دو خنجر ایسے ہی اور تھے۔ ان میں سے ایک وہ ابن ریمند کو دے چکا تھا اور ابن ریمند کے پاس وہ اب تک موجود تھا۔ قاسم کے پاس اب پھر دو خنجر ہو گئے۔ اونٹ کے بچنے کی مطلق امید نہ تھی۔ قاسم نے رحم کھا کر تکلیف سے نجات دینے کے لئے اس کو ذبح کر دیا اور درویش کو اس کے ظلموں پر لعنت ملامت کرتے ہوئے یہ دونوں نوجوان مسافر پھر منزل طے کرنے لگے۔

اور اب ان دونوں نے کہیں دم نہیں لیا۔ حتٰے کہ آسمان پر جوزا نے اپنی حمائل اُتار کر آغوشِ سحر میں رکھ دی۔ مگر یہ خدا کے بندے اسی طرح صحرا نورد رہے۔ چلتے چلتے دوپہر ہو گئی اور اس بڑی چٹان کے قریب پہنچے۔ جہاں شروع کے سفر میں قاسم کی ملاقات بہرام قندھاری سے ہوئی تھی۔ اس چٹان سے جو تھوڑا سا سایہ زمین پر پڑتا تھا۔ اس میں یہ دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ سوکھی کھجوریں اور خشک مچھلی نکال کر کھائی۔ چمکتی ریت کے سوا چاروں طرف اور کچھ نہ تھا۔ کسی

جاندار کی علامت مطلق نظر نہ آئی۔ لیکن جونہی کچھ دیر آرام کرنے کو لیٹے۔ کسی پرندے کے پروں کی پھٹ پھٹ سنائی دی۔ اُٹھ کر دیکھا۔ تو ایک نیلے رنگ کا کبوتر اُڑتے اُڑتے زمین پر آن بیٹھا ہے۔ سایہ ڈھونڈتا ہے اور اس صحرائے بے آب پر تیز دھوپ میں اُڑتے اُڑتے ایسا پریشان ہے۔ کہ آدمیوں کا بھی ڈر نہیں رہا ہے۔ سایہ میں ان کے پاس چلا آیا۔ قاسم نے تھوڑا سا پانی چلّو میں لے کر اس کے سامنے کیا۔ تو وہ بے تکلف ایک ایک بوند کر کے پینے لگا اور جو دانہ انہوں نے ڈالا۔ اسے بھی کھانے لگا۔ اتنے میں قاسم نے دیکھا۔ کہ اس کے پروں میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہے۔ جب کبوتر پھر قاسم کے ہاتھ سے پانی پینے لگا۔ تو قاسم نے دوسرا ہاتھ چپکے چپکے بڑھا جھٹ اُس کو پکڑ لیا۔ اب جو دیکھا تو معلوم ہوا۔ کہ کبوتر کی کمر میں کپڑے کی ایک دھجی بندھی ہے۔ قاسم نے فوراً اس دھجی کو الگ کر لیا اور اس کی تہ اُلٹ کر دیکھی۔ تو اس پر عربی کے اشعار میں لکھا تھا۔ ''موت نے شیطان کو جہنم میں پہنچا دیا۔ لیکن شیطان کا بیٹا ابھی جیتا ہے اور اپنے باپ کے تخت پر جلوس کرتا ہے۔ اس کی رعایا نے ایک کافر کی لاش پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے۔ اس لئے اب ان کا ہاتھ مومنین پر اور بھی سخت ہو گیا ہے''۔ قاسم نے یہ مضمون ابن ریمند کو یونانی زبان میں ترجمہ کر کے جہاں تک ممکن ہوا سمجھایا۔ ابن ریمند نے مسکرا کر کہا۔ کہ'' شیطان کا بیٹا غالباً میں ہوں۔ لیکن باقی مضمون کا کیا مطلب ہوا''۔

قاسم نے کہا۔ ''عیسائی شہسواروں نے آپ کے باپ کے جنازے پر اس بات کی قسم کھائی ہے۔ کہ وہ اس قتل کا بدلہ ضرور لیں گے۔ یہ تحریر اس وقت ہمیں خوب مل گئی۔ اس کے لکھنے والے طرابلس کے حشیشی معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قتل ہونے سے بچ کر دو چار شہر میں یا شہر کے باہر کہیں چھپے ہیں اور وہیں سے الموت میں یہ خبر پہنچانی چاہتے ہیں''۔

اتنا کہہ کر قاسم چُپ ہوا اور تھوڑی دیر بعد دفعتاً کچھ یاد کر کے بولا۔ ''اچھا، اب سمجھ میں آیا۔ موت سے مُراد وہی فقیر ہے۔ وہی تو انطاکیہ کے سامنے حشیشیوں کا سردار بنا لوگوں کو قتل کرتا پھرتا تھا اور اسی کو تو مُردوں کے ڈھیر میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ لاش ملی تھی۔ جس کے ہاتھ میں تمہاری سپر میں نے اٹکا دی تھی۔ وہی ناپاک سپر جس میں خنزیر کا سر بنا تھا۔ بس ثابت ہوا۔ کہ اس فقیر کو اب تک یہی یقین ہے۔ کہ تم مر چکے ہو۔ مگر حشیشی اس تحریر سے اسے مطلع کرنا چاہتے ہیں۔ کہ نہیں ابھی تم زندہ ہو اور تمہارا قتل کیا جانا باقی ہے۔ یہ بڑی خوش قسمتی ہے۔ کہ یہ تحریر اس فقیر تک پہنچنے سے پہلے ہمارے ہاتھ لگ گئی۔ اب بہت ہی ہوشیار رہنا چاہئے۔ اور

اس بھولے بھالے مشتِ پر قاصد کو بھی کچھ دنوں اپنا مہمان رکھنا ہوگا"۔

قاسم نے کبوتر کو اپنی عبا کی جیب میں جو خوب بڑی تھی۔ رکھ لیا۔ وہ پھڑ پھڑایا تک نہیں۔ زیادہ احتیاط یہ کی۔ کہ ڈورے کا ایک سرا اس کی ٹانگ میں باندھ کر دوسرا سرا اپنی پٹی میں باندھ لیا اور یہ لوگ اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر پھر چل پڑے۔ چلتے چلتے رات ہو گئی۔ ایک جگہ تھوڑی دیر ٹھہرے اور پھر چلنا شروع کیا۔ مگر اب ان کی رفتار تیز نہ تھی۔ کیونکہ اونٹ بالکل تھک گئے تھے۔ جب صحرا میں ریگ کی موجوں پر صبح کی روشنی پھیلی تو قاسم کو خیال ہوا۔ کہ اب وہ پہاڑ نظر آنے لگیں گے۔ جن میں اَلموت کا شہر آباد ہے۔ لیکن آج کل گرمی کا موسم پورے زور پر تھا اور ہر طرف یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ غبار نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ تھوڑی دُور کے بعد کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اب ان دونوں مسافروں کو قطعی مایوسی ہو گئی اور یقین ہو گیا۔ کہ تھور فرید ااب تک اَلموت کے شہر میں بالکل قریب پہنچ گئی ہو گی۔ یا ممکن ہے۔ کہ اَلموت میں داخل ہو گئی ہو۔ اس خیال سے کہ خدا جانے اس بے گناہ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ قاسم سر سے پاؤں تک لرز اُٹھا۔ دونوں بالکل چپ ہو گئے۔ تھکے ہوئے اونٹوں کو تیز کرنا چاہا۔ گو جانتے تھے۔ کہ اخیر میں تمام آرزوئیں خاک میں ملنے والی ہیں۔

غرض گرم ہوا شروع ہونے سے پہلے صبح کی خنکی اور خاموشی میں وہ تیز چلتے رہے۔ دونوں گم سم تھے اور ریت پر اونٹوں کے قدموں کی آواز بھی مطلق سنائی دیتی تھی۔ کہ اتنے میں قاسم نے یکا یک اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ سامنے کے رُخ سے اس کے کان میں کسی چیز کی آواز آئی تھی۔ ابن ریمند سے کہنے لگا۔ "سنو یہ اونٹ کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔ اب جو کچھ بھی ہو۔ چاہے ہمارے اونٹ مریں یا جئیں۔ اُن تک پہنچنا ضروری ہے"۔

دونوں مسافروں نے اپنے اونٹ نہایت تیز بھگانے شروع کئے۔ حتیٰ کہ غبار میں ان کو چند صورتیں بھاگتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ جب اور قریب پہنچے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ آگے تین اونٹ ہیں اور ان پر تین ہی آدمی سوار ہیں۔ ان دونوں نے اپنے اونٹ تیز کر کے چاہا۔ کہ ان کو پکڑ لیں۔ لیکن آگے جانے والے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کے سوار نے جو باقی دو سے آگے تھا۔ مُڑ کر دیکھا اور دیکھتے ہی وہ بے اختیار کچھ چلایا۔ پھر تو اس بلا کی دَوڑ ہوئی ہے۔ کہ خدا کی پناہ! تعاقب کرنے والے اس کوشش میں تھے۔ کہ آگے والوں کو جا پکڑیں۔ مگر بیچ کا فاصلہ کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی اتنے قریب آ گئے۔ کہ قاسم نے تینوں صورتوں میں سے ایک کو

پہچان لیا۔ کہ وہی فقیر یا درویش ہے۔ اس کا اونٹ دونوں اونٹوں کے بیچ میں تھا اور ادھر اُدھر کے اونٹوں کی مہار خود اس کے ہاتھ میں تھی۔ کبھی کبھی مڑ کر دیکھتا تھا۔ اتنے میں مکیار گی اس نے ایک اونٹ کی مہار کے چھوڑتے ہی وہ اونٹ بجائے سامنے جانے کے تر چھے رُخ بھگا، قاسم یہ دیکھتے ہی چلایا۔ ''دیکھو اس میں ضرور بدمعاشی ہے۔ ممکن ہے کہ جو اونٹ علیحدہ ہو کر بھاگا ہے۔ اس پر تھور فریدا ہو۔ ابن ریمند تم اس اونٹ کو پکڑنے دوڑو۔ میں باقی دو کے پیچھے جاتا ہوں''۔ قاسم اپنے اونٹ کو برابر بھگاتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے سامنے دور ایک دیوار سی نظر آئی۔ یہ پہاڑ تھے۔ جو نزدیک آ گئے تھے۔ اونٹ کے پاؤں بجائے ریت پر پڑنے کے اب پتھروں اور کنکروں پر پڑتے تھے۔ قاسم کا اونٹ بالکل ہار چکا تھا۔ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ قاسم بھی اس کے ساتھ نیچے آ رہا اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ درویش اور اس کے ساتھ جو کوئی بھی تھا۔ دونوں پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔

قاسم دیر تک بیہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا۔ تو دیکھا۔ دو آدمی جھکے ہوئے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہے ہیں۔ ان میں ایک ریمند ہے اور دوسری کوئی صورت منہ پر نقاب ڈالے ہے۔ قاسم نے آنکھیں کھولتے ہی ابن ریمند سے پوچھا ''تھور فریدا تم کو مل گئی''۔ اتنا سُن کر اس صورت نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔ دیکھا تو پری تھی۔

ابن ریمند نے نہایت مضطرب ہو کر پوچھا۔ ''تھور فریدا کہاں ہے؟'' قاسم نے کہا۔ ''میرا اونٹ دوڑتے دوڑتے گر پڑا اور جن لوگوں کے پیچھے میں جا رہا تھا۔ وہ پہاڑوں میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ اتنا کہہ کر قاسم نے پری سے پوچھا۔ کہ تم اصلی حال بتاؤ کہ یہ ہوا کیا''۔ پری زمین پر بیٹھ گئی اور منہ پر ہاتھ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ ہاتھ اس کے تھر تھر کانپتے تھے۔ ابن ریمند کی طرف دیکھ کر قاسم سے پوچھنے لگی۔ امیر ''طرابلس کے بیٹے یہی ہیں؟'' جب قاسم نے جواب دیا۔ کہ ہاں۔ تو وہ اور بھی زیادہ روئی اور کہنے لگی۔ کہ ''ہائے۔ میں نے اس کے ساتھ دغا کی۔ جس پر ہمیشہ جان کھوتی تھی اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ جوان امیر تو اس کے ساتھ شادی کر ہی لیتا۔ پھر مجھے کاہے کا...... مگر اب......'' اتنا کہہ پھر رونا شروع کیا۔ قاسم اور ابن ریمند پری کو حیرت سے دیکھتے تھے۔ مگر اس کی باتوں کا مطلب کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن بچو! تمہارے دادا قاسم کو اس پری سے بہشت میں ملنا اور پھر انطاکیہ کی فتح کے بعد جب گاؤں میں قیام تھا۔ اُس وقت کی ملاقات اور سب باتیں یاد تھیں۔ ان باتوں کا خیال آتے ہی قاسم پر سارا بھید کھل

گیا اور پری پر اس کو رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔ لیکن غصہ بڑھتا گیا اور کہنے لگا۔ کہ ''اس بد بخت عورت نے نمک حرامی کی ہے۔ درآنحالیکہ جس کا نمک کھاتی تھی۔ اس پر جان صدقے کرتی تھی۔ خدا غارت کرے اس کو۔ اس کے دل میں رشک پیدا ہوا۔ جس نے امرت سے اُس کو زہر بنا دیا اور اب زہریلے سانپ کی طرح اس کا سر کچل ڈالنا چاہئے''۔ قاسم کو اتنی بات کہتے کہتے ایسا غصہ چڑھا۔ کہ خنجر نکال کر چاہتا تھا۔ کہ اس کی طرف بڑھے۔ لیکن ابن ریمند نے جو اب تک اس معمے کو کچھ نہ سمجھا تھا۔ قاسم کو روک دیا۔ جب قاسم نے اُسے پوری بات سمجھائی۔ تو پھر اُسے بھی پری پر غصہ آیا۔ مگر یہ گوارا نہ کیا۔ کہ ایک تنہا عورت پر جس کا کوئی بچانے والا نہ تھا۔ ہاتھ اٹھاتا۔ رنج اور شرمندگی نے پری کی ایسی بُری حالت کر دی تھی۔ کہ وہ خود بار بار کہتی تھی۔ کہ ہاں مجھے مار ڈالو۔ قاسم نے یہ خیال کر کے کہ ابھی اس بدخواہ عورت کی سزا کا وقت نہیں آیا ہے۔ خنجر پھر کمر میں رکھ لیا اور بے حد طیش میں بولا۔ ''جب دل میں دغا ہوتی ہے۔ تو صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ جس حسن پر ناز تھا۔ وہ ایسا ہو گیا ہے۔ جیسے قبرستان میں پھولوں کا چمن کہ پھول کھلتے رہتے ہیں۔ لیکن لوگ ان کو قبرستان کا ایک ظاہری لباس سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں۔ کہ اندر سوائے مُردوں اور مُردوں کی ہڈیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کوئی ان پھولوں کی طرف نظر بھی نہیں اُٹھاتا''۔

پری یہ سن کر پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ ابن ریمند نے بہت بے صبر ہو کر کہا۔ ''اب جو کچھ ہوا سو ہوا۔ حشیشیوں کے اس شہر میں جانا ضرور ہے۔ اگر تھور فریدا کی جان نہ بچا سکا اور وہ مر گئی۔ تو میں اور وہ دونوں مر کر اس قِصہ کو تو ختم کر دیں گے''۔

قاسم کو بھی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ دل غم میں ڈوب گیا تھا۔ خوش دلی اس طرح رخصت ہوئی تھی۔ جیسے آگ بجھ کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتی ہے۔ قاسم نے پری سے کہا۔ ''تم بھی شہر میں ساتھ رہو''۔ قاسم کا اونٹ مر چکا تھا۔ اس لئے وہ پری کے اونٹ پر سوار ہوا اور پری کو پیچھے بٹھا لیا اور اب وہ پہاڑوں میں داخل ہوئے۔ اس حال میں بھی بہت دیر تک پری سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ جب رونا بند ہوا۔ تو قاسم سے کہنے لگی۔ ''اگر دل کی برائی نے صورت کا حسن غارت کر دیا ہے۔ تو کیا دل کی اصلاح ہونے پر بھی وہ حُسن واپس نہ آئے گا۔ سنو! میں نے جو کچھ کیا۔ تمہارے کارن کیا۔ اس لئے کیا۔ کہ تم تھور فریدا کو بھول جاؤ گے اور اس نوجوان امیر سے وہ بیاہ کر لے گی، اگر میں یہ جانتی ہوتی۔ کہ وہ موذی فقیر امیر طرابلس کو

جان سے مارنے کی فکر میں ہے۔تو میں کبھی اس کے دم میں نہ آتی اور کبھی یقین نہ کرتی۔کہ وہ تھور فریدا پر کوئی عمل ایسا کرے گا۔کہ تمہارے دل سے وہ نکل جائے گی۔مگر اب سمجھ میں آیا۔ کہ شروع ہی سے اس بے ایمان کی نیت تھی۔کہ تھور فریدا کو گرفتار کرلے اور انطا کیہ والے معرکے میں امیر طرابلس کے لڑکے کو قتل کر ڈالے۔لیکن اس بے ایمان نے جو جو باتیں آگے کو سوچ رکھی ہیں۔اگر پری نام ہے۔تو ایک کو بھی نہ چلنے دوں گی اور تھور فریدا کو جان کی سلامتی میں پھر رہائی دلواؤں گی۔میں بھی اپنا خون پانی ایک کردوں گی۔مجال ہے۔کہ اس بے ایمان کی ایک چال بھی چل سکے۔اگر اب کے تھور فریدا کی جان بچالی۔تو چین سے مروں گی۔اس کا حسن اور اس کی ہمت اتنی ہے۔کہ سب اس پر جان صدقے کرنے لگتے ہیں۔اس مردود وزیر موت کا دل بھی تو اس پر آ گیا ہے۔تھور فریدا کو جب گرفتار کرنے لگا۔تو اس کی صورت دیکھ لی۔صورت دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور یہ ارادہ کیا۔کہ اسے اَلموت کو لے ہی نہ جائے۔کیونکہ وہاں لے گیا۔تو شیخ کی حرم میں داخل کردی جائے گی۔اس لئے بہتر یہ ہے۔کہ اسے ایسی جگہ لے جائے۔جہاں شیخ الجبل کا کوئی اختیار ہی نہ ہو اور نہ اس کا ہاتھ اس فقیر تک پہنچ سکے اور نہ تھور فریدا تک۔لیکن میں ڈری کہ اس طرح تو تھور فریدا کی زندگی بالکل ہی درگور ہو جائے گی۔ میں نے اس درویش کو سمجھایا کہ دنیا میں کوئی جگہ ان حشیشیوں کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔تم اسے کہیں اور نہ لے جاؤ۔شیخ کی تم نے بڑی بڑی خدمتیں کی ہیں۔وہ تم سے جب پوچھے۔کہ کیا انعام مانگتے ہو۔تو تم تھور فریدا کو مانگ لینا۔وہ ضرور تمہیں مل جائے گی۔

قاسم پری کی باتیں سنتا رہا اور اب شیخ الجبل کی سازشوں کو توڑنے کے لئے قاسم اور ابن ریمند بہت سی تدبیریں سوچ کر آپس میں بحث کرنے لگے۔مگر کوئی امید کامیابی کی نظر نہ آتی تھی۔ کیونکہ حالات بہت مشکل پیدا ہو گئے تھے۔صرف ایک بات ایسی تھی۔جس پر انہوں نے اتفاق کر لیا اور قاسم نے ابن ریمند سے کہا۔کہ ”سلامتی اسی میں ہے۔کہ آپ گونگے بن جائیں اور میں یہی کہونگا کہ ولایت شام کی فدائی جو الموت اور لبنان کے قلعوں میں اکثر آمدورفت رکھتے ہیں۔ انہی میں سے ایک آپ بھی ہیں اور آپ نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے“۔

اس طرح یہ تینوں اَلموت کے میدان میں آئے اور شہر کے دروازے کے قریب پہنچے۔تو اسی آدمی سے پھر ملاقات ہوئی۔جو قاسم کو پہلی مرتبہ شہر میں داخلہ کے وقت ملا تھا۔قاسم کو ٹوک کر کہنے لگا۔کہ ”قلعہ اَلموت کے سات برج ہیں“۔قاسم نے مقررہ جواب دے کر خنجر کا دستہ

دکھایا اور ابن ریمند کی نسبت کہا۔ کہ یہ فدائی ملک شام کے ہیں اور وہاں کے داعی الکبیر کے پاس سے کچھ کاغذات شیخ الجبل کی خدمت میں لائے ہیں۔ انہوں نے حسب دستور بات نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس پر ابن ریمند نے بھی اپنا خنجر دکھایا۔ قاسم نے اس آدمی سے پوچھا۔ ''کہیئے کوئی نئی خبر تو سنایئے''۔ وہ آدمی کہنے لگا۔ ''آپ وہی فداء ہیں نا جو کسی خاص خدمت کے لئے فلسطین بھیجے گئے تھے''۔ قاسم نے کہا ''جی ہاں اور وہ خدمت بخیر و خوبی انجام پا گئی''۔ اس پر وہ بولا۔ ''آپ خبر اچھی لائے ہیں۔ وہ شیطان امیر طرابلس بھی قتل ہوا اور اس کا بیٹا بھی اب زندہ نہیں ہے۔ مگر کچھ آپ ہی خوش خبری نہیں لائے ہیں۔ ابھی بھی وزیر موت بھی کہیں سے واپس آیا ہے اور شہر میں آتے ہی سیدھا قلعہ کو چلا گیا ہے۔ یہ بھی شیخ کا بڑا وفادار اور جان نثار ملازم ہے۔ کبھی خالی ہاتھ آنا جانتا ہی نہیں۔ اب کے ایک برقعہ والی ساتھ ہے''۔

یہ باتیں کر کے قاسم اور ابن ریمند شہر میں داخل ہوئے۔

❀ ❀ ❀

سترھواں باب

قاسم۔ابن ریمند اور پری شہر الموت میں داخل ہوئے۔مگر سمجھ میں کسی کے نہ آتا تھا۔کہ کیا کرے اور جو کچھ کرنا تھا۔اس میں دیر نہ ہونی چاہئے تھی۔کیونکہ خیال یہ تھا۔کہ تھور فریدا اب زندگی سے قطعی مایوس ہوگئی ہوگی اور اس حالت میں معلوم نہیں۔کب خودکشی کرلے۔غرض یہ وقت جان پر کھیل جانے کا تھا۔سرائے میں آئے۔وہاں دونوں اونٹوں کو چھوڑا اور ایک آدمی ان کی خدمت پر مقرر کر کے قاسم اور ابن ریمند شیخ الجبل کے قلعے کی طرف چلے۔وہاں جانے کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی۔قاسم نے یہ سوچ رکھا تھا۔کہ جس وقت کہوں گا۔کہ شیخ الجبل کا ایک حکم بجالا کر واپس آیا ہوں۔تو قلعے میں داخلہ کی اجازت مل جائے گی۔مگر جب قلعے کے دروازے میں پہنچنے کے لیے بلندی پر چڑھنے لگے۔تو دروازے سے ایک آدمی نکلا اور نکل کر جس پہاڑ پر قلعہ واقع تھا۔اس کے بائیں ہاتھ کے رستے پر جانے لگا۔قاسم نے اُسے فوراً پہچان لیا۔کیونکہ وہ کوئی اور نہ تھا۔شاعر باکمال اور مطرب بے مثال بہرام قندھاری تھا۔قاسم عربی لباس پہنے تھا۔بہرام نے اسے نہیں پہچانا۔لیکن جب قاسم نے نام بتایا،تو پھر کیا تھا۔فوراً گلے لپٹ کر خوشی سے رو دیا۔جب مزاج پرسی دونوں طرف سے ختم ہوئی۔تو قاسم نے کہا۔ ”یہ تو فرمایئے۔کہ آپ ابھی تک یہاں کیسے تشریف رکھتے ہیں۔آپ کا قصد تو مدت ہوئی یہاں سے روانگی کا مصمم ہو چکا تھا“۔

بہرام بولا: ”واللہ! میرا حال نہ پوچھیے۔ایک داستان غم ہے۔جسے کہنا مشکل ہے۔تدبیر انسان کرتا ہے۔تقدیر اُسے اُلٹ دیتی ہے۔کسب کمال بالخصوص جہاں علم و فضل کی انتہا نہ رہتی ہو۔موجب زوال ہو جاتا ہے۔ناموری اور شہرت نامور کے سر پر تباہی لے آتی ہے۔بہترین قصیدہ جو اس طوطی شکر زبان نے کبھی عرض کیا تھا۔وہ شاہ تبریز کی شان میں تھا۔اس شاہ

سخن پرور نے ایک مشاعرہ منعقد فرمایا۔ جس وقت خبر گرم ہوئی۔ کہ یہ ناچیز بھی شریک ہوگا۔ تو صرف ایک شاعر ایسا بے غیرت نکلا۔ جو میرے مقابلے پر آنے کے لئے مشاعرہ میں حاضر ہوا۔ شاہ تبریز نے اس کا قصیدہ سنا۔ لیکن بلا تردد انعام میرے لئے تجویز فرمایا۔ پس خیال فرمایئے۔ کہ یہ شہرت اور قبول عام ہی کا طفیل تھا۔ کہ شاہ ذیجاہ نے میرا ایک شعر بھی نہیں سنا اور اگر سُن لیتے تو یقین جانئے۔ جتنا انعام تجویز کیا تھا۔ اس سے دو چند عنایت فرماتے"۔

قاسم نے بیچ میں بات توڑ دی۔ اُسے اتنی مہلت کہاں تھی۔ کہ بہرام کے لطیفے سنتا۔ قطع کلام کر کے کہنے لگا۔ "کوئی تخلیہ کی جگہ ایسی بتایئے۔ جہاں ایک نہایت اہم معاملے پر کچھ گفتگو ہو سکے"۔ بہرام نے جواب دیا۔ "یہ کیا مشکل ہے۔ میں اس وقت حسن سے ملنے اس کے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی ساتھ آؤ۔ رستے میں باتیں ہوتی جائیں گی"۔

قاسم کو جب معلوم ہوا۔ بہرام نے پہاڑ والا تنگ راستہ اختیار کیا ہے۔ تو خدا کا شکر کیا۔ کیونکہ جو امر درپیش تھا۔ وہ نہایت ضروری تھا اور اس بات کا خوف جدا تھا۔ کہ شیخ الجبل کے جاسوس کہیں ابن ریمند اور پری کو شبہ کی نظر سے دیکھ کر تحقیقات نہ شروع کر دیں رستہ پر آگے آگے قاسم اور بہرام تھے۔ اور پیچھے پری اور ابن ریمند چل رہے تھے۔ قاسم نے تھوڑ فریدا کی خطرناک حالت اور اس کو مدد پہنچانے کی مشکلات جس حد تک مناسب سمجھیں بہرام سے کہیں۔ بہرام نے کوئی بکار آمد بات نہ بتائی۔ اپنی ہی قسمت کو روتا رہا۔ کہنے لگا۔ "یہ شہر خطروں کا گھر ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جس رات آپ ایوب کے مکان پر آئے ہیں اور وہاں آپ نے ان دو گلہائے نیلوفر کی تلاش میں سخت شوریدہ سری اور اخلاقی کمزوری کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کی دوسری رات کو نہایت ہولناک واقعات پیش آئے۔ شہر کی تمام گلی کوچوں میں یک لخت لال اور سپید وردی والوں کے غول نظر آنے لگے۔ معلوم ہوا۔ کہ شیخ الجبلنے انہیں اس غرض سے بھیجا ہے۔ کہ حسن کے جس قدر ہوا خواہ ہوں۔ ان کو قطعاً نیست ونابود کر دیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسے ایسے ظلموں سے صدہا آدمی قتل کر ڈالے۔ کہ راستوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اس غضب کی خونریزی تو ان آنکھوں نے اُس وقت بھی نہ دیکھی تھی۔ جب کہ اُس بدبخت تشنۂ خون سیف الدین نے میرے شہرۂ آفاق مربی اور ہمنام یعنی سلطان بہرام کے شہر کو لوٹا اور غارت کیا تھا اور میرے اکثر احباب کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس ہولناک ہنگامے کو دیکھ کر میں نے

یہاں سے روانگی کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے بعد دو دن تک شہر کے دروازے بند رہے۔ اس اثنا میں میں نے چاہا۔ کہ اپنے محسن و مسیحا قاسم کی خیر و خبر معلوم کروں۔ لیکن وہ حضرت اس خادم کو ورطۂ ہلاکت میں چھوڑ کر پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ آخر کار جب شہر کے دروازے کھلے تو میں نے تن تنہا یہاں سے نکل جانے کا قصد کیا۔ چنانچہ ایوب سے رخصت بھی ہو لیا۔ لیکن جب روانگی کا وقت قریب آیا۔ تو وہی لال اور سپید وردی والے قاتل گھر میں گھس آئے اور مجھے پکڑ کر کشاں کشاں شیخ الجبل کے قصر میں لے گئے۔ میں سمجھا۔ کہ قضا آ گئی اور بری طرح آئی۔ لیکن جب اس شیخ عالی مقام کے حضور میں پیش ہوا۔ تو اس نے یہ التفات خسروانہ مجھ پر نظر کی اور ارشاد ہوا۔ کہ تمہارے علم و فضل اور کمالات کی شہرت ہمارے گوش گذار ہوئی ہے۔ اتنا سُن کر میرے دم میں دم آیا اور میں نے فوراً وہی قصیدہ جو شاہ تبریز کی شان میں لکھا تھا۔ سنانا شروع کر دیا اور نہایت صفائی سے شاہ تبریز کا نام حذف کر کے شیخ الجبل کا اسم گرامی معہ خطابات کے اشعار میں لا ڈالا۔ مگر پہلا بند بھی ختم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ شیخ کی حالتِ غالباً میری سحر بیانی سے متاثر ہو کر بگڑنے لگی اور کیفیت امتلا کی اس درجہ بڑھی۔ کہ اُبکائی کسی طرح نہ تھمتی تھی۔ فوراً چیخ کر فرمایا۔ ''بس۔ بس۔ تمہارا کمال شاعری ہمیں درکار نہیں۔ اس سے تم کو ہماری ملازمت نہیں مل سکتی۔ ہم نے سنا تھا۔ کہ تم بڑے کیمیا گر ہو۔ یہ فن البتہ ایسا ہے۔ کہ ہماری خدمت میں رہ کر تم ترقی کر سکتے ہو اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ کام تمہارے سپرد کیا جائے''۔ میں نے نہایت لجاجت سے عرض کیا۔ کہ فنون کی اس شاخ میں گو میرے اکتسابات غیر معمولی ہیں۔ مگر شاعری اور موسیقی کے برابر بلند پایہ نہیں۔ میں اپنے قصائد سے جو ابدالآباد تک مقبول انام رہنے والے ہیں۔ زیادہ دولت اور نام پیدا کر سکتا ہوں۔ لیکن شیخ معظم نے میرا ایک عذر بھی نہ سنا اور حکم دیا۔ کہ اگر یہ آدمی کیمیا گری کی خدمت سے انکار کرے تو ابھی اس کا سر قلم کر دو۔ اُس دن سے آج تک شیخ کی خدمت میں کیا ہوں۔ قید میں ہوں۔ زندانِ اسیری کا مہمان اور خوانِ زہر کا میزبان ہوں''۔ اتنا کہہ کر بہرام ہاتھ ملنے لگا اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا۔ ''ہائے تقدیر۔ اب میرا کام یہ ہے۔ کہ رات دن طرح طرح کے زہر تیار کیا کروں۔ تا کہ دھوکے سے انہیں پلا کر شیخ کے دشمنوں کا کام تمام ہوتا رہے۔ صد افسوس! میرے کمالات علمی کا یہ انجام ہوا اور میرے دل و دماغ کو شعر و سخن کی طرف سے پھیر کر سمیات کی طرف رجوع کر دیا گیا۔ اس

حالت میں اگر کچھ تفریح نصیب ہوئی ہے۔ تو وہ حسن کی صحبت میں ہوئی ہے۔ جو حقیقت میں مخزن علوم وفنون ہے"۔

قاسم نے متعجب ہوکر پوچھا۔ "مگر حسن کی نسبت تو یہ مشہور تھا۔ کہ وہ اور اُس کے ہواخواہ سب مارے گئے۔ کیا شیخ الجبل اور اس کی رعایا کو حسن کا زندہ ہونا معلوم ہے؟"

بہرام نے کہا۔ "ہاں یہ درست ہے۔ کہ حسن کے مر جانے یا غائب ہو جانے کا یقین سب لوگوں کو ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں کے لوگ اس کو انسان نہیں۔ بلکہ انسان سے بالاتر سمجھتے ہیں اور یہ بات ہے بھی درست۔ کیونکہ مرنے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ پھر زندہ ہو گیا۔ اس کے دوبارہ زندہ ہو جانے پر تو شیخ کے پیٹ میں بھی چوہے دوڑنے لگے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے۔ کہ باپ نے بیٹے سے مصالحت کر لی ہے اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر عہد کیا ہے کہ اب وہ حسن کی جان کے درپے نہ ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ جو قسمیں انسان کو پابند کرتی ہیں۔ شیخ کے لئے وہ سب بالائے طاق ہیں۔ چنانچہ اب بھی وہ در پردہ شرارت کر رہا ہے۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شیخ جس آدمی سے اتنا ڈرتا ہو۔ پھر اس سے دوستی پیدا کرنے کی مجھے کیوں سخت تاکید کی گئی ہے۔ مگر اب تو اس مطرب قندھار کو فی الحقیقت حسن سے ایک دلی خلوص ہو گیا ہے۔ جیسا کہ دو جید عالموں میں پیدا ہو جانا مقتضائے فطرت ہے۔ اس دوست کو کسی طرح کا نقصان پہنچنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی میرے ہاتھ یا پاؤں کاٹ ڈالے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ مجھی کو اس کی موت کا ذریعہ بنانے کی نیت کی جائے"۔

یہ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ کہ چلتے چلتے پہاڑ والی سرنگ تک پہنچ گئے۔ بہرام نے جیب سے کنجی نکال کر دروازہ کھولا۔ قاسم سمجھتا کہ بہرام نے شاید چیتوں سے بھی دوستی کر لی ہے۔ لیکن دروازے سے نکلا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ چیتے اپنی جگہ پر نہ تھے۔ بہرام نے بتایا کہ اب وہ حسن کے مکان کے قریب بندھے رہتے ہیں۔ جب مکان کے قریب پہنچے۔ تو قاسم نے خیال کیا۔ کہ بہرام کو اس وقت ایسا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ کہ ممکن ہے۔ ہمارا بھی کوئی کام اس سے نکل آئے۔

قاسم کو دیکھ کر حسن کو بہت حیرت ہوئی اور وہ نہایت خوش ہو کر اس سے ملا۔ قاسم کا دل حسن کی طرف سے مطمئن نہ تھا۔ لیکن اس وقت سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ اس سے تمام حالات بیان کر کے توقع کی جائے۔ کہ جس طرح پہلے مشکل حل کی تھی۔ اب پھر مدد کرے، حسن

کے سامنے آتے ہی بہرام اپنے پرانے رنگ میں آ گئے۔ بلکہ مزاج میں چُہل کچھ پہلے سے بھی زیادہ آ گئی۔ قاسم نے جب حسن کے سامنے کل قصہ کہا۔ تو بہرام بولے ''خاکسار نے تو آپ کو پہلے ہی ان تمام خطروں سے آگاہ کر دیا تھا۔ جو عورتوں کے جال میں پھنسنے سے آدمی کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ میرا قول آپ کو یاد ہوگا۔ کہ عورت اور بتاہی مرادف الفاظ ہیں''۔

حسن نے ہنس کر کہا۔ ''مگر آپ کو یہ بھی خبر ہے۔ کہ ہندوستان کے لوگوں میں کیا قول مشہور ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ تین چیزیں ایسی ہیں۔ جو جاڑے میں گرم اور گرمی میں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ ایک بھاری چھت دوسرے گہرا کنواں اور تیسرے اچھی جورو''۔

بہرام بولا۔ کہ ''پہلی دو چیزوں کے لئے جو کچھ کہا۔ بالکل سچ کہا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ اگر جورو پر چھت ٹوٹ پڑے اور کنواں اسے ڈبودے۔ تو یہ دونوں چیزیں اور بھی اچھی ہو جائیں گی۔ جورو اور اچھی جورو۔ کیا خوب۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ جورو اچھی ہو یا بُری۔ گھر میں ہمیشہ کو ایک بلا گھس آتی ہے۔ رہے بازار کے پھول۔ تو وہ چھتّے کی بھڑوں سے کم نہیں اور ساسوں سے تو خدا پناہ میں رکھے۔ ان کے قدم تو ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے سارا گھر بھڑ بھڑ جلنے لگے۔ میری خوش دامن صاحبہ مرحومہ کو دیکھئے۔ کہ اگر خدانخواستہ وہ جنت میں پہنچ گئی ہیں۔ تو جتنے بھلے مانس وہاں ہوں گے۔ وہ ان کی صورت دیکھتے ہی بوریا بندھنا سنبھال فوراً دوزخ میں چلے گئے ہوں گے۔ کس کو تاب ہے۔ کہ ان کی گرمی صحبت سے فیض یاب ہو سکے۔ دور کیوں جایئے۔ ذرا ہمارے ان محبّ مکرم قاسم ہی کے دل سے پوچھئے۔ جو مسجد میں جا کر ٹکریں مارنے کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ اب عورتوں کے پھندے میں آ کر کیسے تباہ حال ہو رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ کہ حضرت عشق کا پرچم جہاں اڑنے لگا۔ پھر زہد و پارسائی کی حکومت برخاست ہو جاتی ہے۔ چاہے قرآن پاک کی ساتوں منزلیں ازبر کر چکے ہوں۔ لیکن جہاں عشق کا آزار لگا۔ پھر قاعدہ کی الف بے تے بھی یاد نہیں رہتی''۔

بہرام کی نامعقول گفتگو سے قاسم کی طبیعت گھبرائی جاتی تھی۔ دل میں طرح طرح کے خوف پیدا ہو رہے تھے اور اب تک یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کیا جائے۔ اِدھر اُدھر خیال دوڑانے کے بعد دفعتاً اس کبوتر اور تحریر کا خیال آیا۔ جو کبوتر کے پروں میں چھپی ہوئی ملی تھی۔ قاسم نے فوراً وہی نکالی اور اس پر جو کچھ لکھا تھا۔ وہ پڑھ کر سنایا۔ حسن نے بہت غور سے سنا اور

دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''اس خط کا آپ کے ہاتھ پڑ جانا حقیقت میں بڑی خوش قسمتی ہے۔ کیونکہ اس سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جن پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ وزیر موت نے میرے والد کو یہ خبر سنا دی ہوگی۔ کہ یہ نوجوان جو اس وقت آپ کے ساتھ ہے اور اب امیر طرابلس ہونے کی عزت رکھتا ہے۔ فدائیوں کے ہاتھ سے قتل ہو چکا ہے اور میرے والد کا اس یقین میں رہنا اس نوجوان کے حق میں مفید ہے۔ دوسری بات وہ قسم ہے۔ جو ایک کافر کی لاش پر کھائی گئی ہے۔ اس معمے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھ سکا''۔

اس پر قاسم نے حسن سے بیان کیا۔ کہ جب تومس ریمند مارا گیا۔ تو اس کی لاش گرجا میں لا کر رکھی گئی۔ وہاں جس قدر نصرانی شہسوار موجود تھے۔ ان سب نے ایک ایک کر کے اس لاش پر ہاتھ رکھا اور انتقام لینے کی قسم کھائی اور پھر نہ صرف حشیشیوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کو تومس کی موت کے بدلے میں تہ تیغ کر دیا۔ صرف یہ وزیر موت وہاں سے بچ کر نکل آیا''۔

حسن یہ قصہ سُن کر کچھ غور کرنے کے بعد بولا۔ ''ان نصرانیوں کے ہاں کے بعض طریقے عجیب ہیں۔ جب ان کے ہاں کوئی مرتا ہے۔ تو اس کی لاش کو زمین میں دفن کرنے کے لیے پہلے ایک صندوق میں بند کرتے ہیں۔ یہ نوجوان نصرانی جو تمہارے ساتھ ہے۔ ان صندوقوں کی وضع قطع بیان کر سکتا ہے۔ اگر یہ تحقیق ہو جائے۔ تو پھر اس فرنگن کی جان بچانے میں کچھ مدد مل سکتی ہے''۔

قاسم نے ریمند سے صندوق کی شکل پوچھی۔ اس نے عیسائیوں کے تابوت کی صورت بیان کی۔ قاسم نے حسن کو کُل مضمون سمجھایا۔ حسن نے سُن کر اپنے پرانے خادم فضل کو بلایا۔ فضل کے چہرے پر اب سیاہ ڈاڑھی تھی۔ آقا نے جب کچھ باتیں کرلیں۔ تو فوراً شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

حسن نے پھر اس دھجی کو جس پر وہ تحریر تھی۔ غور سے دیکھا اور بہرام سے کچھ کان میں کہا۔ بہرام سنتے ہی اندر والے کمرے میں گیا۔ اس اثنا میں حسن قاسم سے کہنے لگا۔ ''آپ کے دوست بہرام شاعر اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے اچھے کیمیا ساز ہیں۔ گو تانبے کو سونا نہیں بنا سکتے لیکن موت کے حکم کو رہائی کا حکم بنا سکتے ہیں۔ کچھ عرصے سے میں نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ اس فن کے بعض تجربات وہ اسی مکان میں کیا کریں۔ کیونکہ جب کسی عقلمند کو اپنے ہی کسی دوست سے دغا پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تو وہ اس کی تلوار چھپا کر اپنے بستر کے نیچے رکھ لیا کرتا ہے''۔

بہرام کمرے سے نکلا۔ تو ہاتھ میں ایک شیشی عرق کی تھی۔ عرق بالکل صاف تھا۔ کوئی رنگ اس میں نہ تھا۔ بیٹھتے ہی وہ دھجی ہاتھ میں لی اور جس طرح حسن بتا تا گیا۔ پہلے کپڑے پر تھوڑا سا عرق چھڑکا۔ پھر حرفوں پر اُسے ملا۔ عرق کے ملتے ہی حرف اُڑ گئے۔ ان اُڑے ہوئے حرفوں کی جگہ حسن نے اپنے قلم سے کچھ لکھا اور لکھ کر قاسم کو دکھایا۔ اب اُس نامے کی عبارت یہ ہوگئی۔ ''موت نے شیطان کو واصل جہنم کیا لیکن کافر مومنوں پر غالب آئے۔ دشمن سے ہماری مخلصی کی صورت اب یہی ہے۔ کہ ایک نئی قسم لی جائے اور یہ قسم نصرانیوں کے تابوت پر لی جائے۔ جس میں ان کے مُردے ہوتے ہیں''۔

کپڑے کی وہ دھجی اب کبوتر کی کمر میں باندھ کر اُسے اُڑا دیا۔ کبوتر کو معلوم تھا۔ کہ کہاں جانا ہے۔ وہ سیدھا قلعہ اَلموت کے سب سے بڑے برج کی طرف اُڑا۔ اور سونے کی چھت پر آ کر شیخ کے ایوان میں اڑتا ہوا پہنچ گیا۔

حسن نے کہا۔ ''اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کبوتر کی معرفت جو تحریر بھیجی گئی ہے۔ اس کی توثیق ایک مفصل مراسلے سے کر دی جائے۔ شام کے داعی الکبیر کے کچھ پرانے مراسلے جو ایک زمانہ میں میرے سپرد کئے گئے تھے۔ اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے کسی مراسلے کو لے کر بغیر اس کے کہ دستخط یا مہر میں فرق آئے۔ ہم اس کے متن کو آسانی سے بدل سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے یہ نصرانی دوست اسے شیخ کے پاس لے کر جائیں۔ لیکن ان کو گونگا بنا رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے یہ سمجھا جائیگا۔ کہ وہ کوئی قاصد ہیں۔ جو ولایت شام سے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ان کو خطرہ بہت رہے گا اور کامیابی کی امید بھی کم ہو گی۔ مگر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ قاسم تم ان کو یہ سب باتیں علیحدہ لے جا کر سمجھا دو اور ادھر ہم کسی پُرانے مراسلہ کو لے کر اس کا مضمون بدلتے ہیں''۔

حسن اور بہرام نے جو مراسلہ تیار کیا۔ اس پر اوپر کا القاب اور نیچے داعی الکبیر کے دستخط اور اس کی مُہر جس طرح تھی۔ اسی طرح قائم رکھی۔ متن میں جو کچھ پہلے لکھا تھا۔ اسے بہرام نے عرق لگا کر بالکل اُڑا دیا۔ کاغذ بالکل کورا نکل آیا اور اب اس پر حسب ذیل عبارت لکھی گئی:۔

''بغرض اقدس مقبولِ رب امجد جناب کے محمد امام واجب الاکرام حشیشئین جس کی جنبش لب پر سارے جہان کی سلطنتیں لرز اُٹھتی ہیں اور آسمان کے ستارے زرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ بندۂ نا

چیز ملک شام کا داعی الکبیر بعد دعائے دولت و اقبال عرض پرداز ہے۔ اولاً۔ عساکر اسلامیہ نے شہر انطا کیہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ ثانیاً جس وقت لشکر کفار شکست کھا کر پھر حملہ آور ہوا۔ تو مسلمانوں نے اسے غارت کر کے ہزار ہا کافروں کو جہنم واصل کیا۔ آج کل اتا بک موصل نورالدین محمود کا ستارۂ اقبال بلندی پر ہے لیکن ارکان طبقہ حشیشئین نے ان دونوں معرکوں میں مسلمانوں کو بیش قدر امداد پہنچائی اور اس امداد سے امیر لشکر یعنی اتا بک کے دل میں حشیشیوں نے اپنا اعتماد پیدا کرلیا اور یہ اعتماد ہمارے لیے اس وقت بکار آمد ہوگا۔ جبکہ اتا بک موصوف کا اقتدار اوج کمال پر پہنچے گا۔ ثالثاً۔ ان فوائد کے متعلق جو ہمارے طبقے سے عمل میں آئے ہیں۔ گذارش ہے۔ کہ جنگ انطا کیہ میں جو شہر کے سامنے پیش آئی۔ اس شیطانی امیر طرابلس یعنی قومس ریمند کو ہمارے ہی لوگوں نے قتل کیا۔ رابعاً۔ وزیر موت نے جس کو حضور اقدس نے خاص مقاصد واغراض کے لئے یہاں روانہ فرمایا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس شیطان قومس پر خنجر چلایا۔ خامساً۔ اس داعی واجب التحسین نے کفار کی ایک عورت کو گرفتار کیا ہے۔ اس عورت کو ابتداءً حریم شیخ میں داخلہ کی عزت نصیب ہوئی تھی مگر یہ اس کی تیرہ بختی تھی۔ کہ اس نے اس عزت کی مطلق قدر نہیں کی اور ایسی ذات بابرکات کی پناہ سے نکل گئی۔ جس کے اقبال سے یہ جملہ کارہائے عظیم درجہ تکمیل کو پہنچے ہیں اور یہ فدوی شام کا داعی الکبیر بہ کمال ادب اس داعی کی سفارش کرتا ہے۔ جس کی رہبری میں یہ کل کام انجام پائے ہیں۔ فدوی کی یہ دعا ہے کہ اس کو اپنے آقائے نامدار سے اپنی خدمتوں کا کوئی بیش قدر صلہ ملے۔ امور متذکرہ صدر کی نسبت بس اتنی تحریر کافی ہے۔ اب فدوی کا یہ فرض ہے کہ دیگر معاملات کی کیفیت گذارش کرے۔ جس وقت کسی خونخوار درندے کو ایک شکاری کے ہاتھ سے بہت سے زخم پہنچتے ہیں۔ تو حالت تکلیف میں اس کا غیظ و غضب بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی پوری طاقت سے دشمن پر حربہ کرتا ہے۔ اسی طرح جب کفار کو ہمارے ہاتھوں سے سخت سے سخت ایذائیں پہنچیں تو ان کا غصہ ہم پر بھڑک اُٹھا اور انہوں نے مل کر قسم کھائی۔ کہ جبل لبنان میں جس قدر قلعے اور حصار ہمارے ہیں ان کو زمین دوش کر دیں گے۔ آلات حرب جن سے وہ لڑائیوں میں کام لیتے ہیں اور جن کو نہایت دانشمندی سے انہوں نے بنایا ہے۔ وہ حریف مقابل کے سخت نقصان اور ضرر کا باعث ہو رہے ہیں، تکلیف اور غصہ نے ان کے دل سیاہ کر دیئے ہیں اور ان کے لب منتظر ہیں کہ کب ہمارا خون چکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے ایسے قلعوں کو جو سرحد پر تھے حملہ کر کے فتح کرلیا ہے اور حضور

کے جاں نثاروں کو تہ تیغ کر کے جو باقی رہے ہیں ان پر ظلم وستم کی انتہا کر دی ہے اور ہم کو دھمکی دی ہے کہ ہم سب کے سب اس جہاں سے معدوم کر دیئے جائیں گے اور حقیقت میں نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اسماعیلیہ شام کو نیست و نابود کر کے ان کی آبادیوں کو جنگل بنانا شروع کر دیا ہے۔ لیکن حال میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ اتفاقاً ہم میں سے ایک بڑے بزرگ شخص پر حالت وجد طاری ہوئی اور سات روز تک اسی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اپنے اصلی حال پر آئے تو بیان کیا، کہ "ملائکہ میں سے جناب میکائیل مجھ پر ظاہر ہوئے اور وہ ایک ایسا طریقہ بتا گئے ہیں۔ جس سے ہمارے طبقے کے لوگوں پر کفار کی تلواریں اور تیر بالکل بے اثر ہو جائیں گے اور جب کبھی ہمارا ان کا مقابلہ ہوگا۔ ہم ان پر غالب رہیں گے۔ وہ طریقہ یہ بتایا ہے کہ کافروں کی کسی عورت کو پکڑ کر اس کی قربانی کر دی جائے اور یہ قربانی خاص اَلموت میں شیخ الجبل کے قصر مبارک میں ہو۔ جب اس عورت کی قربانی کر دی جائے تو اس کی لاش ایسے تابوت میں رکھی جائے، جس میں یہ کافر نصرانی اپنے مُردوں کو رکھ کر دفن کرتے ہیں اور اس تابوت پر وہ نشان بھی ضرور ہونا چاہئے۔ جس کی یہ کفار پرستش کرتے ہیں۔ اس کے بعد داعیان خاص جو بڑے رُتبے اور اعتماد کے لوگ ہیں۔ ان کو حکم ہو۔ کہ اس تابوت پر ہاتھ رکھیں اور اس وقت شیخ الاعلم امیر کبیر خود اپنی زبان سے ایک قسم کے الفاظ ادا کرے اور داعیان خاص بھی ان الفاظ کو جبکہ ان کے ہاتھ تابوت پر رکھے ہوں کہتے جائیں۔ قسم کا مضمون یہ ہو کہ "داعیان خاص اس امر کا عہد کرتے ہیں کہ وہ ملک شام کو روانہ ہوں گے اور جس ہلاکت کا خوف وہاں کے داعیوں کو کفار کے ہاتھوں پیدا ہو گیا ہے اس سے بچانے کے لئے سرگرمی سے مدد کریں گے اور ان کے مقتولوں کے خون کے بدلہ لیں گے"۔ یہ کُل کام جس طرح بیان ہوا ہے۔ بجنسہ اسی طرح ہونا چاہئے اور صرف یہی طریقہ ہے، کہ شیخ عالی مقام اپنے وفادار خادموں کی جانیں بچا سکتا ہے۔ اگر اس طریقہ پر عمل کرنا منظور فرما لیا گیا، تو جس طرح بنی جرہم سیلاب سے بچا لئے گئے تھے ہم بھی ہلاکت سے محفوظ رہیں گے اور نہ صرف یہ بلکہ دشمنوں سے انتقام لینے کی پوری قوت ہم میں پیدا ہو جائے گی"۔

قاسم نے جب یہ خط پڑھا تو وہ ڈر گیا اور حسن سے بہ منت وسماجت کہنے لگا، کہ "یہ خط نہ بھیجا جائے کیونکہ اس کا انجام نہایت ہولناک معلوم ہوتا ہے"۔ حسن نے کہا "قاسم ڈرو نہیں، وہ تمہاری گوری فرنگن مرے گی نہیں، اندیشہ بیشک ہے لیکن اگر ہم نے یہ تدبیر نہ کی اور اس سے بہتر بات تم

بھی کوئی نہیں بتا سکتے ہو تو پھر خیال کرو کہ خطرہ کتنا زیادہ ہو جاتا ہے، تمہارا دوست نصرانی جس وقت یہ خط لے جائے گا تو پری بھی اس کے ساتھ ہوگی لیکن تم کو ابھی یہیں رہنا ہوگا تا کہ کچھ اور باتیں بھی سوچ لی جائیں، اب تم اپنا یہ عربی لباس اُتار ڈالو اور فدائی کے کپڑے پہن لو۔ کپڑے یہاں موجود ہیں۔ اُس قتل والی رات میں جس فدائی کو ہم نے مارا تھا۔ اُس کے کپڑے اب تک میرے پاس رکھے ہیں۔ تھوڑی دیر میں قلعے کو چلے جانا اور معلوم کرنا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

ابن ریمند وہ خط لئے اور پری اس کے ساتھ قلعہ اَلموت کو روانہ ہو گئے۔ قاسم کا خوف ابھی تک اُسی حال پر تھا۔

❁ ❁ ❁

اٹھارھواں باب

اب پھر تصور کیجئے' کہ آپ شیخ الجبل کے ایوان میں ہیں۔ وہی ایوان جو قلعہ اُلموت کے سب سے اونچے برج پر شہر الموت سے بلندی پر واقع تھا۔ امام کے محمد بن بزرگ امید ایوان میں بیٹھا ہے اور اس کے لبوں پر ایک ظالمانہ مسرت کا تبسم ہے۔ کیونکہ مکڑی کے جالے میں مکھیاں پھنس رہی ہیں اور مکڑی جالے کے بیچ میں بیٹھی ان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ خوش ہوتی ہے کہ جب چاہوں گی دوڑ کر ان کا خون چوس لوں گی۔ وزیر موت نے شیخ کو یہ خبر سنا دی ہے کہ اتابک نورالدین محمود کی فوج نے افرنجیوں کو شکست فاش دے کر انطاکیہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ باطنی حشیشیوں کا اعتماد اتابک کے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔ قوس ریمند اور اس کے بیٹے کے قتل اور تھور فریڈا کی گرفتاری کی بھی اطلاع کی۔ اس آخری خبر کو سن کر شیخ کو ایسی خاص مسرت حاصل ہوئی کیونکہ معلوم ہو گیا کہ وہ حسین فرنگن شیخ کی حرم سرا میں یعنی اس عمارت میں پہنچ گئی ہے، جو پہاڑی راستے کے اوپر نہایت بلند واقع تھی اور شیخ کے حکم کی منتظر ہے۔

شیخ کے لوح دل پر آئندہ عیش ونشاط کے نقش اُترنے لگے۔ اتنے میں ایک نیلے رنگ کا کبوتر اُڑتا ہوا ایوان میں آیا۔ کسی سے نہ ڈرا۔ شیخ نے اسے پکڑ کر کپڑے کی دھجی پروں میں سے کھول کر پڑھی۔ پڑھتے میں چہرے پر ایسے شکن پڑے کہ گویا مطلب صاف سمجھ میں نہیں آیا۔ فوراً وزیر موت کو طلب کیا۔ درویش حاضر ہوا۔ عبارت اس نے بھی پڑھی اور پڑھ کر بولا "یہ ایک نئی قسم کا حلف ہوگا۔ اچھا تو ہے، جو لوگ باطنی تعلیم کے تمام مدارج طے کر چکے ہیں، ان کے لئے پرانی قسموں کا عدم وجود برابر ہو گیا ہے اور عالم بالا کی جن واجب التعظیم ہستیوں کی قسمیں دی گئی تھیں، وہ ہستیاں بھی اب معتقدات کے زمرہ سے خارج ہو چکی ہیں۔ قسمیں بھی اور جن کی قسمیں دی گئی تھیں۔ وہ بھی سب باطل اور مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ نئی قسم اب اس عالم خاکی کی ایک ڈراؤنی چیز کی، کھانی پڑے گی۔ طرابلس والے بھائیوں نے یہ ایک عجیب

جدّت پیدا کی ہے۔ غالباً کوئی نئی ضرورت پیش آئی ہوگی، جس کی وجہ سے یہ نئی طرح کا حلف وضع کیا گیا ہے۔''

اتنے میں ایک خادم دبے پاؤں اندر آیا اور عرض کرنے لگا کہ نقیب شام کے پاس سے قاصد کاغذ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اتنا سن کر شیخ درویش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''ممکن ہے، ان کاغذات میں اس نئے حلف کی کیفیت مفصل درج کی گئی ہو۔ چنانچہ حکم دیا کہ قاصد حاضر کئے جائیں۔ خادم نے عرض کیا کہ قاصد دراصل دو ہیں اور اسی قسم کے ہیں جیسے شام سے ہمیشہ آیا کرتے ہیں۔ یعنی دونوں خاموش ہیں تا کہ کوئی بات ان سے ظاہر نہ ہو سکے اور لوگ ان کا ادب کریں مگر ان میں سے ایک آدمی بیمار ہو کر یا صحرا میں کسی حادثہ سے زخمی ہو کر شہر میں صاحب فراش ہے۔ تو ایک گذارش اور ہے۔ وہ یہ کہ ایوان سے باہر ایک عورت آئی ہے، جو حضوری چاہتی ہے۔ وہ برقع اوڑھے ہے اور کسی بات کا جواب نہیں دیتی ہے۔ صرف اتنا بتاتی ہے کہ اتفاق سے بڑی خطروں میں سے جان سلامت لے کر یہاں تک پہنچی ہے اور امام کی خدمت میں ایک ضروری معاملہ میں کچھ عرض کرنا ہے۔

شیخ نے کہا۔ ''اس عورت کو بھی طلب کیا جائے گا۔ سردست شام کے قاصد کو حاضر کیا جائے۔''

اب ابن ریمند خط لئے اندر آیا۔ عربی لباس جو سفر میں پہنے تھا اس وقت بھی وہی تھا۔ کیونکہ حسن نے عربی لباس کو بھیس بدلنے کے لئے سب سے بہتر سمجھا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھا تھا۔ کہ وزیر موت نے اگر یہ لباس دیکھ لیا۔ تو وہ فوراً پہچان جائے گا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ جس وقت ابن ریمند اندر آیا۔ تو وزیر موت وہاں موجود تھا۔ دیکھتے ہی چیخا ''حضور! یہ کوئی دغاباز فریبی ہے، اصلی قاصد نہیں ہے۔ وہ آدمیوں نے صحرا میں میرا تعاقب کیا تھا اور ذرا شبہ نہیں ہے۔ کہ وہ تعاقب اس لئے کیا گیا تھا کہ اس گوری فرنگن کو مجھ سے چھین لیں۔ اُن دونوں عربوں کے کپڑے ایسے ہی تھے جیسے یہ پہنے ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ان ہی دو میں کا یہ ایک ہے۔''

ابن ریمند عربی زبان مطلق سمجھتا نہ تھا۔ صرف دو چار ایسے معمولی لفظ جو کافروں کی زبان پر بھی چڑھ جاتے تھے، جانتا تھا۔ درویش کی گفتگو وہ بالکل نہیں سمجھا۔ لیکن اتنا جان گیا۔ کہ یہی اس کے باپ کا قاتل ہے اور یہی تھور فریدا کو بھی اٹھا کر لے آیا ہے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ اس کا لباس اس درویش نے ضرور پہچان لیا ہوگا کیونکہ تعاقب کے وقت وہ اس کے بہت

قریب پہنچ گیا تھا۔ ابن ریمند نے دل میں کہا کہ معاملہ طشت از بام ہوا۔ اب جان بچتی نظر نہیں آتی۔ اراد کر لیا کہ کم سے کم اپنے باپ کے خون کا انتقام لے کر اور جتنے دشمنوں تک ہاتھ پہنچ سکا۔ سب کو مار کر مروں گا۔ چنانچہ کمر سے وہی خنجر جو قاسم نے دیا تھا، نکال لیا اور درویش کی طرف بڑھنے کو ہوا۔ اتنے میں شیخ نے زور سے ہنس کر کہا۔ ''فدائیوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔ وہ توہین کی برداشت نہیں کر سکتے۔'' ابن ریمند اس آواز کو سن کر رُکا اور یہ سمجھ کر کہ صورت کچھ اور پیدا ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس درویش کو مار کر خود مارا گیا۔ تو تھور فریدا کی جان بچنی ممکن نہ ہوگی۔ درویش کے قتل سے باز رہا اور حسن کی ہدایت یاد کر کے فوراً شیخ کے سامنے زمین بوس ہوا اور اُٹھ کر وہ خط شیخ کو پیش کیا۔ جب تک وہ پڑھتا رہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ مگر نظر درویش کی طرف جمی تھی اور بار بار ارادہ ہوتا تھا کہ اسے وہیں قتل کر دے کیونکہ تھور فریدا کی جان بچنی ایک مشکوک سی بات معلوم ہوتی تھی۔ جب اُسی کے بچنے کی امید نہیں۔ تو پھر یہ موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ یہی برابر سوچتا رہا اور درویش بھی اس کو شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا۔

جب شیخ نے خط پڑھ لیا، تو اس کا مضمون وزیر موت سے بیان کر کے کہا۔ ''حقیقت میں یہ عجیب واقعہ ہے۔ اس بزرگ نے جو کچھ حالت وجد و بےخودی میں دیکھا ہے، وہ یقین کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دوسرے یہ کہ حلف کا جو جدید طریقہ تجویز ہوا ہے۔ اگر وہ درست بھی ہو، تو یہاں کون سی کافر عورت موجود ہے، جس کی قربانی ممکن ہوگی۔ اتنا کہہ کر پھر کچھ سوچ کر بولا۔'' وہ برف سے پاکیزہ حسین فرنگن البتہ ہے جسے تم پکڑ لائے ہو لیکن وہ ہماری چیز ہے۔ اس کی قربانی ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔''

یہ جملہ سن کر وزیر موت سمجھ گیا۔ کہ ''شیخ کا دل تھور فریدا پر آ گیا ہے۔ اب اس نازنین کو شیخ سے انعام میں مانگنا ایسے ہی ہوگا۔ جیسے ماہ درخشاں سے کہنا کہ آسمان سے اُتر کر زمین پر آ جائے۔'' اس کے ساتھ ہی ایک باریک بات اس کی ذہن میں آئی اور کہنے لگا۔'' یا امام والاتبار! میں اس بزرگ سے واقف ہوں۔ اس سے اور بھی کرامات ظہور میں آ چکی ہیں اور جو کچھ وہ حکم لگاتا ہے۔ صحیح نکلتا ہے پس اس وقت بھی جو کچھ اس نے کہا ہے۔ اس پر عمل ہونا چاہیے لیکن یہ کام ناممکن ضرور معلوم ہوتا ہے۔''

شیخ الجبل نے کہا۔ ''اگر وہ غیر ممکن نہ ہو۔ تو پھر اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پس تم جاؤ اور دریافت کرو کہ کافروں کی کوئی عورت اس وقت شہر میں چھپی ہوئی تو نہیں ہے۔ اگر وہ

خدا رسیدہ بزرگ حقیقت میں علم غیب رکھتا ہے تو حلف کا جو طریقہ اس نے بیان کیا ہے۔ اس کو اختیار کیا جائے کیونکہ شام کی حشیشیوں کو مدد پہنچانے میں ہم کسی قسم کی فروگذاشت گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر طریقہ معلومہ پر قسم دی جانی ممکن ہوئی۔ تو ہم تم کو اور اپنے اور جانبازوں کو شامیوں کی کمک پر روانہ کریں گے۔ اس طرح تم کو عزت و نام پیدا کرنے کا موقع ملے گا اور بڑے انعاموں کے مستحق ہو جاؤں گے لیکن اس کام میں عجلت ضروری ہے کیونکہ آج ہی شب کو میں جماعت خانہ میں ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے والا ہوں اور اگر کوئی کافر مل جائے تو قربانی کے لئے اس سے بہتر موقع نصیب نہیں ہو سکتا۔"

وزیر موت بالکل خاموش تھا۔ وہ اپنا منصوبہ الگ ہی سوچ رہا تھا۔ اسی حال میں شیخ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ جو عورت حاضر ہونا چاہتی ہے، اسے اندر بلایا جائے۔ عورت آتے ہی شیخ کے قدموں پر گر پڑے اور پھر اُٹھ کر اس نے نقاب چہرے سے ہٹا دیا۔ شیخ صورت دیکھتے ہی قہر و غضب کی آواز سے بولا۔ "یہ تو پری ہے، یہی نمک حرام اس مہ جبین فرنگن کو بھگا کر لے گئی تھی۔ فوراً اس نابکار کو یہاں سے لے جاؤ اور سخت ایذائیں پہنچا کر اس کی جان نکالو۔"

لیکن وزیر موت نے عرض کیا۔ "یا شیخ! اس نے بیشک اس نازنین کو بھگا لے جانے میں بہت بڑا قصور کیا تھا لیکن اپنے کئے پر پچھتائی اور پھر بڑی وفاداری سے حضور کی خدمت بجا لائی۔ میری التجا ہے کہ اس کے قصور کو معاف فرما کر چشم ترحم سے اس کی طرف دیکھا جائے اور میں اس کے وہ کام عرض کرتا ہوں جو اس کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے لئے اس شامی فدائی اور اس عورت کو ایوان سے باہر جانے کا حکم ہو۔"

جب دونوں باہر چلے گئے۔ تو وزیر موت نے جو واقعات پیش آئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو سچ سچ بیان کر دیئے اور کچھ جان کر چھوڑ دیئے، اس خیال سے کہ پری کی جان بچانی ہے اور اس احسان کے بدلے میں وہ اس کے منصوبے کو آگے چلانے میں کام آئے گی۔ پورا قصہ نہیں کیا، صرف یہ بیان کیا کہ "تومس شیطان کی اس صلاح سے کہ انطاکیہ کے شہر پر پھر قبضہ کر لیا جائے۔ اسی عورت نے بروقت مجھ کو اطلاع دی اور تھور فریدا کو گرفتار کرا دینے میں ہر طرح کی کوشش کی۔" لیکن یہ نہیں کہا کہ تھور فریدا سے رشک رکھنے کی وجہ سے پری نے ایسا کیا۔ اس کے بعد تھور فریدا کے ساتھ پری کی محبت کا ذکر کر کے کہا۔ کہ صرف اسی بنا پر وہ اپنی مالکہ کے ساتھ خود بھی بھاگی تھی لیکن اس وقعہ کے بعد اس نے گرفتار کرا دینے کی تدبیر کی، تا کہ پھر وہ شیخ

والا جاہ کے حفظ و پناہ میں آ جائے۔ اولاً تو اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی۔ تو جو کام اس سے بعد کو عمل میں آئے۔ ان سے اس کی قطعی صفائی ہو جاتی ہے اور وہ بجائے الزام کے تحسین و تعریف کی مستحق ہوتی ہے اور اگر اپنی مالکہ کے پاس رہنے کی اجازت ہو۔ تو مجھے امید ہے کہ وہ ضرور اس کی طبیعت کو ہمیشہ راہ راست پر رکھے گی۔''

شیخ نے کسی قدر تامل کے بعد کہا۔ ''اچھا! اُسے حاضر کیا جائے۔'' جب پری پھر ایوان میں آئی تو حکم ہوا کہ جو واقعات اُسے پیش آئے، بیان کرے۔

پری نے عرض کیا۔ ''شیخ کا ارشاد ہے کہ اس ناچیز خادمہ پر جو کچھ گذرا۔ اسے عرض کرے۔ جس وقت اس خادمہ نے اپنی مالکہ و مربیہ کو حشیشیوں کی حراست میں دے دیا۔ تو یہ داعی یعنی وزیر موت، میری مالکہ، میں خود اور ایک ملازم یہ چار آدمی طرابلس سے حضور کے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں صحرا کی صعوبتوں کو برداشت کر کے آخر کار ہم اس سے گزر لئے۔ لیکن جب پہاڑوں میں داخل ہونے لگے۔ تو دفعتاً عقب سے وہ آدمی جو بظاہر عرب معلوم ہوتے تھے، اونٹ دوڑاتے ہوئے ہماری طرف آتے نظر آئے۔ ہم سمجھے کہ یہ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں اور اب تھوڑی دیر میں ہمیں پکڑ لیں گے لیکن وزیر موت نے یہ کیفیت دیکھتے ہی بڑی دانائی کی، فوراً میرے اونٹ کی مہار ہاتھ سے چھوڑ دی اور صرف اپنے اور میری مالکہ کے اونٹوں کی مہار ہاتھ میں لئے نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔ میں تنہا رہ گئی لیکن یہی مناسب بھی تھا کیونکہ ایک دُرِ شاہوار کے مقابلے میں بالخصوص جبکہ وہ حضور کے سامنے پیش ہونے والا ہو، ایک سنگریزے کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ اب ان دونوں جوانوں میں ایک شخص یہ سمجھ کر کہ کسی خرابی کی وجہ سے میرا اونٹ سیدھا جاتے جاتے ایک طرف کو پھر گیا ہے، میری طرف آیا لیکن دوسرا آدمی جدھر جا رہا تھا۔ اُدھر ہی اپنا اونٹ دوڑائے چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اونٹ گرا اور اس کے ساتھ وہ سوار بھی گر کر زخمی ہوا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس وقت دربار امام میں حاضر سے قاصر رہا۔ پھر یہ دونوں جوان مجھ کو یہاں لے آئے۔ گو ان سے میں کچھ پوچھ نہ سکی کیونکہ دونوں گونگے تھے لیکن یہ بخوبی ظاہر ہو گیا کہ وہ ہمارا تعاقب نہیں کرتے تھے۔ بلکہ صرف نقیب شام کے حکم کی تعمیل میں تیزی سے الموت کو آ رہے تھے۔''

شیخ نے سر ہلا کر کہا۔ ''اس کے سب کام درست ہوئے۔ اسے فوراً اپنی مالکہ کے پاس جانا چاہیے۔ تا کہ اس کے آرام کا خیال رکھے۔ ہم اس نازش فرنگ برف سے اجلی مہ

جبین پر نظر التفات رکھتے ہیں۔ یہ اس کی نادانی تھی کہ ہماری پناہ اور قربت سے اس نے پرہیز کیا اور وزیر موت! تم اب اس نئے حلف کے لئے جانے کا بندوبست کرو اور معلوم کرو کہ شہر میں کوئی نصرانی عورت قربانی کے لئے مل سکتی ہے یا نہیں۔''

اب پری اور وزیر موت دونوں ایوان سے باہر آئے اور جب وہ قلعہ کے ایک تنہا گوشے میں پہنچے۔ تو درویش نے پری سے کہا۔'' کیوں، شیخ کے قہر وغضب سے کس طرح جان بچائی ہے؟ مگر تم اور وہ تمہاری بیگم رستہ بھر مجھ سے ایسی نفرت کرتی آئی ہو کہ بیان سے باہر اور تم نے تو دانستہ مجھ کو یہ غلط صلاح دی کہ میں اس فرنگن کو پہلے شیخ کے پاس لے جاؤں اور جب میں اُسے انعام میں مانگوں گا۔ تو وہ میرے حوالے کر دی جائے گی لیکن اب تو تمہیں معلوم ہو گیا، کہ میرا مانگنا کیسا عبث ہوتا کیونکہ شیخ اسے اپنے مخصوص کر لینے کا ارادہ رکھتا ہے مگر یہ بتاؤ کہ کس ترکیب سے اُسے شیخ کے قبضے سے نکالا جائے گا۔

پری نے کہا۔'' ہمارا کام تو اب کچھ کرنے کا ہے نہیں۔ میری بیگم یا تو یونہی غم میں گھٹ گھٹ کر مر جائیں گی۔ یا کچھ کھا کر سو رہیں گی۔ لیکن شیخ کی حرم بننا وہ کبھی منظور نہ کریں گی۔''

وزیر موت نے کہا۔'' نہیں! ایسے حسینوں کی جان نہ جانی چاہیے۔ میں اس کی ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ پہلے قسم کھاؤ، کہ کسی سے کہو گی تو نہیں اور جس طرح میں کہوں گا۔ وہی کرو گی۔''

پری:'' مجھ سے جیسی جی چاہے۔ قسم لے لو۔ مجھے تو اس کی جان کی سلامتی چاہیے۔ جو کچھ کہو گے۔ اس پر راضی ہوں۔''

وزیر موت:'' اچھا، تو سنو! شیخ کی محل سرا میں کوئی نہیں جا سکتا۔ تم البتہ جا سکتی ہو، بلکہ شیخ کا حکم ہے، کہ اپنی بیگم ہی کے پاس حاضر رہو۔ اچھا۔ اب دو چیزیں ملنی ضروری ہیں۔ ایک تو کوئی چیز ایسی ہو جسے پی کر وہ بیہوش ہو جائے اور معلوم ہو۔ کہ اب زندہ نہیں ہے۔ میں اس مطلب سے حشیش دے دیتا، لیکن اس وقت وہ میرے پاس نہیں ہے، دوسرے حشیش بیہوش تو کر دیتی ہے۔ لیکن چہرے سے خون کی جھلک نہیں مٹتی۔ ایک چیز تو یہ ہوئی۔ دوسری چیز ایک ایسا صندوق چاہیے۔ جس میں نصرانی دفن کرنے کے لئے اپنا مردہ رکھتے ہیں۔ پہلے تمہیں اپنی بیگم کو وہ چیز پلانی ہو گی اور جب وہ اثر کر لے۔ تو پھر اُسے صندوق کے اندر لٹکا دینا ہو گا۔ پھر میں اس صندوق کو اُٹھا کر قلعے سے باہر لے جاؤں گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں میسر کہاں ہوں گی۔''

یہ سن کر پری کو خیال ہوا کہ بات تو کچھ ٹھیک ہے۔ ممکن ہے، اس میں تھور فریدا کی جان بچ جائے لیکن ڈر یہ ہے کہ جان بچا کر یہ وزیر موت خود اس پر قبضہ کرنا چاہے گا اور وہ بے بس ہو کر ضرور اپنی جان کھودے گی۔ اس کے ساتھ ہی پری کو یہ خیال بھی گذرا۔ کہ حسن بھی تھور فریدا کی جان بچانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس لئے درویش نے جو باتیں اس وقت کہی ہیں۔ ان کا ذکر حسن سے ضرور کر دینا چاہیے کہ وہ اس معاملے میں قاسم سے مدد لے۔ چنانچہ کہنے لگی۔ "میں نے سنا ہے۔ وہ فدائی جس نے امیر طرابلس کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ اس وقت الموت میں آیا ہوا ہے۔ اس کا نام قاسم ہے۔ وہ بڑا ہوشیار اور تدبیر کا آدمی ہے۔ یہاں کے ایک طبیب سے جس کے پاس بیہوش کرنے کی دوائیاں رہتی ہیں۔ اس کی بڑی ملاقات ہے۔ قاسم نصرانیوں کی قید میں بھی رہا ہے اور ان کے طور طریقوں سے خوب واقف ہے اور اس وقت اپنی کارگذاری سنانے کے لئے ضرور قلعے میں آیا ہوگا۔ اگر موقع ملے۔ تو اس سے ان چیزوں کے لئے ضرور کہو۔ اگر بیہوشی کی دوا مل جائی۔ تو میں وعدہ کرتی ہوں۔ کہ ضرور پلا دوں گی۔"

اتنا کہہ کر پری شیخ کی حرم سرا کو چلی گئی۔ یہ وہی اونچی عمارت تھی، جو پہاڑی درے سے آگے بڑھ کر بلندی پر واقع تھی۔ وزیر موت اب قلعہ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ قاسم ملے، تو اس سے بات کروں۔

اتفاق یہ کہ قاسم فدائیوں کا لباس پہنے ابھی ابھی قلعے میں آیا تھا۔ حسن کے گھر میں اس سے ٹکا نہیں گیا۔ عین خطروں کے منجدھار میں رہنا چاہتا تھا کیونکہ بغیر اس کے سمجھتا تھا کہ جنون ہو جائے گا۔ اس وقت اس کو اپنے باپ کا یہ کہنا یاد آیا کہ اگر بھلائی کرنے کے لئے جھوٹ بولا جائے۔ تو ایسا جھوٹ اس سچ سے بہتر ہوگا، جس سے دانستہ برائی پیدا ہوتی ہے۔ اگر شیخ سے اس وقت یہ جھوٹ بولوں کہ میں نے ریمنڈ کے لڑکے کو مارا ہے۔ تو اس جھوٹ میں تھور فریدا کے لئے بھلائی نکلتی ہے لیکن اس کا اندازہ نہیں کہ وہ بھلائی کیا ہوگی اور کیسی ہوگی۔ قاسم قلعے میں جانے کے لئے دروازے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور اسی وقت درویش اپنی تدبیر پر غور کرتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ تاریکی خاصی تھی۔ مگر پھر بھی دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ درویش نے کہا۔ "غالباً آپ قاسم بن سلیم ہیں۔" درویش اتنا سمجھ گیا کہ یہی وہ آدمی ہے، جس سے انطاکیہ کے شہر کے سامنے لڑائی کے وقت ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ زرہ اور خود پہنے تھا۔ دوسرے ہنگامہ سخت تھا۔ اس وجہ سے پہچانا نہیں گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر گھور کر کہا" یہ تو

بتایئے کہ اس شیطان قومس کے بیٹے کو کس نے قتل کیا تھا؟'' قاسم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ درویش اب بالکل قریب آ کر چپکے سے بولا۔ ''آپ کو ہماری تعلیم کے راز و رموز معلوم کرنے کا بے حد شوق ہے۔ میں داعیان الموت کا سب سے بڑا آدمی ہوں۔ جس کا لقب وزیر موت ہے۔ آپ جن باتوں کو تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس میں آپ کی مدد کروں گا اور اس کے عوض میں جو امداد مجھے آپ سے درکار ہے، وہ بہت قلیل ہے۔''

قاسم نے جواب دیا۔ ''آپ میری مدد کیونکر کر سکتے ہیں اور مجھ سے جو مدد آپ کو درکار ہے، وہ کیا ہے؟''

وزیر موت: اگر میں شیخ کو یہ امر باور کرا دوں کہ قومس کے نوجوان بیٹے کو آپ ہی نے قتل کیا ہے۔ تو آپ ہمارے طبقے کی تعلیم میں درجہ بدرجہ ترقی کرتے چلے جائیں گے اور اخیر میں ہمارے جملہ اسرار سے واقف ہو جائیں گے۔ اگر یہ منظور ہے۔ تو جو کچھ میں کہوں۔ اس پر آمادہ ہو جایئے۔ پھر شیخ الجبل کے سامنے آپ جو کچھ کارگذاری اپنی بیان کریں گے۔ اس کی تصدیق کرتا جاؤں گا لیکن اگر آپ نے میری بات نہ مانی۔ تو میں امام کو یقین دلا دوں گا۔ کہ قومس کے بیٹے کے قاتل آپ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرا شخص ہے اور آپ کے سپرد جو خدمت ہوئی تھی۔ آپ اس کو انجام نہیں دے سکے۔ اس میں آپ کی سخت بے عزتی ہوگی اور آپ کو سخت سزا بھی دی جائے گی۔''

قاسم نے کہا۔ ''تو پھر آپ مجھ سے کیا کیا چاہتے ہیں؟''

درویش نے کہا۔ ''سنتا ہوں کہ اس شہر میں آپ کا کوئی دوست ایوب نامی ہے۔ دیکھئے مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ میں آپ کی دلی خواہش سے بھی واقف ہوں۔ آپ کے دوستوں کو بھی جانتا ہوں اور آپ کے کاموں کا بھی علم رکھتا ہوں۔ اس لئے آپ احتیاط کو ملحوظ رکھیں۔ اچھا، تو یہ آپ کا دوست ایوب بڑا طبیب حاذق ہے۔ آپ اس سے کوئی ایسی دوا حاصل کریں، جس کو پی کر انسان بیہوش ہو جائے اور ایسا معلوم ہو کہ وہ مر گیا ہے۔ ایک فرمائش تو یہ ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نصرانیوں میں رہے ہیں۔ ان کے طریقوں سے خوب واقف ہیں۔ ذرا جا کر آپ صندوق ایسا لایئے۔ جس میں یہ کافر مردہ رکھ کر دفن کیا کرتے ہیں اور اس صندوق پر وہ نشان بھی ہونا چاہیے۔ جس کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں؟''

قاسم نے سوچا کہ کوئی شخص کسی کو اپنی دولت نہیں دیتا۔ تاوقتیکہ اس کا کوئی بڑا کام نہ

اٹکا ہو۔ حسن بہت ہوشیا اور دور اندیش ہے، جو کچھ تدبیر اس نے سوچی ہے۔ وہ مجھے پورے طور پر نہیں معلوم لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ درویش بھی اسی فکر میں ہے، جس فکر میں حسن ہے۔ اتنا سوچ کر قاسم نے درویش سے کہا ''میں تو امام عالی مقام کی خدمت میں یہی عرض کرنے جا رہا تھا کہ جو کام میرے سپرد ہوا تھا۔ اس کی تعمیل کر کے واپس آیا ہوں۔''

درویش نے کہا ''اچھا تو اب جائیے، جو چیزیں میں نے بتائی ہیں۔ وہ لے آیئے اور میں شیخ کے پاس جا کر عرض کرتا ہوں کہ آپ شام سے واپس آ گئے ہیں اور جو کچھ اپنے کام کی نسبت بیان کرنے والے ہیں، وہ بیان بالکل صحیح ہے۔ جب وہ دونوں چیزیں آپ لے آئیں تو یہیں قلعہ میں آپ مجھ سے ملیں۔''

قاسم یہ سن کر چلا مگر وہ ایوب کے گھر نہیں گیا۔ بلکہ قلعہ ہی میں ایک مکان میں پہنچا۔ جہاں بہرام رہتا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی دیکھا کہ ایک بہت بڑا اسپید انڈا چھت سے کمرے کے بیچ میں لٹک رہا ہے۔ ایک طرف گوشے میں آدمی کا ایک ڈھانچہ رکھا ہے۔ دیواروں پر آفتاب و ماہتاب کی علامتیں نقش ہیں۔ میزوں پر چھوٹے بڑے قرابے جن میں رنگ برنگ کے عرق بھرے ہیں اور ٹوکریوں میں جڑی بوٹیاں رکھی ہیں۔ ایک طرف انگیٹھیاں اور عرق کشی کے شیشے اور آلات چنے ہیں۔ قاسم کو دیکھ کر بہرام اٹھا اور پشت کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''دیکھئے میں نے صندوق کا مع اس نقش کے جسے عیسائی پوجتے ہیں۔ انتظام کر لیا ہے۔ حسن نے کہا۔ کہ اسے تیار کرا کے اپنے ہی کمرے میں رکھوں تاکہ ضرورت کے وقت فوراً کام آ سکے۔ اسی صندوق میں تمہارا اعرابی لباس رکھا ہے۔ تاکہ ضرورت ہو، تو اسے پہن سکوں۔ لیکن تم خود اپنی جان پر کھیل کر یہاں شیر کے منہ میں چلے آئے ہو۔ ہائے کاش! میں آج نیشاپور کے باغوں میں غزل خواں ہو کر مئے عشرت کا جام پیتا ہوتا اور اس عذاب میں نہ ہوتا کہ ان سیاہ کاروں کے جرائم زہر خوارانی کے لئے اپنے ہاتھ سے زہر تیار کیا کروں۔''

قاسم نے چپکے سے کہا۔ ''میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ ممکن ہو، تو تھور فریدا کی جان بچاؤں۔ حسن نے جو تدبیر سوچی ہے اس کا نتیجہ اچھا نکلتا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بد بخت تودۂ نجاست وزیر موت کو بھی اسی قسم کے صندوق کی ضرورت ہے۔ جس طرح کا حسن نے اپنے خط میں بیان کیا تھا اور اس کو ایک ایسی دوا کی بھی تلاش ہے، جس کے پینے سے زندہ آدمی مردہ معلوم ہونے لگے۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ درویش بھی کوئی چال ایسی چل رہا ہے۔ جس سے شیخ الجبل

کے قبضے سے تھور فریدا کو نکال لے۔ اگر اس کا یہ قصد ہیں۔ تو گویا ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ اسی کی تائید میں وہ بھی ہے بشرطیکہ اس کی تدبیر کو اُلٹ کر ہم اپنے نفع کی صورت پیدا کر لیں۔"

بہرام نے کہا۔ "یہ اچھا بھی ہے اور ایک طرح برا بھی ہے کیونکہ عورت جس کا نام ہے، وہ اگیا پیال سے کم نہیں ہوتی۔ اپنی چمک دکھا دکھا کر لبھاتی ہوئی کچھ دُور لے جا کر دلدل میں دھکا دے دیتی ہے۔ اگر اس معاملے میں ہمارا ذرا سا بھی لوث معلوم ہو گیا۔ تو پھر شیخ ہم سب کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جائے گا کیونکہ نافرمانی کی سزائیں وہ مجھ سے پہلے ہی بیان کر چکا ہے۔" یہ کہہ کر بہرام نے سب شیشیوں سے تھوڑی تھوڑی دوا نکالی اور ایک پیالی میں ان کو آمیز کر کے کہا۔ "لیجئے، یہ وہ دوا ہے۔ جو طاقتور سے طاقتور کو بھی بے ہوش کر دے گی اور معلوم ہو گا کہ وہ مردہ پڑا ہے۔ اس کے پیتے ہی حس و حرکت یک لخت زائل ہو جائے گی۔ حضرت اسرافیل بھی اگر تشریف لا کر اس کے کان میں اپنا صور پھونکیں گے۔ تو بھی کچھ اثر نہ ہو گا۔ تا وقتیکہ دوا کا اثر خود زائل نہ ہو جائے یا میں دوسری دوا نہ دوں، نہ ہوش آئے گا اور نہ چہرے سے موت کی زردی دور ہو گی۔"

اُنیسواں باب

اُدھر تو بہرام بیہوشی کی دوا قاسم کے حوالے کر رہا تھا، اِدھر وزیر موت شیخ الجبل کے سامنے اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ امیر طرابلس کے جوان بیٹے کو قاسم ہی نے قتل کیا ہے اور اس واقعہ کی صحت میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں۔ زبان سے تو یہ کہتا تھا۔ مگر دل میں قاسم کی تباہی چاہتا تھا۔ کیونکہ ڈر یہ تھا کہ اگر تھور فریدا کو ذرا سا بھی ضرر پہنچا تو قاسم جو ایک نوعمر شریف زادہ طبیعت کا سچا اور سیدھا تھا، فوراً وزیر کا سارا بھید شیخ پر ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ شیخ سے کہنے لگا۔ کہ ''اس میں شک نہیں کہ یہ قتل قاسم نے کیا ہے، اور بہت ہی خوبی سے کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ اعتماد کے لائق آدمی نہیں ہے۔ کیا یہ بچہ اس شیرینستان کا نہیں ہے۔ جس کا نام سلیم بن طاہر ہے، جو سلطنت عباسیہ کا رکن رکین اور ہمارا دشمن ہمیشہ کا چلا آتا ہے۔ قاسم کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے باپ کو مار ڈالے۔ اس کو اس کا موقع ہر طرح سے حاصل ہو سکتا ہے اور اپنے باپ کو قتل کرنے کے بعد وہ سوائے ہمارے کسی دوسرے کا نہیں رہے گا۔ اس کی زندگی بھی، پھر اسی طرح کٹے گی جیسے ہماری زندگی کٹتی ہے اور ایک زبردست دشمن سے بھی جو باطنیوں کے ارادوں اور کاموں میں ہمیشہ مزاحم رہا ہے، نجات مل جائے گی۔''

شیخ نے کہا۔ ''تمہاری صلاح بہت معقول ہے۔ ہم تو اسی زمانہ سے جب سے وہ ہمارے قابو میں آیا تھا، یہی سوچتے تھے۔ ورنہ شروع ہی میں جاسوسی کے جرم میں وہ کبھی کا ہلاک کر دیا گیا ہوتا۔ لیکن جو کام تم بتا رہے ہو۔ یہ ذرا نازک بات ہے۔ نیکی اور اخلاق کی اس کو تعلیم ملی ہے اور اپنے باپ سے اس کی بہت محبت ہے۔''

یہ سن کر وزیر موت نے ایک تجویز اور پیش کی اور یہ تجویز اس نیت سے تھی کہ قاسم آخر کار اس کے بس میں آ جائے اور وہ اسے ہلاک کر دے۔ شیخ سے کہنے لگا۔ ''یہ حضور نے بجا فرمایا کہ اس کی تعلیم و تربیت شریعت کے مطابق ہوئی ہے اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ جب وہ

کسی بات کی قسم کھائے گا۔ تو اس کا ہمیشہ پابند رہے گا۔ پس اگر شیخ جبل پہلے تو اس بات کی قسم اس سے لیں کہ وہ اپنے باپ کو قتل کرے اور اس کے ساتھ ہی دوسری قسم اس بات کی لیں۔ کہ اگر اپنے باپ کو قتل نہ کر سکے۔ تو قلعہ الموت میں واپس آ کر سزائے موت برداشت کرے۔ اس صورت میں اس کو اپنے باپ کے قتل کر دینے میں تامل نہ ہوگا۔''

شیخ الجبل نے کہا۔ ''منظور۔ جاؤ، قاسم کو حاضر کرو۔'' وزیر موت ایوان سے باہر گیا۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ قاسم اس سے ملا، اور کہنے لگا۔ ''لیجئے یہی وہ دوا ہے۔ جس کی آپ نے فرمائش کی تھی اور صندوق بھی جیسا آپ نے کہا تھا، تیار ہے۔''

وزیر موت نے دوا کی شیشی قاسم کے ہاتھ سے لے لی اور قاسم سے اتنا کہہ کر کہ آپ یہاں توقف کریں۔ خود ایک جگہ گیا۔ جہاں پری موجود تھی۔ شیشی اُسے دے کر قاسم کے پاس آیا۔ شیخ اس وقت جماعت خانہ میں جو جلسہ شب کو ہونے والا تھا۔ اس کے متعلق حکم احکام جاری کر رہا تھا۔ درویش اور قاسم کو ایوان کے باہر انتظار کرنا پڑا۔ دونوں خاموش پاس پاس بیٹھے تھے مگر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی خصومت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کار وہ ایوان میں بلائے گئے۔ قاسم اندر گیا اور اب پھر وہی تمام منظر پیش نظر ہوا۔ جو پہلے دیکھ چکا تھا۔ شیخ الجبل مسند زرنگار پر اسی شان سے بیٹھا تھا۔ دروازوں پر وہی ریشمین پردے پڑے تھے۔ چینی کے ظروف اسی طرح جا بجا آراستہ تھے۔ وہی گلابوں کے حاشیئے والا قالین جس کا متن دھانی رنگ کا تھا اور اس پر کہیں کہیں نرگس کے زرد پھول تھے، بچھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کتاب اور کتاب کے پاس ایک خنجر رکھا تھا۔ شیخ نے قاسم کی طرف غور سے دیکھا اور کہا ''فرزند ارجمند! یہ کلمہ اس لئے ہم نے کہا۔ کہ تمہاری عزت افزائی ہو، سنو فرزند! جو کام ہم نے تمہارے سپرد کیا تھا۔ اس کو تم نے بہت خوبی سے انجام دیا۔ فرقہ باطنیہ پر اس وقت اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے۔ بڑے بڑے صید افگن عقاب پنجوں میں شکار دبوچے چار دانگ عالم سے اُڑتے ہوئے ہمارے اس آشیانے میں آ رہے ہیں۔ ہم نے تمہارے لئے ایک بیش قدر انعام تجویز کیا ہے۔ اب صرف ایک کام تم سے لینا اور ہے اور تمہارے موجودہ درجہ تعلیم میں یہ کام جو ہم تم سے لینے والے ہیں۔ نہایت عظیم الشان ہوگا۔ جب اسے انجام دے لو گے۔ تو مدارج اعلیٰ میں تمہیں ترقی دی جائے گی۔ جہاں پہنچتے ہی تم پر ہمارے طبقے کے تمام اسرار اور رموز آشکارا ہو جائیں گے۔ وہ کام کیا ہے؟ یہ تم کو اس وقت بتایا جائے گا۔ جب اس کی تعمیل کے لئے تم یہاں سے روانہ کئے جاؤ گے۔ اس وقت

سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ تم کو ایک قسم اور قسم بھی نہایت زبردست اس بات کی کھانی ہوگی کہ تم اس کام کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرو گے۔''

اتنا کہہ کر جو کتاب پاس رکھی تھی۔ اسے اٹھالیا، اور قاسم کے ہاتھ پر اُسے رکھ کر کہا۔

''اب تم اس کتاب پر قسم کھاؤ کہ یہ تیسرا کام جو ہم تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ اسے بجالاؤ گے اور جس شخص کے قتل کا حکم دیا جائے گا۔ اسے ضرور قتل کر دو گے لیکن یہ کام سخت دشوار ہوگا۔ اس لئے اس بات کی بھی قسم کھاؤ۔ کہ اس قت کے لئے تم اپنا دل مضبوط کر لو گے۔ قسم کھاؤ کہ اگر اپنی قسم سے تم پھرے یا تمہارے اعضاء اور تمہارے دل نے اس کے ایفاء سے انکار کیا اور جس بات کی قسم کھا چکے ہو، اس کو انجام دینے سے قاصر رہے۔ تو تم فوراً یہاں واپس آ کر اپنے تیئں وزیر موت کے حوالے کر دو گی اور اپنی قسم پوری نہ کرنے کی سزا میں ایسی موت مرنا قبول کرو گے۔ جس کی تکلیفوں اور ایذاؤں کی تفصیل صرف وزیر موت کو معلوم ہے۔''

قاسم نے یہ خیال کر کے آئندہ جو کچھ بھی ہو۔ اس وقت تو باطنیوں کے تمام راز و اسرار معلوم ہو جائیں گے۔ شیخ نے جس طرح کہا، قسم کھالی۔ قاسم کو اس وقت حسن کا یہ کہنا بھی یاد آیا کہ کسے معلوم ہے کہ جس کتاب پر قسم لی جاتی ہے، وہ درحقیقت قرآن پاک ہے۔

کتاب پر قسم کھا کر قاسم نے اوپر دیکھا۔ شیخ کی نگاہیں ایسی تیز نظر ہوئیں کہ گو بادل میں گھس کر اس کا اصلی حال معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ شیخ نے کہا ''بہتر ہے کہ اپنا اطمینان کر لو۔ کہ یہ کتاب جس پر تم نے قسم کھائی ہے۔ وہی صحیفہ ہے، جو انسان کو اس کے ہر قول و اقرار کا پابند کر دیتا ہے یا کوئی دوسری چیز ہے۔ کتاب کو کھولو، اور دیکھو۔''

قاسم نے کتاب کھولی تو معلوم ہوا۔ فی الواقع وہ قرآن پاک ہے۔ ورق جو کھلا تھا۔ اس پر ایک آیت پڑھی۔ جس میں مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ جب وہ خدا کے سامنے مثل گواہ کے حاضر ہوں تو کوئی چیز ان کو اس بات کی ترغیب نہ دے کہ جن لوگوں سے انہیں نفرت وخصومت ہو ان کے ساتھ عدل میں کوتاہی کریں۔ قاسم حیرت سے شیخ الجبل اور اس کے ندیم خاص وزیر موت کو دیکھتا تھا۔ ان دونوں سے اُسے نفرت تھی۔ لیکن قرآن کھولتے ہی اس آیت کا نکلنا ایک معجزہ معلوم ہوا اور خیال ہوا کہ اس قسم میں خدا کے سامنے مثل گواہ کے حاضر ہو چکا ہوں۔ ان دونوں آدمیوں سے جو اس قسم کا باعث ہوئے ہیں۔ خواہ مجھے کتنی ہی نفرت اور عداوت ہو۔ لیکن اس قسم کے ساتھ عدل کرنا ضروری ہے یا تو اس قتل کا مرتکب ہوں یا اگر بن نہ پڑے تو واپس آ کر

مقررہ سزا برداشت کروں۔"

شیخ الجبل نے قاسم اور وزیر موت کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ سلام کر کے چلنے کو ہوئے۔ تو شیخ نے کہا۔ "ٹھہرو! ہمارے نقیب شام نے جس نئے طرز حلف کے لئے لکھا ہے۔ اس کی بابت کیا بندوبست ہوا۔ شب کا جلسہ شروع ہونے میں اب تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ قربانی کے لئے کوئی کافر عورت تم کو ملی یا نہیں؟"

بچو! میں نہیں کہہ سکتا کہ وزیر موت اس سوال کا جواب کیا دیتا۔ کیونکہ اس وقت زینے سے کسی کے دوڑ کر اوپر آنے کی آواز آئی اور ایک خادم بالکل خوف زدہ حواس باختہ اندر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے حسن تھا۔

شیخ الجبل نے نہایت ناخوشی اور عتاب کی نظر سے حسن کو دیکھتے ہی کہا۔ "اس طرح بے تحاشا یہاں گھسے چلے آتے ہو۔" خادم نے قدمبوسی کے بعد عرض کیا۔ "یا امام! حرم سرائے میں ایک سخت سانحہ پیش آیا ہے۔ وہ حسین فرنگن جو مستورات میں گوہر شب چراغ مانی جاتی تھی۔ دفعتاً سخت علیل ہو گئی ہے اور اب اس کی زبان بند ہے۔"

یہ خبر سن کر شیخ الجبل کی پیشانی پر شکن پڑے اور چہرے کا رنگ تاریک ہو گیا اور جس طرح دور دور کی پہاڑیوں پر آگ کے الاؤ روشن کر کے دشمن کی آمد کی اطلاع دی جاتی ہے اور اس اطلاع کے ساتھ تباہی کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح شیخ کی آنکھیں چمک کر مصیبت اور غارتگری کی خبر دینے لگیں۔ ایک دفعہ ہی چیخ کر بولا۔ یہ کیسی خبر ہے۔ علالت کا کیا باعث ہوا؟"

خادم نے کہا۔ "کون بتا سکتا ہے؟ خدام حرم طبیب نہیں ہیں۔ اس فرنگن کی خادمہ نے یہ خبر ہم کو سنائی ہے اور اس کے ساتھ ایک چیز بھی دی ہے۔" اتنا کہہ کر خادم نے سونے کی ایک انگشتری پیش کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں پہلے ایک بڑا عقیق جڑا ہوا تھا۔ مگر دراصل وہ عقیق نہ تھا۔ باریک شیشے کا ٹکڑا تھا، جو نیچے سے خالی تھا۔ اس وقت یہ شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔

اس انگوٹھی کو دیکھتے ہی وہ مکار و دغاباز وزیر موت کہنے لگا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگشتری سے زہر نکال کر کھا لیا۔ یہ نہ سمجھی، کہ کیا کیا مسرتیں آئندہ اس کو میسر ہونے والی تھیں۔ مفت میں جان کھو دی۔"

شیخ نے حکم دیا۔ کہ فوراً کسی طبیب حاذق کو بلا کر دکھایا جائے۔ لیکن آدمی معتبر ہونا چاہیے۔

حسن نے کہا۔ "شہر میں ایک بڑا طبیب رہتا ہے۔ وہ بڈھا آدمی ہے اور نہایت متقی و

پرہیزگار ہے۔اس کا نام ایوب ہے۔''

شیخ نے غصے سے جواب دیا۔''میں اسے جانتا ہوں لیکن شہر سے یہاں تک اس کے آنے میں دیر ہوگی۔ برخوردار! تم کو ہر علم وفن میں یدطولیٰ حاصل ہو چکا ہے۔ پھر تم کیوں کوئی سود مند علاج نہیں کرتے؟''

حسن نے جواب دیا کہ''فدوی طبیب نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ایوب کو بلایا جائے۔ حضور کے دربار کا مشہور کیمیا ساز بہرام بن عبداللہ بھی یہاں حاضر ہے۔ جب تک طبیب حاضر ہو، بہرام مریضہ کی خبر رکھے۔''

شیخ کو اور غصہ آیا، اور تیز ہو کر بولا''بہرام! وہ نالائق تو پکا عیاش اور شراب خوار ہے۔ اس کے برے اعمال اور نامعقول اشعار تو شہر شہر مشہور ہیں۔ حسن کیا تم دیوانے ہو گئے ہو، کہ ہماری حرم سرا میں ایسے آدمی کے جانے کا مشورہ دیتے ہو؟''

اس پر حسن نے کہا۔''تو پھر مریضہ کو اٹھا کر یہاں سے لے آنا چاہیئے۔ بہرام کو قصر میں ایک کمرہ ملا ہوا ہے۔ جہاں سنتا ہوں کہ وہ دوائیاں تیار کرتا ہے۔ سحر کے بعد عمل بھی کرتا رہتا ہے۔ مریضہ کو اس کے کمرے میں لایا جائے۔ جہاں علاج کے لئے ہر طرح کا سامان موجود ہے۔''

شیخ نے اس رائے کو پسند کیا۔ حسن اور شامی فدائی کو حکم دیا گیا کہ دونوں حرم سرا میں جا کر تھور فریدا کو بہرام کے کمرے میں لے آئیں کیونکہ ان دونوں کی نسبت شیخ سمجھتا تھا۔ کہ وہ حرم سرا میں داخل ہونے کے لائق ہیں۔

حسن نے عرض کیا۔''حضور کے احکام ہمیشہ عقل پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کی تعمیل ہمارا فرض عین ہے۔ دوسرا شامی فدائی بھی اب کسی قدر تندرست ہو گیا ہے اور شہر سے قلعہ میں حاضر ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ بھی مریضہ کو یہاں لانے میں ہماری مدد کرے۔''

اب حسن اور وہ خادم جو خبر لایا تھا، جلدی سے باہر چلے گئے۔

وزیر موت نے یہ سمجھ کر کہ تھور فریدا پر اپنے عیش کے لئے قبضہ کرنے کی جو چال چلی تھی، اس میں کامیابی کی صورت نظر آنے لگی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ قاسم کو اس شہر سے بلکہ اس دنیا سے چلتا کرے کیونکہ اس کی طرف سے اندیشہ ہے کہ تھور فریدا کی علالت کا باعث شیخ پر ظاہر کر دے گا۔ شیخ کے قریب حاضر ہوا اور اس کے کان میں کوئی بات کہی۔ شیخ نے سن کر گردن ہلائی اور قاسم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔''تم نے ابھی ایک کام انجام دینے کے لئے قسم کھائی ہے۔ میں

نے اس کام کی نسبت کہا تھا۔ کہ تمہیں وہ اس وقت بتایا جائے گا۔ جب اسے انجام دینے کا وقت قریب ہوگا۔ اب وہ وقت آ گیا ہے اور باطنیوں کی خیر و سلامتی کے لئے اب اس کام کا انجام دینا ضروری ہے۔ اس لئے اب دیر نہ ہونی چاہئے۔ تم اسی وقت بغداد کو روانہ ہو جاؤ اور وہاں اپنے گھر پہنچ کر اپنے باپ سلیم بن طاہر کو قتل کر دو۔ بس یہی وہ کام ہے اور یہی ہمارا حکم ہے لیکن اگر تم اس کام کو نہ کر سکو۔ تو دوسری قسم جو تم نے یہاں واپس آنے کی کھائی ہے۔ اس پر عمل کرو اور خدا ایسا نہ کرے کہ تم یہاں واپس آنا پسند کرو کیونکہ پھر تم کو اس زندگی میں جہنم کے عذاب اٹھانے پڑیں گے اور نہایت سخت موت مرنے کے بعد بھی جہنم ہی میں رہنا پڑے گا۔ جاؤ اور اس کام کو باطنیہ کے نفع اور فائدے کے لئے انجام دو اور نہ صرف باطنیہ کے نفع کے لئے بلکہ اس زندگی میں اور نیز حیات بعد الموت میں اپنی نجات کے لئے ہمارے حکم پر عمل کرو اور اس بات کو نہ بھولو کہ صرف اس کام کو انجام دے کر تم ہمارے طبقہ ناجیہ کے اسرار اور رموز معلوم کر سکتے ہو۔ جن کے تم نہایت مشتاق ہو۔"

قاسم اتنا سن کر پتھر کا ہو گیا، نہ شیخ کی بات کا جواب دیا، اور نہ اس کے سینے میں خنجر بھنکا۔ اس ظالم و بے درد انسان کی سنگ دلی پر کہ کس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ قاسم کا دل سُن ہو گیا۔ چپ چاپ ایوان سے باہر نکلا اور ایسا نکلا کہ اس کے ریشمین پردے، چینی ظروف، سونے کا چراغ دان، گل بوٹوں کا قالین اور اس خونی آشیانے میں اس کرگس مردار خوار یعنی شیخ ستمگار کی صورت پھر کبھی نہ دیکھی۔

رات ہو گئی تھی۔ قاسم اس طرح چل کر جیسے کوئی عالم خواب میں ہو، بہرام کے کمرے میں آیا۔ شاید بہرام سے وہ ذکر کرتا کہ کیسی بے دردی کا حکم اس کو ملا ہے لیکن اندر پہنچتے ہی بھاری بھاری قدموں کی آواز باہر سے آئی، دیکھا تو حسن اور بن ریمند، تھور فریدا کو اٹھائے لاتے ہیں۔ سارا جسم سفید چادروں میں لپٹا ہوا ہے اور ایک سفید رومال سنہری بالوں پر اس طرح بندھا ہے کہ بال اس میں چھپ گئے ہیں۔ آسمان گوں آنکھوں پر پپوٹے ڈھک دیئے گئے ہیں اور رخسار اس قدر سفید ہو گئے ہیں جیسے تازہ گری ہوئی برف کا رنگ ہو، صورت بالکل مردوں کی سی ہے۔

حسن نے چپکے سے کہا۔ "دوا اپنا اثر کر چکی ہے۔ یہاں اس لئے لا رہے ہیں کہ شیخ کو امید ہے کہ تم اسے اچھا کر دو گے۔ ایوب بھی بلایا گیا ہے۔ مریض کو دیکھ کر اس کے مرنے کی اطلاع دینی ایوب کا کام ہوگا۔"

قاسم نے کہا۔ ''ایوب تاوقتیکہ اپنا پورا اطمینان نہ کرلے گا، کسی بات کی اطلاع نہ دے گا۔'' تھور فریدا کی صورت دیکھ کر قاسم کا قلب جو بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ پھر اپنا کام کرنے لگا۔ مگر اس کو یقین نہ آتا تھا۔ کہ تھور فریدا کا شمار ابھی تک زندوں میں ہے۔ قاسم اب ہمہ تن فکر میں ہوا کہ جس طرح ہو، اس کی جان بچائی جائے۔

حسن نے پریشان ہو کر کہا۔ ''کیا ایوب تمہارا دوست نہیں ہے۔ اب وقت بات کرنے کا نہیں رہا۔'' یہ کہنا تھا کہ دروازہ کھلا اور وزیر موت اندر آیا۔ تھور فریدا کی صورت غور سے دیکھنے لگا۔ شیخ نے حکم دیا تھا کہ خود جا کر دیکھے کہ جس کو مریض بیان کیا گیا ہے، وہ فی الواقع تھور فریدا ہے یا کوئی دوسرا ہے۔ وزیر نے مریضہ کی صورت دیکھ کر کہا۔ 'واقعی جان اب نہیں ہے۔ میں شیخ کو اطلاع دینے جاتا ہوں کہ تھور فریدا گذر گئی۔''

وزیر موت جلدی سے باہر آیا لیکن اور لوگ بالکل خاموش مگر حالت اضطراب میں تھور فریدا کو دیکھتے رہے۔ حسن نے کہا کہ ''والد اس وقت غصے کی حالت میں سب لوگوں سے بدگمان ہو رہے ہیں۔ وہ ضرور خود یہیں آ کر ہم سے سوالات کریں گے۔''

قاسم نے کہا۔ ''مجھے تو شیخ نے حکم دیا ہے کہ الموت سے فوراً چلے جاؤ۔''

اس پر حسن نے کہا۔ ''یہ اور مشکل پیدا ہوئی۔ پھر جلدی کرو۔ فدائی کا لباس جو پہنے ہو۔ فوراً اتار کر عربی کپڑے پہن لو، تاکہ یہاں کے لوگ تم کو شام کا فدائی سمجھنے لگیں۔''

قاسم نے فوراً یہی کیا۔ عربی لباس پہن کر ایک طرف گوشہ میں جہاں روشنی بالکل نہ پڑتی تھی اور اس کا چہرہ نظر نہ آ سکتا تھا، جا بیٹھا۔

دروازے کے باہر قدموں کی آواز پھر آئی۔ ایوب جسے مریض کے دیکھنے کو بلایا گیا تھا۔ اندر آیا۔ جس وقت اس نے رخساروں کو دیکھا کہ ان پر خون کی کوئی علامت نہیں ہے اور باقی چہرے پر بھی زردی کھنڈی ہے۔ تو بہرام سے اس نے چند سوالات کیے۔ بہرام نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ بہت دیر میں یہاں پہنچے، مریض کا انتقال ہو چکا ہے۔ زہر اس کے پاس کہیں پوشیدہ تھا۔ وہ اس نے کھا لیا اور یہی باعث موت ہو گیا۔ ایوب کے مزاج میں احتیاط بہت تھی۔ جھک کر نبض دیکھنی چاہی لیکن تھور فریدا کے ہاتھ چادر کے اندر تھے۔ ایوب چادر میں ہاتھ ڈال کر نبض دیکھنی چاہتا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور شیخ الجبل کمرے میں داخل ہوا۔ حسن اور پری آ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور ان کے پیچھے بہت سے خادم تھے۔ جن کے ہاتھ میں مشعلیں تھیں۔

شعلوں کی سرخ روشنی کبھی تیز کبھی ہلکی کمرے کے تاریخ حصوں میں تڑپتی اور تلملاتی نظر آتی تھی اور تھور فریدا کے مردہ چہرے پر اس کی شعاعیں رقص کرتی تھیں۔ اتنا دیکھتے ہی کہ طبیب اس حسین صورت پر جھکا کھڑا ہے۔ شیخ نے کڑک کر کہا۔ ''خبردار کوئی ہاتھ نہ لگائے۔'' ایوب سہم کر دور جا کھڑا ہوا اور سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اب شیخ نے قریب آ کر تھور فریدا کا چہرہ دیکھا اور آہ بے اختیار زبان سے نکلی۔ ہاتھ سے آنکھوں کو ڈھک کر نہایت غمگین آواز میں کہا۔ ''بس خاتمہ ہوا۔'' بہرام نے بھی کہا کہ ''خاتمہ ہوا۔''

شیخ اسی طرح کھڑا رہا۔ ہاتھوں میں جو آنکھوں پر رکھے تھے۔ عجیب طرح کی حرکت تھی اور سب لوگ بھی بالکل خاموش تھے اور خوف کے مارے سب کی بری کیفیت تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کچھ دیر کے بعد شیخ نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور ایسے لہجے میں بولا، جس میں غصہ تو نہیں لیکن آواز میں سختی تھی۔ ''اس طرح غارت ہو جاتی ہیں دنیا کی مسرتیں۔ افسوس یہ نازنین دنیا سے چل بسی۔ اس کی لاش صندوق میں رکھ دو اور صندوق کو کیلیں جڑ کر بند کر دو۔ تاکہ موت کے بعد بھی اس کی صورت کوئی نہ دیکھ سکے۔ دیر نہ کرو۔ فوراً صندوق میں رکھ دو اور صندوق جماعت خانہ میں لا کر رکھا جائے۔ یہ اتفاق تھا کہ ایک عورت قربانی کے لئے اس وقت مل گئی۔ ہمارا تعلق جو کچھ ہو، مگر وہ کافر تھی۔ اور کافر کے لئے مرنے کے بعد دوزخ کے ساتویں طبقے کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں۔ ہماری خواہش ہے۔ کہ جس وقت مُردوں کے اٹھانے کے لئے اسرافیل اپنا صور پھونکیں۔ تو اس جسم حسین کا ایک ذرہ بھی اس وقت موجود نہ ہو۔ تاکہ جو صورت ہم سے، جو مظہر انور حقیقت ہیں۔ اس وقت جدا ہوئی ہے۔ پھر اپنے جسد خاکی میں ظاہر نہ ہو۔ یہ کہہ کر اس نے خوف زدہ مشعل برداروں کی طرف دیکھا۔ جو شیخ کے پیچھے کھڑے تھے اور ان سے کہا کہ ''جاؤ، شہر کے دروازے سے باہر ایک اونچی چتا تیار کرو اور جس وقت کل رسوم ادا ہو جائیں۔ تو اس صندوق اور اس تن نازک کو چتا پر رکھ کر آگ لگا دو، سب کو جلا کر خاک سیاہ کر دو اور پھر صرصر اور نسیم اس کی خاک کے ذروں کو اُڑا کر ایسا بے نشان کر دے گی کہ فرشتے بھی خشک و تر کو چھان ماریں گے۔ مگر ایک ذرہ بھی کسی کو نہ ملے گا۔ اب کمرے میں جو لوگ موجود تھے۔ ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ اُٹھائے اور کہا ''یہ عورت نہ تھی۔ سوسن کا نازک سپید پھول تھی۔ چپ تھی، اور حیرت انگیز تھی۔ دنیا میں اس لئے آئی تھی کہ موجب مسرت ہو اور تنہائی میں باعث راحت ہو مگر وقت نہ آیا اور پھول مرجھا گیا۔ ہم نے اسے دیکھا اور دل سے بھلا دیا۔

جنہوں نے نہیں دیکھا۔ کبھی نہ دیکھیں گے کہ دیکھ کر پھر یاد کرنا پڑے۔ بس اب اُسے اٹھا کر چتا پر رکھ دو۔ لے جاؤ، جلا دو، پھونک دو، خاک کر دو۔"

امام کے محمد دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے ہوس ناکام اور عزم جفا کی ایک ہولناک تصویر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن انہی شدید جذبات کی تہ میں دل سے ایک آہ بھی اس طرح نکلتی تھی۔ جیسے کسی آفت رسیدہ کی نحیف اور دردناک آواز طوفان رعد و باراں کے شور میں بھی کبھی کبھی واضح ہو جاتی ہے۔ شیخ مُڑا اور چلا۔ مشعلوں کی روشنی بھی اس کے ساتھ ساتھ دیواروں سے اُتر کر غائب ہو گئی۔

ایک خادم دروازے پر رہ گیا اور اُس نے کہا۔ "آپ صاحبوں نے شیخ کا حکم سن لیا۔ اب میت کو صندوق میں رکھ کر کیلیں جڑ دیجئے اس کی خادمہ ہاتھ بٹانے کو موجود ہے لیکن کوئی شخص اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میں ابھی اپنے ساتھیوں کو لا کر تابوت کو جلسہ کے کمرے میں پہنچائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر خادم نے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں جتنے آدمی تھے۔ ان کو گن لیا۔ اس کے بعد چلا گیا۔ اب پری اندر آئی۔ اس کے چہرے پر بے انتہا خوف تھا۔ ایک لمحے تک سب لوگ یعنی حسن۔ ابن ریمند۔ بہرام اور پری میت کے گرد خاموش کھڑے رہے۔ پری نے کہا۔ "نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ میری بیگم کو کوئی جلا دے۔ ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ خدا کا واسطہ اسے یہاں سے کسی طرح واپس لے چلو، کہ اس کی جان بچے۔"

حسن نے کہا۔ "یہاں سے باہر لے جانا غیر ممکن ہے۔ میں نے جو بات سوچی تھی۔ وہ بگڑ گئی۔ وزیر موت ممکن ہے۔ اس کی جان بچا لے مگر یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ شیخ کے خادم جس طرح انہیں حکم ملا ہے، وہی کریں گے۔ وزیر ان پر کوئی اختیار نہیں ہے اور اگر اس وزیر نے اس کی جان بچا بھی لی۔ تو پھر وہ ایک ایسے ظالم کے پنجۂ غضب میں ہو گی۔ جو بنی نوع انسان کے چہرے کا ایک سیاہ داغ ہے۔"

اب قاسم جس تاریک گوشے میں پڑا تھا۔ وہاں سے اُٹھا اور چپکے سے کہنے لگا "نہ وہ آگ میں جلے گی اور نہ اس مردود ازلی وزیر موت کے قبضے میں آ رہے گی۔ صندوق پر کیلیں جڑ دو۔ لیکن تھوڑی فریدا صندوق میں نہ ہو گی۔"

حسن گھبرا کر دروازے کے قریب گیا اور وہیں سے کہا۔ "خاموش بات بگڑ گئی ہے۔ اب کوئی امید باقی نہیں۔ دروازے پر آدمی آنے شروع ہو گئے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ اس کمرے

میں نہ کوئی اندر آئے اور نہ وہاں سے باہر جائے۔اب کوئی دم جاتا ہے کہ یہ لوگ اندر آ کر تابوت کندھوں پر رکھ کر لے جائیں گے۔اگر صندوق کو بوجھل کرنے کے لئے اس میں کچھ بھر بھی دیا۔ تو تھور فریدا بہر حال کمرے میں رہے گی اور وہ فوراً اسے دیکھ لیں گے۔ کیونکہ اندر آتے ہی سارے کمرے کی تلاشی لینی ان کا فرض ہے۔''

قاسم نے اس عرصے میں اپنی عربی عبا اور کسوہ اتار کر تھور فریدا کو پہنچا دیا اور ایک خنجر اس کے پاس رکھ دیا اور اسے اُٹھا کر جس تاریک گوشے میں خود پڑا تھا، وہاں لے جا کر لٹا دیا اور خود دوڑ کر صندوق میں جا لیٹا اور کہا کہ فوراً صندوق کا پٹ اڈھک کر کیلیں اس میں جڑ دی جائیں۔ پری یہ دیکھتے ہی قاسم پر گر پڑی اور رو کر کہنے لگی کہ اگر یہ مرتا ہے۔تو میں بھی اس کے ساتھ مروں گی۔حسن نے منت کی کہ خدا کے لئے یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔دروازے پر آدمی موجود ہیں۔وہ فوراً سن لیں گے۔حسن اور بہرام دونوں کے حواس درست نہ تھے،ڈر رہے تھے کہ معلوم نہیں، کس وقت لوگ کمرے میں چلے آئیں اور یہ کل کیفیت دیکھ لیں۔بہر کیف سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ صندوق کا پٹ اڈھک کر اس میں کیلیں جڑنی شروع کر دیں۔

ابھی پوری کیلیں جڑی بھی نہیں تھیں کہ دروازہ کھلا اور بہت سے نوکر اندر آ رہے اور داروغہ نے کہا۔''وقت ہو گیا ہے ہم بھی کیلیں جڑنے میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔'' چنانچہ یہ لوگ بھی اسی کام میں مصروف ہو گئے۔داروغہ کی نظر تاریک گوشے کی طرف پڑی جہاں تھور فریدا لیٹی ہوئی تھی۔داروغہ نے فوراً پوچھا۔''یہ کون ہے؟''

حسن نے جواب دیا۔''یہ شامی فدائی ہے۔جو راہ میں زخمی ہو گیا تھا۔ابھی تک بیمار ہے اور اس وقت سو گیا ہے۔''

داروغہ کو اس جواب سے اطمینان ہو گیا اور نوکر تابوت کو کندھوں پر اٹھا کر باہر چلے۔ پری روتی پیٹتی پیچھے چلی۔کمرے میں جو لوگ اس وقت رہ گئے تھے۔وہ ایک دوسرے کی صورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔اور ایک عجیب حیرت کا عالم سب پر طاری تھا۔سب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نوعمر شریف زادے نے جو بغداد سے آیا تھا، ہم سب کی جان بچا لی اور اپنی جان اس کے لئے کھو دی، جس کی وہ دل سے عزت کرتا تھا۔

❀ ❀ ❀

بیسواں باب

طبقۂ حشیشین کے ارکان اعلیٰ جو تعلیم باطن میں فضیلت کے درجے کو پہنچ چکے تھے۔ قلعہ الموت کے جماعت خانے میں حاضر ہیں۔ جماعت خانے سے مراد ایک وسیع اور عالی شان کمرہ ہے، جو کسی زمانہ میں قصر کی عمارت کے نیچے بطور سرداب کے پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سیاہ دیواروں پر پنج شاخوں میں فتیلے اور مشعلیں روشن ہیں اور ان کی سرخ روشنی ہر طرف حرکت میں ہے۔ جانب صدر فرش سے کچھ اونچا ایک چبوترہ ہے اور اس پر تین اونچی نشستیں اسی سیاہ پتھر میں کٹی ہوئی جس کی دیواریں بنی ہیں، بیچ کی نشست پر حشیشیوں کا شیخ الاعظم (یعنی شیخ الجبل) سفید لباس پہنے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر صوبہ جبال اور صوبۂ کوہستان کے دعات الکبیر نشست رکھتے ہیں۔ ان کا لباس سپید کپڑے پر سیاہ دھاریوں کا ہے۔ پہلو کی دونوں دیواروں سے ملی ہوئی دعات کی دوہری صفتیں کھڑی ہیں۔ ان کے سپید لباس کے حاشیے سرخ ہیں۔ ایوان کے بیچ میں تابوت جس کے اوپر کے تختے پر نشان صلیب نہایت تیز سرخ رنگ میں نقش ہے۔ رکھا ہے اور تابوت کے اندر قاسم موت کا منتظر پڑا ہے۔

ملت باطنیہ میں بہت سے درجے تھے۔ ان میں سے صرف تین اعلیٰ درجوں والے اس جلسے میں شریک ہونے کے مجاز تھے یعنی تمام درجات تعلیم کا افسر اعلیٰ شیخ الاعظم۔ دعات الکبیر اور داعیان ایسے جلسوں میں حاضر ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ مدارج ادنیٰ کے لوگوں کے مقابلے میں تعداد کم رکھتے تھے۔ کیونکہ مصلحت اسی میں دیکھی گئی تھی کہ ملت کے جس قدر رموز ہوں، ان کے راز سربستہ رکھنے میں کمال درجے کی احتیاط کی جائے۔ ان رموز کا علم صرف درجات اعلیٰ کے لوگوں کو تھا۔ ''داعیان'' کے بعد چوتھا درجہ ''رفقا'' کا تھا۔ ان کو صرف جزوی طور پر چند رموز بتائے جاتے تھے۔ پانچواں درجہ ان لوگوں کا تھا۔ جن کو ''فدائی'' کہتے تھے۔ یہ تعداد میں اور سب لوگوں سے بہت زیادہ تھے اور یہ تمام رازوں سے ناواقف رکھے جاتے تھے۔

ایوان کا دروازہ بند تھا۔ یہ دروازہ دراصل ایک زینہ کا تھا جس سے اُتر کر ایوان میں پہنچتے تھے۔ یہاں چند داعی جو اسی کام پر مقرر ہوئے تھے۔ برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے دروازے کی حفاظت کرتے تھے اور صرف انہی لوگوں کو جو ملت باطنیہ میں شامل ہو چکے تھے۔ اندر جانے کی اجازت دیتے ہوئے اور صرف یہی ایک مقام تھا۔ جہاں ملت کے راز و رموز ان لوگوں پر ظاہر کئے جا سکتے تھے۔ جن کی قسمت میں ترقی پا کر ان سے مستفیض ہونا لکھا تھا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ شیخ الاعظم اپنی کرسی سے اُٹھا اور حاضرین سے اس طرح خطاب کیا۔ ”دعات الکبیر اور داعیان ملت باطنیہ جس کی شہرت نے ربع مسکون کو ہلا ڈالا ہے۔ سنو! اس جلسہ کے انعقاد کی تین غرضیں ہیں۔ اولاً مجھ کو چند خاص امور سے سب کو مطلع کرنا ہے۔ ثانیاً یہ بتانا ہے۔ کہ فلسطین میں ایک بڑی مہم بھیجنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ ثالثاً جو لوگ اس مہم میں جانے والے ہیں۔ ان سے ایک نئے طرز کا حلف لینا مقصود ہے۔

”ہمارے طبقۂ ناجیہ کا ستارۂ اقبال اس وقت اوج کمال پر ہے۔ ہمارے دعات میں سے بالخصوص اُس داعی خاص نے جو وزیر موت کا لقب رکھتا ہے۔ ولایت شام میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ ان لوگوں نے شام کے داعی الکبیر کی سربراہی میں اتابیک موصل نور الدین محمود کو شہر انطاکیہ پر عیسائیوں کو ہزیمت دینے اور کفار کی فوجوں کو جنوب کی طرف ہٹا دینے میں بہت بڑی مدد پہنچائی اور اس سے گویا اتابیک کے زوال کی بھی بنیاد ڈال[1] دی ہے۔ ان معرکوں میں انہوں نے عیسائیوں کے فرماں روا خاندان ہائے غیلش اور طلوشہ کا قطعی استیصال کر دیا اور وہ نصرانی شیطان یعنی قومس طرابلس اور اس کا ملعون بیٹا جو ہمارا دشمن تھا، قتل ہو گیا۔ ہمارے جری اور شجاع وزیر موت نے خود اس قومس کو خاص دروازہ طرابلس کے سامنے جبکہ بڑے بڑے صلیبی شہسوار اس کے گرد موجود تھے، اپنے خنجر سے ہلاک کیا اور جس شخص نے اس کے بیٹے کو لڑائی کے میدان میں قتل کیا، وہ بھی ہمارے ہی فدائیوں میں سے تھا۔ یہ کام ہیں، جنہوں نے ہماری فتوح اور جانبازیوں کا غلغلہ تمام عالم میں ڈال دیا ہے۔“

بچو! میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ تابوت ایوان کے بیچ میں رکھا ہوا تھا اور اس میں تمہارا دادا قاسم پڑا موت کا منتظر تھا۔ لیکن جس وقت شیخ الجبل نے یہ تقریر شروع کی۔ تو اس کا

---

(1) شیخ الجبل کا یہ دعویٰ غلط تھا۔ نور الدین کے زوال کی بنیاد باطنی لوگ نہیں ڈال سکے۔ صلاح الدین کی مدد سے نور الدین ولایت شام وجبال وجزیرہ پر بڑی شان سے حکومت کرتا رہا۔ تا آنکہ 1174 عیسوی میں پوری سطوت اور اقبال مندی کے زمانہ میں انتقال کیا۔

ایک ایک لفظ قاسم سنتا رہا۔ آہستہ سے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ چند باریک روزنوں میں سے تابوت کے اندر روشنی آ رہی ہے۔ پہلو کے تختوں میں جا بجا سوراخ ہیں اور انہیں سوراخوں سے باہر کی آواز بھی اندر آتی ہے۔ قاسم اس وقت حسن اور بہرام کی دُوراندیشی پر ان کو دعائیں دینے لگا کہ انہوں نے یہ سوراخ اس لئے رکھے تھے۔ کہ جب ایک زندہ آدمی مردہ سمجھ کر اس تابوت میں رکھا جائے۔ تو وہ سانس لے سکے۔ لیکن یہ خیال ان کو نہ تھا۔ کہ انہی روزنوں کی وجہ سے وہ رموز بھی معلوم ہو جائیں گے۔ جن کے لئے وطن سے بے خانماں ہو کر اس جور و جفا کی زمین میں آیا تھا۔ قاسم ایک ایک لفظ غور سے سنتا رہا۔

شیخ الاعظم نے اب ان دونوں ''رفقا'' کے نام اور ان کے بڑے کام جو انہوں نے ملک شام کے معرکوں میں کئے تھے اور جن کے وجہ سے وہ داعی کے درجے پر ترقی پانے کے مستحق ہوئے تھے۔ بیان کئے۔ دونوں آدمی صفوں میں سے نکل کر شیخ کے سامنے چبوترے کے نیچے کھڑے ہوئے۔ وزیر موت نے قریب آ کر ان کو تمام ایسی باتوں سے آگاہ کیا۔ جو ادائے رسوم کے وقت ان کو ملحوظ رکھنی ضروری تھیں اور اب شیخ الجبل کے محمد بن بزرگ امید نے آواز تیز کر کے کہا۔ ''رفیقو! جن کو داعی کے درجے میں اس وقت ترقی دی گئی ہے۔ تم کو اس وقت ان رموز سے آگاہ ہونا چاہیے۔ جو ہمارے طبقہ کے رازہائے سربستہ ہیں۔ جس وقت تمہیں فدائی کا درجہ حاصل تھا۔ تو شریعت اسلام کی نہایت سختی کے ساتھ تم سے پابندی کرائی جاتی تھی۔ بہشت کی امید اور دوزخ کا خوف ہر وقت تمہارے دلوں میں رکھا جاتا تھا۔ جس وقت تم ''رفقا'' کے درجے میں آئے۔ تو تم کو سات پیغمبران بزرگ یعنی آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ اور اسماعیل بن جعفر صادق علیہم السلام سے واقف کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد تم کو سات ائمہ صامت یعنی شیث، سام اسماعیل ابن ابراہیم، ہارون، شمعون، علی اور محمد بن اسماعیل علیہم السلام کا علم بھی پہنچایا گیا لیکن تم نہیں جانتے تھے کہ زمانہ موجودہ کی نسلوں کا امام صامت کون ہے اور تم ڈرتے تھے کہ وہ آنے والا ہے لیکن اب معلوم ہونا چاہئے۔ تم مثل دیگر ابنائے آدم کے قطع نظر اُن کے جو ہماری ملت کے مدارج اعلیٰ میں شامل ہو چکے ہیں۔ گمراہ تھے۔ کتاب آسمانی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے باطل پرستی کی ظلمت میں راستہ ڈھونڈتے تھے مگر نہ ملتا تھا لیکن اب عالم لاہوت کی دہلیز پر تمہارے قدم ہیں۔ اور انوار حقیقت کا آفتاب جوں جوں طلوع ہوتا ہے۔ اویان عالم کی تاریکیاں محو ہوتی جاتی ہیں۔ ہماری الہام کی بجلیاں کوند کوند کر تاریک غاروں کو روشن کر رہی ہیں۔ ہمارے معارف کے کڑکتے اور گرجتے بادل اور طوفان، جور و ستم کے حصاروں کو توڑ رہے

ہیں۔ بس جان لو کہ نہ خدا ہے، نہ پیغمبر ہیں، نہ ملائکہ ہیں، نہ بہشت ہے نہ دوزخ، نہ روز محشر، انسان جسے خدا جانتا ہے وہ خود انسان ہی کے آلام و مصائب کا ایک عکس تاریک ہے۔ پیغمبر قانون کے بنانے والے نہیں ہوتے بلکہ باطل کے بنانے والے ہوتے ہیں۔ فرشتے محض واہمہ کے حلقہ بگوش غلام ہیں۔ اور فردوس جس کا لطف اٹھا چکے ہو اور اس وقت سمجھتے تھے کہ نشاط جاوید کی یہ ایک چاشنی چکھائی گئی ہے۔ بالکل انسان کی ساختہ ایک چیز تھی۔ جہاں حشیش کے نشے میں تم پہنچائے گئے تھے اور اسی کے نشے میں وہاں سے باہر لائے گئے تھے۔ فردوس، جنت، بہشت اور اسی دنیائے فانی کی مسرتوں کا نام ہے اور یہاں کی تکلیفوں اور آلام سے مراد دوزخ ہے۔ بس اپنا عمل ایسا رکھو کہ دنیا میں جو جام مسرت ملے۔ اسے منہ سے لگا کر اتنا پیئو۔ کہ تلچھٹ تک باقی نہ رہے۔ کیونکہ اس دنیا کے بعد پھر کچھ نہیں ہے۔ چونکہ قوت۔ زور اور اختیار اُن راہوں کو روشن کر دیتا ہے، جو عیش و نشاط کی منزل تک پہنچاتی ہیں۔ اس لئے ان چیزوں کے لئے ہمیشہ لڑتے رہو۔ زور اور قوت حاصل کرنے کے شوق کو اپنا خدا بنا لو۔ ہمت۔ شجاعت جو کچھ رکھتے ہو۔ وہ سب اسی بازی میں لگا دو۔ نہ ایمان رکھنے کی ضرورت ہے نہ کسی اعتقاد کی۔ دنیا کے جتنے شاہان جبار ہیں۔ ان کے سینوں میں اپنے تیز خنجر اتار دو۔ یہاں تک کہ تم ہی تمام خشک و تر کے مالک ہو جاؤ۔"

قاسم حیرت اور خود سے ان ناپاک باتوں کو اور ان کے بعد جو نصیحتیں شیخ نے اپنے مریدوں کو کیں، ان کو غور سے سنتا رہا۔ ان نصیحتوں میں ان چالوں اور ترکیبوں کی صراحت کی گئی۔ جو ارادت مندان ملت کو دنیا کے قوی اور متکبر لوگوں کے ساتھ کام میں لانی ضروری ہیں۔ دغا اور فریب دینے کے طریقے۔ دوسروں کے وفادار نوکروں کو بہکا کر اپنے گروہ میں شامل کرنا اپنے ہی دوستوں اور محسنوں کے ساتھ مکر اور بیوفائی کے قواعد۔ قتل کی ہدایت کرنے سے پہلے فدائی کو مخمور کر دینا۔ یہ کل اصول نہایت صاف صاف بیان کئے اور ان کے تمام پہلوؤں کو بخوبی سمجھایا۔ غرض اس عجیب طریقہ سے قاسم کو حشیشیوں کے وہ تمام راز خود اس شخص کی زبان سے معلوم ہو گئے۔ جس نے کہا تھا۔ کہ "جب تک اپنے باپ کو قتل نہ کر لو گے۔ یہ راز تم پر آشکار نہ ہوں گے۔" اور اس کلام سے جو صدمہ قاسم کے دل کو پہنچا تھا۔ اس کو وہی خوب جانتا تھا۔

جب یہ پند و نصائح ختم ہوئے۔ تو کچھ دیر تک کوئی آواز نہیں آئی۔ قاسم سمجھ گیا۔ کہ اس وقت شیخ ان دو آدمیوں کو جن کی ترقی مقصود تھی۔ حشیشین کی اس جماعت میں باضابطہ شامل کر رہا ہے، جو فرقہ کے تمام رموز سے آگاہ تھے۔

اور اب سب سے آخر میں اس نئے حلف کی کارروائی شروع ہوئی۔ شیخ نے ان داعیوں کے نام پڑھے۔ جو زیر موت کی سرکردگی میں لبنان کے حشیشیوں کی کمک پر ولایت شام کو روانہ ہونے والے تھے۔ تا کہ ان آفات و مصائب کو رفع کریں۔ جو اہل صلیب کے مقابلے میں ان کو پیش آ رہے تھے اور یہ صلیبی وہ تھے جنہوں نے قومس ریمند کے قتل پر حشیشیوں سے اس کے خون کا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔ قاسم کو تابوت میں پڑے پڑے معلوم ہوا۔ کہ ایک ایک آدمی تابوت کے پاس آ کر اس پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اور حلف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو صرف ایک تابوت ہے۔ جس میں ایک کافر ملعون کی لاش بند ہے۔ اگر زمانہ مساعد ہوا۔ تو ہماری تلوار کے مقتول نصرانیوں کی تعداد اتنی ہوگی۔ کہ ایسے صدہا تابوت ان کی لاشوں سے بھر جائیں گے۔

جب حلف ہو لیا تو شیخ الاعظم نے تمام حاضرین کو اس امر کا یقین دلایا۔ کہ اس حلف کی کرامت سے تم سب کی جانیں دشمن سے محفوظ رہیں گی۔ ان کے تیر و سنان تم پر کچھ اثر نہ کریں گیا اور ان کی تلواریں اپنا کام نہ کرسکیں گی اور نہ اس آگ سے تم جل سکوں گے۔ جو نصرانی تم پر برسائیں گے۔ اس کے بعد شیخ نے کہا۔ "چونکہ یہ رسم جس کے لئے یہاں جمع ہوئے تھے۔ اب ختم ہوگئی ہے۔ اس لئے اب صرف یہ کام باقی ہے کہ اس کے ضروری نتائج پیدا کرنے میں دل و جان سے کوشش کرتے رہو۔ یہ لاش جس پر حلف کیا گیا ہے۔ اس کا دنیا سے مٹ جانا ضروری ہے۔ تا کہ پھر وہ اس کام کے لئے یا کسی اور کام کے لئے نہ برتی جاسکے۔ بس اس نصرانیہ کی لاش کو فوراً یہاں سے اٹھا کر سپرد آتش کر دیا جائے۔ یہ غارت ہو اور میرے وفادار فتح یاب ہوں کیونکہ موت اور شکست ہی کا نتیجہ زندگی اور فتح ہے۔ جلسہ برخاست ہو۔"

شیخ اپنی کرسی سے اُٹھا اور ایوان میں سے ہوتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔ رفتار میں غرور تھا۔ دعات اور داعیان کبیر اس کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ دروازے سے سیڑھیاں چڑھ کر قصر میں آیا اور یہاں سے پھر کئی زینے چڑھ کر سب سے اونچے برج والے ایوان میں جہاں فروکش تھا۔ پہنچ گیا۔ جس وقت یہ راہ طے کر رہا تھا۔ تو سب کی نظریں اس کی طرف تھیں۔ رفتار یا انداز میں اس وقت تک کسی قسم کی لغزش نہ تھی۔ لیکن جس وقت اپنے ایوان میں آیا۔ جہاں چراغ کی روشنی۔ چینی کے ظروف ریشمین پردوں اور رنگین قالین پر پڑ رہی تھی اور آخر کار اپنی مسند پر بیٹھا۔ یعنی اسی مسند زر نگار پر جہاں برسوں سے بڑے بڑے شاہان ذوی القدر کے قتل اور دنیا کے تمام سلطنتوں کی بجز اپنی حکومت کے غارت کرنے کی تدبیروں میں دماغ سوزی کیا کرتا تھا۔ تو

رنج اور فکر نے پیشانی تاریک کر دی اور آنکھوں سے جو قہر کے شعلے اب تک نکل رہے تھے۔ ان کو غم کے آنسوؤں نے بجھا دیا۔

آیا اور مسند پر بیٹھ گیا اور اسی طرح بیٹھا رہا۔ رات کی ظلمت ہر چہار طرف چھائی تھی۔ سب لوگ اس سے ڈرتے تھے اور ہر جگہ اس کا نام ہیبت سے سنا جاتا تھا۔ مگر کسی کو اس سے محبت نہ تھی۔ دنیا میں جوز؟ بردست ہمیشہ زبردست رہنا چاہتے ہیں۔ وہ سب کو مجبوراً اور اپنے سے دور رکھتے ہیں۔ رات کی ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ کر کبھی چراغ کی لو کو رقص میں لاتی تھی اور کبھی پردوں کو حرکت دیتی تھی۔ مگر شیخ جس طرح بیٹھا تھا۔ اس طرح بیٹھا تھا۔ یکا یک پردوں کی درزوں میں دور ایک شعلہ چمکا۔ جس نے چینی کے ظروف اور ریشمین پردوں پر سرخ روشنی کا عکس ڈالا۔ یہ دیکھ کر شیخ اٹھا اور پردہ ہٹا کر باہر کی طرف دیکھا۔ تو کیا دیکھا۔ کہ دور شہر کے دروازے سے باہر لکڑیوں کے ایک اونچے انبار میں آگ لگی ہے اور انبار کے اوپر ایک تابوت رکھا ہے۔ اب شعلے اور بلند ہوئے اور ان کی روشنی ایوان کی سنہری چھت اور ایوان کے اندر چین اور اصفہان کی صنعتوں پر چمکنے لگی۔ شیخ اسی طرح کھڑا دیکھتا رہا، یہاں تک کہ لکڑیوں کا وہ انبار اور تابوت سب جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ مگر شیخ کی نظر ادھر سے نہ ہٹی۔ اسی طرح کھڑا رہا۔ سونے کو لیٹا تک نہیں۔

اب صبح کی روشنی آشیانۂ عقاب کے اونچے اونچے پہاڑوں پر پھیلی۔ لیکن شیخ پھر بھی اسی راکھ کے ڈھیر کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے ماتھا پکڑ کر آہستہ سے کہا۔ ”تقدیر کی کتاب میں لکھا ہے کہ جو شخص سارے جہان کو اپنا مطیع و منقاد بناتا ہے۔ وہ اپنی محنت کا پھل خود نہیں پاتا۔ ہم نے جلب قوت سے عشق کیا۔ اس لئے عشق کی قوت ہم سے سلب ہو گئی۔ اگر آج اس جاہ و حشم کے بدلے کہیں جنگل میں ایک جھونپڑی ہوتی اور کوئی اتنا ہوتا جسے گھر سے باہر جانے پر خیال اور اندر آنے کا انتظار ہوتا............“

دل ہی دل میں یہ کہتا ہوا پھر مسند پر آن بیٹھا۔ کچھ کاغذات اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ پھر کچھ لکھا۔ اتنے میں دن خوب نکل آیا۔ داعی و فدائی کاتب اور جاسوس اپنا اپنا کام لے کر حاضر ہونے شروع ہو گئے۔

اکیسواں باب

آج رات کو شہر کے دروازوں پر دربانوں کو حکم ہوا ہے کہ جب تک خاص شیخ الجبل کا اجازت نامہ نہ پیش کیا جائے کوئی متنفس شہر کے باہر نہ جانے پائے لیکن کچھ لوگوں نے اس قسم کے اجازت نامے دکھائے اور دربانوں نے دروازہ کھول کر انہیں باہر جانے دیا۔

پہلے تین آدمی اونٹوں پر سوار آئے، ان میں دو آدمی عربی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں دربانوں نے سمجھا کہ یہ شامی فدائی ہیں، جو نقیب شام کے پاس سے شیخ کی خدمت میں کاغذات لے کر حاضر ہوئے تھے اور اب واپس جا رہے ہیں۔ مگر باوجود اس کے دربانوں نے انہیں ٹوکا۔ ان لوگوں نے فوراً انگلی ہونٹوں پر رکھ کر کمر سے سرخ اور سفید دستے کا خنجر نکال کر دکھایا۔ تیسرا آدمی ایک پستہ قد گول گول بالکل اخروٹ کی صورت کا آدمی تھا۔ اس نے ایک سربمہر لفافہ جو شیخ کی طرف سے نقیب شام کے نام تھا پیش کیا۔ شیخ نے یہ مراسلہ جلسہ کے بعد ہی جلدی میں لکھا تھا اور اس میں صرف اتنا بیان تھا کہ نیا حلف جو شامیوں نے تجویز کیا تھا اس پر بجنسہ عمل کیا گیا اور حامل ہذا کے علاوہ اور بہت سے وفادار اور جانباز حشیشی نقیب موصوف کی کمک کے لئے روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ بہرام نے سربمہر لفافہ دکھا کر اپنے دو ساتھیوں کی نسبت کہا، کہ یہ لوگ چپ رہنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں، اس لئے صحرا تک ان کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ دربان اتنا سن کر مطمئن ہو گئے اور یہ تینوں آدمی شہر سے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد شیخ الجبل کے ملازمین خاص کندھوں پر تابوت اُٹھائے شہر کے دروازے پر آئے، ان کی صورتوں سے دربان خوب واقف تھے۔ شیخ نے یہ کام اپنے خاص معتمدوں کے سپرد کیا تھا۔ کسی دوسرے کا یہاں تک کہ وزیر موت کا بھی اس معاملے میں اعتبار نہ تھا۔ صرف پری کو چونکہ وہ تھور فریدا کی جاں نثار خادمہ تھی، تابوت کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ان ملازموں کے افسر یعنی داروغہ نے شیخ کا پروانہ دکھایا۔ پروانہ دیکھتے ہی دربانوں کے افسر یعنی قلعہ

دار نے اشارے سے وہ مقام بتایا، جہاں شہر سے باہر لکڑیوں کا ایک انبار چنا گیا تھا اور گو اندھیرا تھا ،مگر وہ انبار اتنا اونچا تھا، کہ اندھیرے میں بھی نظر آتا تھا۔غرض یہ آدمی بھی جو تابوت لئے ہوئے تھے،شہر سے باہر نکل آئے۔

یہ آدمی تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ ایک شخص اونٹ پر بیٹھا دروازے پر آیا، اس نے پروانہ دکھایا۔اس میں لکھا ہوا تھا کہ یہ شتر سوار اور اس کے ساتھ جتنے لوگ ہیں وہ سب حشیشیوں کی مدد کے لئے ولایت شام کو جا رہے ہیں۔قلعہ دار نے سوال کیا کہ "آپ کے اور ساتھی کہاں ہیں؟" جواب ملا کہ وہ صبح کو یہاں سے چلیں گے چونکہ پروانہ شیخ کے ہاتھ کا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شتر سوار ایک بڑا مشہور اور زبردست داعی یعنی خود وزیر موت ہے۔اس لئے قلعہ دار نے اس کو بھی باہر جانے دیا۔

اخیر میں دو آدمی اور آئے یہ بھی اُونٹوں پر سوار تھے لیکن ان کے پاس کوئی اجازت نامہ نہ تھا۔ قلعہ دار نے ان کو باہر جانے سے روکا، تب ان میں سے ایک شخص نے کہا! "تمہیں جاننا چاہئے کہ میں شیخ الجبل کا فرزند اور اس کے تخت کا وارث ہوں اگر تم نے مجھ کو اور میرے نوکر کو روکا تو اس کے معنی ہوں گے، کہ بزرگان ملت کی نافرمانی اور گستاخی کرتے ہو"۔یہ سن کر قلعہ دار ڈر گیا اور اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔اس طرح حسن اور اس کا نوکر فضل بھی شہر سے باہر نکل آئے۔

اس اثنا میں جو لوگ تابوت لے جا رہے تھے وہ لکڑیوں کے انبار کے پاس پہنچ گئے۔اس انبا کے مغربی جانب اونچی اونچی گھنی جھاڑیاں تھیں اور مشرق کی طرف کسی پرانے باغ کی ایک دیوار تھی ۔آدمیوں نے تابوت اُتار کر انبار کے پاس رکھ دیا اور خود بھی اس کے قریب زمین پر بیٹھ گئے پری تابوت پر پیشانی رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں کے افسر آگ لگاتے ہیں"۔پری اتنا سُن کر ہٹنے کی جگہ تابوت کے اُوپر لیٹ گئی اور برابر اسی طرح روتی رہی۔اسی حالت میں شہر کی طرف سے اُونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کان میں آئی اور اس رونے پیٹنے میں روزنوں کے پاس منہ لا کر قاسم سے اتنی بات کہہ دی کہ رومال سے منہ چھپا لو۔اگر تابوت کھولا جائے۔تو بالکل مُردہ بنے رہنا۔جب پری تابوت پر سے کسی طرح نہ ہٹی تو ملازموں نے اسے گھسیٹ کر نیچے اُتارنا چاہا لیکن پری تختہ کو چمٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔"ہائے میری بیگم! ہائے میری بیگم!" اتنے میں اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز اور قریب سنائی دینے لگی۔تب ایک آدمی نے پری کو زبردستی گھسیٹ کر تابوت پر سے نیچے ڈال دیا اور باقی لوگ تابوت اٹھانے کے لئے قریب آئے۔

اب یکا یک اندھیرے میں سے ایک آدمی اونٹ پر سوار نزدیک آیا اور تابوت والوں کو للکار

کر جلدی سے اپنا اونٹ بٹھا نیچے اُترا۔ آدمیوں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وزیر موت ہے۔ وزیر موت نے کہا! ''ٹھہرو۔ تابوت کو ابھی انبار پر نہ رکھو۔ میں شیخ الجبل کا ایک حکم لایا ہوں''۔

تابوت والوں کے داروغہ سے کہا'' ہمارے پاس بھی شیخ ہی کا حکم ہے اور وہ ہے کہ اس صندوق کو اور جو لاش اس میں بند ہے، اسے جلا دیا جائے''۔

درویش (وزیر موت) نے جواب دیا۔'' مجھے جو حکم ملا ہے وہ یہ ہے اور اس کی پابندی تم پر لازمی ہے۔ اس میں کچھ دیر نہ لگے گی جس عورت کی لاش اس تابوت میں ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا قیمتی موتی تھا، جو ارفہ کے محاصرے کے زمانہ سے برابر اسی کے پاس تھا۔ جب وہ مر گئی تو حرم سرا میں اس موتی کی تلاش ہوئی۔ مگر کہیں پتا نہ چلا، اب خیال یہ ہے کہ موتی اب تک اسی کے پاس ہے۔ چنانچہ شیخ نے حکم دیا ہے کہ تابوت کھول کر اس گوہر نایاب کو تلاش کیا جائے اور جب وہ مل جائے تو فوراً اس کو خزانہ عامرہ میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس تلاشی کے بعد لاش پھر تابوت میں بند کر کے جلا دی جائے''۔

تابوت والوں کو کسی قدر تامل ہوا لیکن درویش نے شیخ کا پروانہ جس میں ولایت شام کو فوراً روانہ ہو جانے کا حکم تھا، نکال کر لفافہ کی مہر داروغہ کو دکھائی۔ یہاں یہ بات معلوم رہنی چاہئے کہ شیخ، اپنے ملازمین خاص کو ایسے لوگوں میں سے منتخب کرتا تھا۔ جو لکھنا پڑھنا مطلق نہ جانتے تھے تاکہ صیغہ کے حکم احکام جو رات دن ان کے ہاتھوں میں پہنچتے رہتے تھے۔ ان کو وہ پڑھ نہ سکیں۔ غرض داروغہ کو بالکل نہیں معلوم ہوا کہ اس حکم میں فی الواقع میں کیا لکھا ہے۔ پری نے بھی اس موقع پر کہا کہ'' ہاں! ہاں وہ بڑا موتی تو بیگم ہمیشہ اپنے پاس چھپائے رکھتی تھیں اور اب تک وہ انہی کے پاس ہے''۔

درویش نے کہا کہ'' یہ خادمہ لاش کی تلاشی لے گی۔ تم لوگ تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے چلے جاؤ، کیونکہ یہ میت عورت کی ہے۔ اسے کوئی مرد نہیں دیکھ سکتا۔ میں صرف تابوت کھولنے اور پھر بند کرنے میں مدد کروں گا لیکن جس وقت تلاشی لی جائے گی تو میں بھی یہاں سے ہٹ جاؤں گا''۔

ملازمین خاص کسی قدر تذبذب کے ساتھ باغ کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ اب درویش نے پری کے کان میں کچھ کہا اور خنجر کی نوک تابوت کے اوپر والے تختے میں اڑا کر زور کیا تو تختہ چڑ چڑ کر کے کھلتا چلا گیا۔ اندھیرے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ تابوت کے اندر سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک لاش پڑی ہے۔ اب پری اور درویش نے تابوت کے دونوں سروں کی طرف آ، اُسے ایک طرف کو جھکایا۔ لاش لڑھک کر زمین پر آ گئی۔ درویش نے کہا! کہ'' سڑک پر اونٹ چلنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ مگر اس وقت لاش اُٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے اس

جھاڑی میں چھپا دینی چاہئے اور جب تک یہ لوگ تابوت کو جلائیں لاش جھاڑی ہی میں پڑی رہنی چاہئے۔ جب تابوت جلا کر وہ چلے جائیں گے۔ تو اونٹ یہاں لا کر ہم سب شام کی طرف خفیہ طور سے روانہ ہو جائیں گے لیکن پہلے یہ بات ہے کہ تابوت کو بند کرنے سے پہلے کچھ اس میں بھر دینا چاہئے کیونکہ اگر اٹھاتے وقت ان آدمیوں کو صندوق ہلکا معلوم ہوا تو سارا بھرم کھل جائے گا اور ہم فوراً گرفتار کر لئے جائیں گے"۔

درویش اتنا کہہ کر دو چار بھاری پتھر لا کر جمع کرنے کے لئے کچھ دور گیا۔ اپنا خنجر تابوت کے قریب بھولے سے چھوڑ گیا۔ پری نے جھٹ خنجر اُٹھا، اپنے پاس چھپا لیا اور قاسم سے جو زمین پر پڑا تھا۔ آہستہ سے کہا کہ "کفن کے بندھن جتنے ہوں وہ کھول ڈالو اور یونہی دم سادھے پڑے رہو، جب میں کہوں تو کفن یونہی چھوڑ کر فوراً دوڑ کر اس جھاڑی میں چھپ جانا"۔ درویش دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بھاری پتھر اُٹھا کر لایا اور تابوت کے اندر رکھ دیا۔ جب وہ اور پتھر لانے گیا تو پری نے قاسم سے کہا "نکلو"۔ قاسم جھٹ کفن سے نکل، بھاگ کر جھاڑی میں جا چھپا، پری نے جلدی سے کفن کو جس طرح پہلے وہ نظر آ رہا تھا، اسی طرح درست کر دیا۔ تا کہ درویش یہ نہ سمجھے کہ لاش اس میں نہیں ہے۔ درویش نے واپس آ کر اور کئی پتھر تابوت میں رکھے اور کہنے لگا "اب تو بوجھ کافی ہو گیا ہے، آؤ اب اسے بند کر کے کیلیں جڑ دیں"۔ چنانچہ دونوں نے جو تختہ علیٰحدہ کیا تھا وہ تابوت کے اوپر جمایا۔ جس وقت وہ تختہ جما رہے تھے۔ تو شہر کی طرف سے پھر اونٹ کی گھنٹیوں کی آواز آئی۔ پری نے آواز سن لی۔ مگر درویش اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس لئے کچھ نہ سُنا۔ اب درویش نے اپنا خنجر ڈھونڈنا شروع کیا۔ تا کہ اس کے دستے سے کیلیں ٹھونکنے۔ ڈھونڈتا جاتا تھا اور اپنے تئیں بُرا بھلا کہتا جاتا تھا کہ خبر نہیں کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں، آخر کار مجبور ہو کر ایک پتھر سے تابوت میں کیلیں ٹھونکنے لگا۔ اب پری کو گھنٹیوں کی آواز اور قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس عرصہ میں دونوں نے تابوت پر اس کا ڈھکنا کیلوں سے خوب مضبوط جڑ دیا اور درویش نے کہا "اچھا اب جلدی سے لاش کو اٹھا کر جھاڑی تک لے چلو، یہ کہہ کر جو ہاتھ ڈالا، تو معلوم ہوا کفن میں لاش نہیں ہے، یہ دیکھ کر زور سے ایک آہ درویش کے منہ سے نکلی اور اسی وقت گھنٹیوں کی آواز بالکل ہی قریب سنائی دی اور معاً دو آدمی اونٹوں پر بیٹھے نظر آئے۔ ان کو دیکھتے ہی درویش نے پری سے کہا۔ کہ اب گرفتار ہونے میں کچھ باقی نہیں رہا ہے، جلدی سے کفن اُٹھا کر جھاڑی میں چھپا دو۔ یہ کہہ کر وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف بھاگا۔ جہاں تابوت والے منتظر کھڑے تھے۔ اس حرکت میں

اس کی جان بھی بچ گئی۔ ورنہ پری خنجر نکال کر بالکل تیار تھی کہ اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔

اب پری بھاگ کر جھاڑی میں پہنچی۔ وہاں دیکھا تو تھور فریدا اور ابن ریمند دونوں عربی لباس پہنے اور فدائیوں کا خنجر کمر میں لگائے موجود ہیں۔ بہرام اور قاسم بھی ان کے پاس کھڑے ہیں۔ بہرام نے کہا "اب یہ فرنگن بھی میری دوا سے ماشاء اللہ ہوش میں آ گئی ہیں اور قاسم بھی موت کے منہ سے جیتے جاگتے نکل آئے ہیں، بہتر ہے کہ اس ملعون اور خبیث جگہ سے بھاگ کر کہیں نکل جائیں"۔

قاسم نے کہا کہ "سواری کے لئے اونٹ صرف تین ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے یہ کام دے جائیں گے لیکن صحرا کے عبور کرنے میں ان سے کام نہ چلے گا۔ یہ دو شتر سوار جو ابھی ادھر کو آئے ہیں، وہ کون ہیں کہیں ہمیں گرفتار کرنے تو نہیں آئے ہیں؟"۔

پری نے کہا "وہ دشمن نہیں دوست ہیں، بس اب یہاں سے چلنا چاہئے"۔

چنانچہ یہ سب جلدی جلدی درے کی طرف چلے جو الموت کے پہاڑوں سے نکل کر کھلے میدان میں آنے کا راستہ تھا۔ کچھ نے اپنے اونٹ چھوڑے تھے۔ مگر اب جو دیکھا، جو بجائے تین کے وہاں پانچ اونٹ نظر آئے۔ یعنی حسن اور اس کا ملازم فضل بھی وہاں موجود ہیں۔

حسن نے کہا! "اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے۔ کہ توفیق الٰہی دنیا کی تمام چیزوں پر نظر مہر رکھتی ہے۔ گو اس کا ظہور انسان کے دیکھنے کے لئے مدتوں کے بعد ہوا کرتا ہے۔ اب آپ لوگوں کو بھاگ کر اپنی جان بچانی چاہئے، قاسم اپنے والد سے جا کر یہاں کے کُل راز کہہ دیں، یہی مناسب بھی ہے، گو میں خود جب تک والد بزرگوار مسند حکومت پر تشریف رکھتے ہیں۔ یہاں کے رازوں کو افشا کرنا مصلحت نہیں سمجھتا[1]۔ اگر خلیفہ مقتفی نے انہیں معلوم کر کے احتیاط سے کام لیا۔ تو قتل و غارت کے منصوبوں کا جو میرے والد ہر وقت سوچتے رہتے ہیں۔ سد باب ہو جائے گا، اچھا اب مجھے واپس جانا چاہئے۔ ورنہ اس وزیر موت کو معلوم ہو جائے گا کہ میں بھی اس سازش میں شریک تھا۔ اس خونی شہر میں میری زندگی تو ہر وقت شیطانی قوم سے مقابلہ کرنے میں گذرتی ہے۔

---

(۱) اس زمانہ کے بعد جب حسن 1174ء میں اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا تو اس نے تمام حشیشیوں پر راز ظاہر کر دیئے۔ جو پہلے درجہ اعلیٰ کے اراکین خاص کو معلوم تھے۔ اس کے ساتھ فدائیوں پر جو شرع کی سخت پابندیاں تھیں۔ ان کو بھی کم کر دیا، حسن ایک عافیت پسند بادشاہ ثابت ہوا۔ قتل و غارت کا سلسلہ اس نے مسدود کر دیا۔ لیکن خود چار برس حکومت کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا اور پھر وہ باطل پرستی اور خونریزی زور پر آ گئی۔ (مصنف)

میرا کتب خانہ اور باغ حقیقت میں میرے لئے ایک گوشہ عافیت ہے۔ جو بتا رہتا ہے کہ پہلے جو مسرت حاصل تھی وہ کیا تھی اور جو مسرت آئندہ حاصل ہو کیسی ہونی چاہیئے، لیکن انسان کی بُری یا بھلی حالت کا دارومدار اس پر ہے۔ کہ جو اس کے گرد و پیش رہتے ہیں وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ میرے قریب جو لوگ رہتے ہیں۔ ان میں نہ تو مجھے کوئی بھلائی نظر آتی ہے اور نہ کبھی ان سے راحت پہنچنے یا درد کی تکلیف سے نجات ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔ تم سب لوگ میرے پاس تسکین وتسلی لے کر اس طرح آئے جس طرح آفتاب کی روشنی طوفان کے سیاہ بادلوں میں سے تھوڑی دیر کے لئے چمک کر جاتی رہتی ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اُبر سیاہ سر پر ہے۔ افق کے کنارے بادل کی گرج خوفناک اور سمندر طوفانی ہے۔ شب ازل موت کی نیند میں ہماری آنکھیں بند کرنے والی ہے۔ کیا اس سے پہلے مہر درخشاں جس کے غروب کا وقت قریب ہے، اس ابر تاریک میں سے اپنی جھلک نہ دکھلائے گا؟

کیا ہمارے گم کردہ راہ سفینوں کی رہبری کے لئے کوئی روشنی کا منارہ نظر نہ آئے گا؟

کیا خدا کی کوئی نشانی کائنات کے اس پردہ طلسم کو ہٹا کر اولاد آدم کو اس حالت تیرگی سے جس سے ڈراؤنے خواب نظر آرہے ہیں، نجات نہیں دے گی؟"

یہ کہہ کر حسن آہستہ قدم چل کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ پھر کسی نے اُسے نہ دیکھا۔

قاسم نے پری سے پوچھا کہ "تم کہاں جاؤ گی؟"

پری نے کہا: "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ درویش نے جو باتیں سوچ رکھی ہیں، وہ مجھے سب معلوم ہیں۔ وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا میں نے تو اس کا خنجر اپنے پاس چھپا لیا تھا اگر اس وقت بھاگ نہ جاتا۔ تو اپنے ہاتھ سے اس موذی کو قتل کرتی"۔

اب یہ لوگ یعنی تھور فریدا اور پری، ریمنڈ، قاسم اور بہرام اونٹوں پر سوار ہوئے اور جب درے کے قریب پہنچے۔ تو مڑ کر الموت پر ایک نظر ڈالی۔ دیکھا تو آگ کا ایک شعلہ بہت بلند اٹھا ہے۔ وزیر موت نے تابوت لکڑیوں کے انبار پر رکھوا کر اس میں آگ لگا دی تھی اور وہ انبار تیزی سے جل رہا تھا۔ شعلے کی سرخ روشنی سیاہ چٹانوں اور قلعہ کی دیواروں اور ایوان کی سنہری چھت پر تڑپ رہی تھی۔ مسافروں نے آخری نگاہ اس مقام پر ڈالی اور درے سے نکل کر صحرا میں آئے۔ صحرا میں ہوا صاف اور ٹھنڈی تھی اور حد نظر تک ریگستان ہی ریگستان پھیلا تھا۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں سپیدہ سحر ظاہر ہونے لگا اور ستاروں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

بائیسواں باب

مسافروں نے صحرا عبور کر کے ایک پہاڑی سلسلے سے وسیع شاداب میدانوں کو دیکھا، جن کو دریائے دجلہ سیراب کرتا تھا۔

پہاڑی سلسلے سے اُتر کر مزروعہ زمینوں میں چلنے لگے۔ تھور فریدا اور ابن ریمند خوش تھے۔ کہ کیسی کیسی سخت مصیبتوں اور خطروں سے آخر کار جان سلامت لے کر نکل آئے۔ پری اپنی حرکت پر بہت نادم تھی اور اس غم میں گھل گئی تھی کہ افسوس جس پر دل گیا، اس سے التفات کی امید نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ قاسم کی جان اب تک تھور فریدا میں پڑی ہے۔ قاسم بھی جانتا ہے کہ تھور فریدا کی آئندہ زندگی اور زندگی کی مسرتیں کسی دوسرے ہی سے وابستہ ہیں لیکن ایثار اور صبر کے تلخ پانی سے اپنے قلب کو دھو کر پاک کر لیا تھا۔ پری قاسم کی اس نفس کشی سے اس کی عزت اور زیادہ کرنے لگی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھتی تھی کہ تھور فریدا کے ساتھ جو دغا میں نے کی تھی۔ اس نے قاسم کا دل مجھ سے اور بھی زیادہ دُور کر دیا ہے۔ بہر کیف مسافر منزلیں طے کرتے رہے، قاسم اپنے وطن، باپ اور بہن سے اور گھر کے ان گلابوں والے خوبصورت چمن سے روز بروز قریب ہوتا جاتا تھا لیکن وہ ناشدنی قسم جو شیخ الجبل نے اس سے لے لی تھی۔ ایک سیاہ بادل کی طرح چھائی ہوئی، اس کے سر سے کسی طرح نہ ٹلتی تھی، دل کی تمام آرزوئیں، امیدیں خاک ہو چکی تھیں۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس نے کر لیا ہے، باقی اپنی ذات سے جس قدر چیزیں متعلق ہو سکتی تھیں۔ ان سب کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور حالت اس طوفان خوردہ ملاح کی سی ہو گئی تھی جو دیکھ رہا ہے کہ کشتی کے بادبان پھٹ گئے ہیں، سُکّان ٹوٹ گیا ہے، مگر اس حال میں بھی بحر بے پایان کی سطح پر اپنی ٹوٹی ناؤ کو چلائے جاتا ہے۔ خوب جانتا ہے کہ کوشش عبث ہے اور سوائے اس کے کچھ باقی نہیں ہے کہ اس کو منزل عدم پر ختم کرنے کی تیاری کر لے۔

بہرام جو بڑا زندہ دل اور لطیفہ سنج تھا۔ اس کی بھی حالت یہ تھی کہ گو بغداد کے مطبخ اور

میکدے روز بروز قریب آتے جاتے تھے۔ مگر دل افسردہ تھا۔ کبھی کبھی گونجتی اور گرجتی آواز میں اشعار پڑھتا تھا۔ مگر وہ حمد خدا یا نعت رسولؐ یا منقبت بزرگان دین میں ہوتا تھا۔ جب کوئی چھیڑتا تھا کہ آپ کی یہ کیا حالت ہے تو کہتا تھا کہ "دوستو! جو جو مصائب اور آلام ہم پر گزرے ہیں انہوں نے قلب کی آلائشوں کو جلا ڈالا ہے اور جس جس قسم کے خطروں سے جان سلامت لے کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے دکھا دیا ہے کہ خدائے ذوالجلال کا دریائے رحمت ہر خس و خاشاک کا لب تر کرنے کے لئے کس طرح ہمیشہ سے جاری ہے۔ شعر اور شراب سے میں تائب ہو چکا ہوں۔ اب یہاں سے سیدھا نیشاپور پہنچ کر اُستاد مرحوم کی قبر پر جاؤں گا، گلاب کی پتیاں پھولوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اب بھی اس کی تربت پر بکھری ہوں گی۔ مگر میرا کام یہ ہوگا، کہ اس عالم متجر اور منجم باکمال کے حق میں جو دین متین کی راہ مستقیم سے ہٹ گیا تھا، دُعائے مغفرت کروں اور خود بھی وہیں بیٹھ کر اپنے اعمال کو بخشوانے کے لیے توبہ اور استغفار میں مصروف رہوں، اب سوائے نماز اور روزے، تسبیح و تہلیل کے میرا کوئی اور شغل نہ ہوگا اور ہر وقت یہی دعا ہوگی، کہ خداوند کریم اپنی شان رحمت سے میرے گناہوں پر قلم پھیر دے۔

اور اب یہ مسافر بغداد کے مضافات میں پہنچ گئے۔ تھور فریدا اور ابن ریمند شہر میں اس خوف سے نہیں گئے۔ کہ مبادا کوئی پہچان کر مخبری نہ کر دے۔ کہ یہ فلسطین کے کفار ہیں اور پھر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں، یہاں قاسم ان سے جدا ہوا، تینوں کا دل ایسا بھر آیا تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہ نکلی، صرف ہاتھ ملا کر اپنے اپنے رستے ہو لئے، مگر تھور فریدا نے جب اپنا مرکب مغرب کی طرف موڑا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آسمان گوں آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ قاسم، پری اور بہرام شہر میں داخل ہوئے۔ پری تھور فریدا کے ساتھ نہیں گئی، کیونکہ کفار کے ملک میں رہنے سے اب وہ ڈرتی تھی۔

قاسم اپنے باپ کے گھر آیا۔ عربی لباس پہنے تھا۔ ڈیوڑھی پر نوکروں نے دیکھ کر پہچانا نہیں لیکن جب قاسم نے بتایا کہ میں کون ہوں، تو سب خوش ہو کر چلا ئے۔ پھر تو سارے گھر میں دھوم مچ گئی، سلیم بن طاہر خود باہر آئے۔ دیکھتے ہی دوڑ کر قاسم کو گلے لگا لیا اور کہا! "بیٹا تم آ گئے، ہم تو سمجھ چکے تھے کہ صحرا کے قزاقوں یا الموت کے فدائیوں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑا۔ مدتوں تمہارے غم میں رویا کئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ واپس آئے۔ حشیشیوں کے راز اور طریقے چاہے تمہیں معلوم ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ بہر کیف یہ تمہارا گھر ہے اور میں تمہارا باپ ہوں، اندر آؤ

غسل کرو، کھانا کھاؤ، اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنا سارا قصہ سناؤ''۔

قاسم گھر میں گیا۔ غسل کیا، کپڑے بدلے، دستر خوان بچھا اور سب کھانے بیٹھے۔ خجستہ نے اپنا حال کہنا شروع کیا کہ اب تو میں نے چوگان کی خوب مشق کر لی ہے۔ بہن بھائی کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہی تھی۔ قاسم نے ایسی صورت بنالی جس سے معلوم ہو کہ وہ بھی بہت خوش ہے لیکن اس خیال سے دل بیٹھا جاتا تھا کہ ہائے بہن اور باپ کی اس خوشی کو میں خود کس قدر جلد مٹانے والا ہوں۔ کوشش کرتا تھا کہ وہ بُری گھڑی جتنی دیر ٹلے، بہتر ہے آخر کار کھانا ختم ہوا۔ سلیم بیٹے کو علیحدہ لے گئے اور اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا ''برخوردار تم کو وہ دن یاد ہوگا کہ مجھے بے چین اور فکر مند دیکھ کر تم نے کہا تھا، کہ اپنی تکلیف مجھ سے نہ چھپایئے۔ اُس دن جس بات کی مجھے تکلیف تھی، یہ تھی کہ امیر المومنین نے تم کو ایک ایسے کام پر بھیجنے کا حکم دیا تھا جس سے تمہارا زندہ واپس آنا دشوار تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تم جیتے جاگتے آ گئے، جس کام کے لئے تم بھیجے گئے تھے وہ ہوا یا نہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں ہے کہ حشیشیوں کے راز اور اسرار تم معلوم نہیں کر سکے۔ اگر ایسا ہے تو تمہارے حق میں بُرا ہوگا لیکن آج کل خلافت آب میرے حال پر بہت مہربان ہیں۔ کوئی بات خدانخواستہ مضر پیدا ہوئی تو اس کے دفعیہ کی کوشش کروں گا''۔

قاسم نے کہا! ''حشیشیوں کے راز و اسرار میں نے معلوم کر لئے ہیں اور یہاں آنے کی غرض بھی یہی ہے کہ آپ کو امیر المومنین کو ان سے آگاہ کروں'' اب قاسم نے اپنی پوری سرگزشت اور حشیشیوں کے طور طریقے اور ان کے راز اور اسرار باپ کے سامنے کہے۔ مگر اس قسم کا ذکر نہیں کیا، جو باپ کو قتل کرنے کی کھا چکا تھا۔

سلیم نے بیٹے کو حیرت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ ''بیٹا، جزاک اللہ، یہ کام تم نے خوب انجام دیا اب تحقیق ہوا۔ کہ یہ حشیشی دراصل بڑے مکار اور دغا باز ہیں، اپنے ہی طریقے کے اور لوگوں کو تو شریعت کا پابند کرتے ہیں اور بود و باش اور منکر خدا ہوتے ہیں اور فدائیوں سے جنت کا وعدہ کر کے اور ان کو حشیش پلا کر جوانمرد بناتے ہیں، جو اشارے اور علامتیں تم نے معلوم کی ہیں۔ اب اُن سے ہم ان لوگوں کو شناخت کر سکتے ہیں اور اس سے انسداد جرائم میں بخوبی مدد مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جرائم کے ارتکاب کے لئے جو جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان کے معلوم ہو جانے سے بھی ان کی گرفتاری میں آسانی ہوگی۔ غرض جو باتیں تم دریافت کر کے لائے ہو۔ اگر ہم نے انہیں پوشیدہ رکھ کر ان سے کام نکالا تو قتل و غارت کی اکثر وارداتیں بند ہو جائیں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات

ایسی بھی ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو، اگر کوئی بات ایسی ہو تو مجھ سے صاف صاف کہہ دو"۔

قاسم نے جواب نہیں دیا بلکہ خود سوال کیا۔ "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا۔ کہ قرآن پاک پر جو قسم کھائی جائے اس کو توڑنا بہت خطرناک ہے لیکن اگر دھوکا دے کر اور ایک نہایت زبون کام کے لیے ایسی قسم لے لی گئی ہو۔ کیا ایسی حالت میں بھی اس کی پابندی لازمی ہو گی؟"

سلیم نے کہا "بیٹا جو قسم قرآن پاک پر کھائی گئی ہے اس کی پابندی ہر حالت میں لازمی اور ضروری ہے"۔ اس کے بعد باپ بیٹے چپ ہو گئے اور اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے، قاسم تو ایسا سویا۔ جیسے کوئی معصوم بچہ سوتا ہے لیکن بڈھا باپ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار قاسم کی بات کا خیال آتا تھا اور سمجھتا تھا کہ گھر پر کوئی آفت عنقریب آنے والی ہے۔

جب صبح ہوئی تو سلیم بن طاہر بیٹے کو قصر خلافت میں لے گئے۔ دروازے پر صدہا شیر پنجروں میں بند گونج رہے تھے آگے بڑھتے تو ایوان کے سامنے جواہرات کے درختوں میں سونے کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور سونے کے چھوٹے چھوٹے سوار درختوں کی شاخوں پر گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ایوان کی دہلیز پر سنگ سیاہ رکھا تھا جسے بوسہ دے کر درباری ایوان میں داخل ہوتے تھے۔ اندر اہل دربار حاضر تھے۔ وزیر اعظم، کاتب الانشا، امیر عسکر، دیگر وزرا، سرداران فوج، امام جامع مسجد، قاضی القضات، مفتی و محتسب سب بدستور امیر المومنین سے اپنے اپنے محکموں کے متعلق حکم احکام لینے کے لئے منتظر کھڑے تھے، اس مرتبہ جواہرات کے درختوں کا محافظ اور قصر کی فوج محافظ کا سردار نیا تھا، قاسم کو دیکھتے ہی سب لوگوں کو حیرت ہوئی، کیونکہ مدت سے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کہیں مارا گیا آپس میں چپکے چپکے کہنے لگے، کہیں یہ لڑکا حشیشیوں کی باتوں کا کھوج تو نہیں لگا لایا۔ خیر جو کچھ ہو گا ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کیونکہ جس وقت پیشی سے واپس ہو گا تو یا تو جلاد کے ہاتھ میں ہاتھ ہو گا، یا خلعت پہنے بڑی شان سے برآمد ہو گا۔

سلیم بن طاہر اور قاسم درباریوں کی صفوں میں سے گذرتے ہوئے دیوان خاص میں پہنچے جہاں خلافت آب رونق افروز تھے۔ کچھ دیر کے بعد سلیم بن طاہر تنہا واپس چلے آئے مگر ان کا چہرہ خوش اور بشاش تھا۔ اس کے بعد قاسم آئے مگر وہ تنہا نہ تھے۔ آگے آگے نقیب تھے جو ان کے نئے خطابات پکارتے چلتے تھے۔ صغیہ حربیہ میں ابھی ابھی خلافت پناہی نے ان کو ایک بڑا عہدہ عنایت فرمایا تھا۔ قاسم خلعت فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور لوگ ان کے عبائے زریں کے دامن اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے تھے جب سلیم اور قاسم عمائد سلطنت وزیر اعظم کاتب الانشا۔ امیر عسکر اور دیگر

امرائے دولت کی صفوں میں سے گذرنے لگے۔ تو سب نے تعظیم دے کر ان کی تعریفیں کیں، سلیم اور قاسم ان کے سلاموں کا جواب اور تعریفوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جاتے تھے، اس طرح ایوان سے نکل کر جواہرات کے درختوں اور شیروں کے پنجروں کے پاس سے گذرتے ہوئے قصر کے دروازے پر آئے یہاں اپنے اپنے گھوڑں پر سوار ہو گھر چلے گئے۔

قاسم نے گھر پہنچتے ہی خلعت جو پہنے تھا اسے پھینک کر خجستہ سے کہا "گھوڑے کہاں ہیں آؤ چوگان کھیلیں، میں بھی دیکھوں تم نے کیسی مشق کی ہے"۔ خجستہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوئی اور دونوں بہن بھائی باغ میں جا کر چوگان کھیلنے لگے۔ قاسم نے بہن کی تعریف کی کہ خجستہ تم تو واقعی چوگان میں اُستاد ہو گئی ہو، خلعت تو تم کو ملنا چاہئے تھا مجھے تو مفت میں مل گیا۔

اس کے بعد دونوں گھر میں گئے اور نہا دھو کر کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سلیم قاسم کو بالا خانے پر اپنے کمرے میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر کہا "بیٹا جو واقعہ ہوا ہے میرے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کرو"۔

قاسم نے کہا۔ "شیخ الجبل نے مجھ سے اس بات کی قسم لی کہ جو کچھ وہ کہے گا وہی مجھے کرنا ہو گا۔ یہ قسم اس نے قرآن پاک پر لی"۔

سلیم نے کہا "بیٹا! تم نے دونوں باتیں بہت خوب کیں۔ یعنی ایک تو حشیشیوں کے راز معلوم کئے۔ دوسرے اس قسم کا حال مجھ سے کہہ دیا۔ قسم کی پابندی لازمی ہے اب بتاؤ، وہ کیا کام تھا جس کی قسم تم سے لی گئی تھی؟"

یہ کہہ کر سلیم نے متجسس نگاہوں سے قاسم کے چہرے کو اس طرح دیکھا، کہ وہ کوئی غلط بات نہ کہہ سکے۔ قاسم تھوڑی دیر تک خاموش اور نہایت شرمندہ رہا، لیکن آخر کار نہایت غصے اور تکلیف سے کہنے لگا۔ "اس بے ایمان ظالم اور خبیث نے مجھے دھوکا دیا اور مجھ سے اس بات کا اقرار لیا کہ اگر میں تیسرا کام بھی انجام دونگا تو حشیشیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں شامل کر لیا جاؤں گا اس لئے میں نے قسم کھالی اس کے بعد اس موذی نے کہا کہ وہ کام یہ ہے کہ اپنے باپ کو قتل کر دو۔ خدا محفوظ رکھے، اگر میں ایسا کرتا بھی تو کس کو معلوم تھا۔ کہ شیخ ایفائے وعدہ کرتا اور اگر ایفائے وعدہ کرتا بھی تو جب باپ ہی نہ رہا تو مجھ کو حشیشیوں کے راز معلوم کرنے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا"۔

سلیم نے جواب دیا۔ "نہیں بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ ایسی قسم کھانا تمہارا درست فعل تھا کیونکہ اس سے جو کام امیر المومنین نے تمہارے سپرد کیا تھا اس کی تعمیل ہو جاتی تھی اور چونکہ تم قسم کھا چکے ہو،

اس لئے پابندی تم پر لازم ہے چاہے وہ کسی بات کی قسم ہو۔ رہا میں تو میری عمر پوری ہو چکی ہے اگر کچھ باقی ہے تو وہ کتنے دن کی تمہارا قدم ترقی کے زینے پر ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ میری جگہ کوئی دوسرا ہو اور میرا فرزند اس لائق موجود ہے جو سلطنت اسلام کا رُکن رُکین بن سکتا ہے"۔

قاسم نے کہا "بابا جان! میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا اور نہ اس میں میری قسم ٹوٹتی ہے کیونکہ جب اس سفاک اور بے درد شیخ نے مجھ سے قسم لی تھی تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تم اس قتل کے مرتکب نہ ہو سکو تو ہمارے پاس واپس چلے آنا اور تمہارے اس فعل سے وہ قسم پوری ہو جائے گی اس لئے اب میں اسی کے پاس واپس جاتا ہوں"۔

سلیم نے کہا "نہیں بیٹا! میرا کہنا مانو، میں بڈھا ہوں بہت تھوڑے دن کی زندگی باقی ہے تم خلیفہ اسلام کی خدمت بڑی عمر تک کرو گے۔ بس ہمت کرو تلوار لو اور میرا کام تمام کرو۔ تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے گی اور میں بھی چین سے مروں گا اگر تم اس ظالم شیخ کے پاس پھر چلے گئے تو وہ بہت اذیت سے تمہاری جان لے گا"۔

قاسم نے جواب دیا۔ "ایک مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ مجھے مرنا منظور ہے اور ہر موت میں جتنی مدت تک چاہے وہ ایذائیں دے مگر میں اپنے پیارے باپ کی جان نہیں لے سکتا جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب آپ کا ہے اور آپ ہی اسے واپس لے سکتے ہیں، آپ نے مجھے سب کچھ دیا اور میں آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا، میری زندگی کا جس پر دارومدار تھا وہ نہ رہی اور سب خوشی برباد ہو گئی۔ اب مجھے وہیں جانے دیجئے جہاں میرا بلاوا ہے، صرف یہی ایک صورت ہے جو میرے دل کو پاک اور صاف رکھے گی اور اس دنیا اور اپنے خدا کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا"۔

سلیم کا رنج سے بہت بُرا حال ہوا، قاسم باپ کی یہ حالت دیکھ نہ سکا، جلدی سے اُٹھ کر خجستہ کے پاس آیا اور بہت ہنستی صورت سے اسے خدا حافظ کہا۔ خجستہ بولی "بھائی کیا ہو گیا ہے ابھی تو آئے تھے، اب پھر جاتے، دو کوئی دن تو ٹک کر گھر میں بھی رہتے، میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تمہیں اپنی نئی گھوڑی دکھاؤں گی میں نے اسے گیند کے پیچھے ایسا دوڑنا سکھایا کہ تم بھی دیکھ کر حیران رہ جاتے"۔

قاسم نے کہا۔ "پیاری بہن خجستہ! ایک کام میرے لئے اور نکل آیا ہے، ابھی کیا ہے چوگان کھیلنے کو برسوں پڑے ہیں یہاں کیا بہشت کے باغوں میں بھی پہنچ کر ہمیشہ چوگان کھیلتے رہیں گے۔

یہ کہہ کر قاسم خجستہ سے رُخصت ہوا، اونٹ پر سوار ہوا، دو ملازم ساتھ تھے۔ خجستہ قاسم کے اخیر فقرے کا مطلب بھی نہ سمجھی کہ کیا تھا؟

تیسواں باب

بچو !اب تمہارے جدامجد قاسم اقلیم قضاوقدر میں قدم رکھتے ہیں اب جو کچھ گذرا اس کا حال ریگستان کے ذروں میں پنہاں ہے۔اس حال میں شریک قاسم کے سوا ایک اور متنفس بھی تھا یا آسمان کے ستارے تھے ان کے سوا کوئی اور نہ تھا باوجود اس کے کل ماجرا تحقیق کر کے سلیم بن طاہر کی اولاد کو سنانا میری قسمت میں لکھا تھا۔تاکہ تمہارے بعد اس خاندان میں جو لوگ پیدا ہوں ان کو یہ قصہ پورا معلوم رہے یہ شکایت نہ ہو کہ انجام نہ کھلا۔

جب قاسم اس سفر میں نیچی نیچی پہاڑیوں کے قریب آئے جہاں سے صحرا شروع ہوتا تھا تو اونٹ روک کر نیچے اُترے اپنے نوکروں سے بہت اخلاق اور مہربانی سے باتیں کیں اور کہا کہ تم اب بغداد واپس چلے جاؤ اور وہاں والد سے میرا سلام اور خیریت کہہ دینا لیکن نوکروں نے کہا کہ ہم آپ کو تنہا کیسے چھوڑ سکتے ہیں اور آپ اس صحرا میں اکیلے کیونکر سفر کریں گے۔یہ سُن کر قاسم ہنسے اور کہنے لگے۔میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں تم کچھ خوف نہ کرو۔

نوکر مجبور ہوئے اور تامل کے بعد واپس چلے۔تھوڑی دیر میں انہوں نے گھنٹیوں کی آواز صحرا کی طرف سے آتی سُنی۔جس سے معلوم ہوا کہ قاسم روانہ ہو گئے،دوپہر کا وقت نہایت گرم تھا مگر ان نوکروں کو ایسا معلوم ہوا کہ سخت جاڑا ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں،کہنے لگے کہ یہ اونٹ کے گلے کے گھنگرو نہیں محمل عمرِ رواں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں جو اس سفر دراز کی آخری منزل تک یوں ہی بجتی چلی جائیں گی۔جب ان نوکروں نے مشرق کی طرف چلنا شروع کیا تو ایک شتر سوار کو صحرا میں داخل ہوتے دیکھا۔اس کو دیکھتے ہی یہ لوگ ڈرے اور کہا ''یہ موت کا فرشتہ معلوم ہوتا ہے''۔

قاسم نے اَلموت کی سیدھ باندھ کر اسی وادی ہلاکت میں رہ نوردی شروع کی ہر طرف ریگستان ہی ریگستان تھا۔آفتاب جب نصف النہار سے ڈھلتا تو آسمان پر سرار نمودار ہو جاتا

اور جب غروب ہوتا تو تاریکی پھیلنے پر سراب غائب ہو جاتا۔ ہر طرف مُردنی چھائی تھی اب پھر واہمہ کی انہی صورتوں سے صحرا آباد ہو گیا جنہوں نے اَلموت کے پہلے سفر میں قاسم کا تعاقب کیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی یہ معلوم ہوا کہ وہی مہیب شکلیں کمین گاہوں سے نکل کر اُفق کے کنارے کنارے مسافر کی تاک میں چلی آتی ہیں اور اب قاسم کو پھر یہی محسوس ہوا کہ وہ اس وحشت پُر خطر میں بالکل تنہا ہیں اور اب اس دنیا سے ان کو کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہا مگر ان کی ہمت میں کسی طرح فرق یا دل میں کسی طرح کا خوف نہ تھا۔ کیونکہ تمام جذبات عشق والفت، رشک وحسد، نفرت وحرص امیدی اور ناامیدی، ان سب سے وہ رخصت ہو چکے تھے۔ ان کا قلب ایسا صاف تھا جیسے بارش کے بعد مطلع صاف ہو جاتا۔ یہ اور آفتاب نرمی سے اپنی شعاعیں زمین پر پہنچاتا ہے قاسم نے دوسروں کی بہبود کے لئے انکار خودی کا پیرہن پہن لیا تھا۔

جب رات ہوئی تو اونٹ سے اُتر کر تھوڑی سی خشک مچھلی اور کچھ کھجوریں کھائیں اور مشکیزے سے پانی پیا۔ تھوڑی سی ہری گھاس جو ساتھ لائے تھے۔ اونٹ کے سامنے ڈال دی اور ریت پر بیٹھ گئے اوپر دیکھا تو آسمان پر ستارے گردش میں تھے اب وہ ان کریہہ صورتوں کو دیکھ نہ سکتے تھے، مگر جانتے تھے کہ وہ موجود ہیں۔ بسم اللہ کہہ کر لیٹے اور سو گئے سوتے سوتے ایک خواب دیکھا اور یہ خواب سچا تھا، ایسا ہی سچا تھا، جیسے کہ نزع اور موت کے وقفے میں انسان دیکھا کرتا ہے ساتوں سیاروں کا قران برج میزان میں تھا، جو کسی سخت مصیبت کی خبر دیتا تھا اتنے میں کیا دیکھتے ہیں، کہ شہر اَلموت اور اس کا قلعہ جسے آشیانہ عقاب کہتے تھے، سامنے ہے پہاڑوں کے دروں میں سے ہزارہا آدمیوں کا ایک لشکر نکل رہا ہے۔ ان آدمیوں کے چہرے کثیف اور زرد رنگ کے ہیں، آنکھیں پتلی پتلی ترچھی لکیریں معلوم ہوتی ہیں اور ڈاڑھیاں چگی ہیں، الموت کا تمام وسیع میدان ان لوگوں سے بھر گیا ہے کھیتیوں کو جلانے اور مویشیوں کو غارت کرنے میں مصروف ہیں، دروازے کے پہرے والوں کو قتل کر کے ایک شور قیامت مچاتے ہوئے شہر کے گلی کوچوں میں گھس گئے ہیں۔ جہاں کہیں ان کے قدم پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں کوئی زندہ نظر نہیں آتا، اس طرح قتل وغارت کرتے ہوئے وہ قلعہ اَلموت میں داخل ہوئے اس کے تہ خانوں سے لے کر اونچے برجوں، یہاں تک کہ شیخ الجبل کے ایوان میں آئے اور آتے ہی چینی صنعت کے ظروف توڑ ڈالے، پردے نوچ لئے، قالین اُٹھا کر کندھوں پر لادے اور سنہری چھت کی چادریں اُکھیڑ کر چلتے ہوئے اس طرح حشیشیوں کو انہوں نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور ان کا

شہر اور قلعہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مشتعل غباروں کی طرح آسمان کی طرف اُٹھتا نظر آیا۔

قاسم بیدار ہوئے اور انہیں معلوم ہوا کہ گویا اس ظالم اور نابکار قوم حشیشئین کا خاتمہ انہوں نے دیکھ لیا۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ تو سر پر ستارے آہستہ آہستہ اپنی گردشوں میں مصروف تھے اور صحرا کی تاریکی میں وہ خیالی صورتیں قریب آتی جاتی تھیں۔ قاسم پھر لیٹ کر سو گئے اور سوتے ہی ایک اور خواب دیکھا اس میں یہ دیکھا کہ وہی لشکر جس نے الموت کے شہر اور قلعہ کو برباد کیا تھا، دجلہ کے میدانوں میں مور و ملخ کی طرح پھیل کر بغداد کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ شہر کے مکانات کی سرخی اور باغوں کی سبزی پر تاریکی ہے، مگر برج اور مینار اب بھی ستاروں کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ سارا شہر عالم خواب میں ہے۔ فصیلوں پر سپاہی البتہ پہرہ دے رہے ہیں اور غنیم کو دیکھ کر اس پر تیروں، برچھوں اور آگ کا مینہ برساتے ہیں اور وہ کثیف چہروں اور ترچھی آنکھوں والے وحشی لاکھوں کی تعداد میں ہلاک ہو رہے ہیں جس قدر ہلاک ہوتے ہیں، ان سے زیادہ آن موجود ہوتے ہیں۔ خندقوں کی اپنی لاشوں سے پاٹ کر شہر کی دیواروں پر چڑھ گئے ہیں اور شہر کے اندر اُتر کر ایک قیامت برپا کر دی ہے۔ کتب خانے جلا دیئے ہیں، مسجدوں اور خانقاہوں کی بے حرمتی کی ہے، حتیٰ کہ خلیفہ کے قصر میں داخل ہو کر درندگی میں اُن شیروں کو بھی مات کرنے لگے، جو پنجروں میں بند قصر کے دروازے پر موجود تھے۔ بہت سے لوگ جواہرات کے درختوں کے قریب پہنچے اور ان میں سے سونے کی چڑیاں اور سونے کے سوار توڑ لئے، بڑھتے بڑھتے دربار والے ایوان میں پہنچے وہاں جس قدر امراء سلطنت، اعیان دولت موجود تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ مستعصم کو بھی قتل کر دیا۔ غرض ان وحشیوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن صرف ایک عمارت یعنی سلیم بن طاہر کا مقبرہ انہوں نے یہ کہہ کر سلامت چھوڑ دیا کہ سلیم اپنے زمانہ کا بڑا شریف تھا۔

قاسم جاگے، تارے اب بھی آسمان پر روشن تھے، کچھ غروب ہو چکے تھے کچھ نئے نکلے تھے۔ واہمہ کی مہیب صورتیں پھر اندھیرے میں چپکے چپکے قریب آنے لگیں۔ قاسم سمجھ رہے تھے کہ یہ ان کی جان کے درپے ہیں پھر دفعتاً صحرا کی خاموشی میں ایک آواز انہوں نے سُنی ... یہ گھنٹے کی آواز تھی اور بالکل اسی قسم کی تھی جیسے طرابلس میں عیسائیوں کے گرجا سے باہر سنی تھی، یہ آواز سُن کر قاسم پھر لیٹ کر سو گئے اور اب ایک اور خواب انہوں نے دیکھا اور وہ یہ تھا۔ کہ نصرانیوں کے معبد میں کھڑے ہیں، مشعلوں کی دھیمی روشنی دیواروں پر اور تصویروں کے حاشیہ

پر چمک رہی ہے۔بخور روشن ہیں اوران کے دھوئیں کا ایک بادل چھت کے نیچے چھایا ہوا ہے۔ عیسائی خدا کی تعریفیں گاتے ہیں۔قربان گاہ کے قریب بہت سے پادری کھڑے ہیں اوران کے ریشمین لباسوں پر زری کا کام ہے۔اس کے بعد بہت سے نصرانی امراءاور سردار زرہ پہنے ہوئے اندر آئے ہیں ان کی قبائیں سفید ہیں اوران پر سرخ نشان صلیب کے بنے ہیں اورانہی میں ابن ریمند بھی ہے۔اس کے بعد بہت سی عورتیں رنگ برنگ کپڑے پہنے جیسے باغ کے پھول ہوں،اندر آئی ہیں۔ان میں ایک نہایت حسین عورت بہت گورے رنگ کی ہے،اس کی آنکھیں نیلگوں ہیں اورسر کے بال سنہری ہیں یہ آگے آگے ہے اور پیچھے پیچھے بہت سی خوش لباس عورتیں ہیں اوراب سب سے بڑا پادری قربان گاہ کے سامنے آیا اوراس نے اس خوبصورت گوری عورت اور ریمند کا ہاتھ ملا کر کوئی دعا پڑھی۔پھر وہ دونوں خوش ہو کر گرجا سے نکلنے لگے تو حاضرین نے مبارک باد کے نعرے بلند کئے اورسرداروں نے اپنے بیرق لہرائے۔ دعاؤں کی آوازوں اور بخور کی خوشبوؤں میں تھور فریدا نے ریمند سے کہا۔''ہمارا فرض ہے کہ اس وقت ہم قاسم کو نہ بھولیں،ہم اس کو ہمیشہ یاد رکھیں گے،اس نے ہمارے لئے اپنی جان کھوئی ہے اور دفتر عشق میں اس کا نام درج ہو چکا ہے''۔

قاسم کی پھر آنکھ کھلی۔تو دیکھا کہ آسمان پر ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ننگی تلواروں کی سی چمک دکھاتے ہوئے فضا میں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں لیکن صحرا پر ہوا میں نسیم سحر کا سا لطف ہے اوراب وہ مہیب صورتیں ان کے گرد حلقہ کر کے بیٹھ گئی ہیں،قاسم ہنسے اور کروٹ بدل کر کہنے لگے۔اب جو سوؤں گا تو پھر کوئی خواب نظر نہ آئے گا۔پھر کچھ خیال آیا تو اُٹھے اور قبلہ رو ہو کر تین بار کلمہ پڑھا اور لیٹتے ہی غافل سو گئے۔

اوراب وہ خبیث بلائیں حلقہ باندھ کر درندوں کی طرح شکار پر جست کرنے کے لئے تیار ہو گئیں مگر ان کو یہ خبر نہ تھی کہ یہاں کسی اور کا قدم بھی پہنچ گیا ہے۔یہ ایک نازک اندام حسین عورت ہے،جس نے قاسم کے پہلو میں آ کر اس کی کمر سے سرخ اور سفید دستے والا خنجر نکال لیا اور یہ کہہ کر کہ''ڈرو نہیں دنیا کی ہر بلا سے تم محفوظ ہو چکے ہو'' قاسم کی پیشانی سے بال ہٹا کر ان کو بڑی محبت سے سنوارا اور پھر پیشانی کو بوسہ دے کر خنجر اس کے سینے میں بھونک دیا اور جب اسے سینے سے کھینچ لیا،تو پھر وہی خنجر آبدار چشم زدن کے لئے اس نازنین کے سینے پر چمکا اور وہ بھی قاسم کے پہلو میں دراز ہو کر جاں بحق ہوئی۔

جب صبح ہوئی، تو وزیر موت اور اس کے ساتھ والے جو صحرا میں قاسم کی واپسی کے منتظر تھے۔ اپنے شکار پر دوڑے لیکن قریب آئے تو دیکھا کہ قاسم اور پری دونوں مردہ پڑے ہیں۔

ان دونوں مُردوں کو وہیں چھوڑ کر خود مایوسی اور ناکامی کا شکار بنے ہوئے اس افسوس اور صدمے میں کہ قاسم کو زندہ گرفتار نہ کر سکے۔ قلعہ الموت کی طرف چلے اور دل میں یہ حسرت رہ گئی کہ شیخ الجبل کے سامنے قاسم کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر ہلاک کرنے کا موقع نہ ملا لیکن قاسم کی موت کی خبر شیخ الجبل تک پہنچانی ان کو نصیب نہ ہوئی، کیونکہ جب دن کچھ چڑھا تو جنوب کی سمت سے ایک غضبناک شعلہ ان کی طرف بڑھتا نظر آیا اور تمام صحرا میں وہ پھیلتا گیا۔ پھر ایک تیز آندھی آئی، ریت کے ٹیلے اُڑ اُڑ کر آسمان تک پہنچنے لگے اور آفتاب کی روشنی بالکل جاتی رہی۔ وزیر موت اور اس کے ساتھی خوف سے چیخیں مار مار کر رونے لگے کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ آج موت ان پر بھی اپنا پنجہ چلانے کو ہے۔ طوفان آخر کار ان تک پہنچا وہ سب زمین پر اوندھے منہ گرے اور اب ریت ان پر چڑھنی شروع ہوئی۔ ریت میں جوں جوں دبتے جاتے تھے۔ ان کی آہیں دردناک ہوتی جاتی تھیں۔ ریت اب ان پر اتنی جمی کہ اس کے ٹیلے بن گئے کچھ دیر کے بعد وہ آہیں بھی بند ہو گئیں۔

قاسم اور پری کی لاشوں کو بھی ریت نے چھپا دیا وہ دونوں اسی صحرا میں آسودہ ہیں۔ کوئی درندہ یا پرندہ ان کی نیند میں خلل نہیں ڈال سکتا۔

بچو! آج عید کا چاند نکلنے والا ہے۔ دیکھو وہ نظر آ رہا ہے رمضان مبارک کے ساتھ قاسم کی داستان بھی ختم ہوئی۔ سب مل کر اپنے جدِ امجد کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔

خاتمہ

یہ ہے کُل قصہ میرے جدامجد قاسم بن سلیم بن طاہر کا جس طرح کہ مقداد بن معاذ نے صوبہ آذربائیجان کے شہر مراغہ کے قریب باغ شالا مار میں سنایا تھا۔ جب قصہ ختم ہوا تو سوسن اور نرگس کے پھول کھلنے بند ہو گئے تھے۔ گلاب کی شاخوں پر البتہ پھولوں کے طرے جھومنے لگے تھے اور اپنی خوشبو سے دُور دُور تک باغوں کو مہکا رکھا تھا۔

میں نے شروع میں بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ بعض واقعات جو قاسم کو پیش آئے مشکل سے باور کرنے کے قابل ہیں اور اگرچہ یہ معلوم کرنا کہ مقداد کو وہ کیونکر تحقیق ہوئے، مشکل بات ہے لیکن مقداد کوئی بات جھوٹ نہیں کہتے تھے بالخصوص ایسا جھوٹ کبھی نہیں بولتے تھے جس میں دوسرے کو دھوکا دینے کی نیت ہو لیکن ایک بات میں ضرور کسر رکھ گئے گو اس کی بھی معقول وجہ تھی۔

اس کا حال یوں کھلا، کہ جلال الدین جو بچہ تھا اور عجیب عجیب سوال دماغ سے اُتار کر کیا کرتا تھا کہنے لگا ''یہ تو بتایئے کہ بہت سے موقعے ایسے آئے تھے، کہ قاسم تھور فریدا کو کہیں لے کر چلے جاتے اور وہاں اس سے اپنا بیاہ کر لیتے۔ تھور فریدا ان کی محبت اور جاں نثاری کا خیال کر کے تھوڑے دن میں ریمند کو بھول بھی جاتی۔ پھر کیوں انہوں نے ایسا نہیں کیا؟''

مقداد یہ سوال سُن کر بولے۔ ''تم بڑے بیوقوف ہو۔ قاسم مسلمان تھے اور بڑے پکے مسلمان تھے۔ تھور فریدا کافر تھی بس یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے تھور فریدا سے پرہیز کیا''۔

لیکن یہ میں کہتا ہوں۔ کہ قصہ جس طرح انہوں نے سنایا تھا اس سے ظاہر تھا کہ قاسم نے جو کچھ کیا۔ مقتضائے عشق یہی تھا، شرط وفا پوری کی اور چل بسے۔ کافر اور مسلمان کا خیال ان کے ذہن میں نہ تھا مگر مقداد بڑے متقی اور پرہیزگار آدمی تھے اور آج کل روزوں نے بھی ان کا بہت پتلا حال کر دیا تھا۔